اس آباد خرابے میں



خود نوشت سوانح

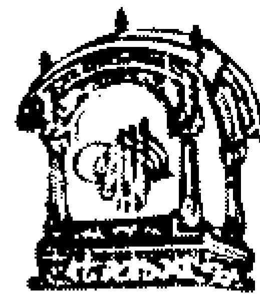
اختر الایمان



اردو اکادمی، دہلی

اس آباد خرابے میں

اختر الایمان



اس آباد خرابے میں

خود نوشت سوانح

اختر الایمان



اردو اکادمی دہلی

سلسلہ مطبوعات اردو اکادمی دہلی نمبر ۹۵

ISS AABAD KHARABE MEIN
(AUTOBIOGRAPHY)
AKHTAR-UL-IMAN

Published by
URDU ACADEMY, DELHI
Ist Print- 1996
IInd Print - 1999
Rs. 60

ضابطہ

اشاعتِ اول: ۱۹۹۶
اشاعتِ دوم: ۱۹۹۹
ساٹھ روپے
اصیلا آفسیٹ پریس، کلاں محل، دریا گنج، نئی دہلی ۲
اردو اکادمی، دہلی۔ گھٹا مسجد روڈ، دریا گنج، نئی دہلی

ISBN 81-7121-100-3

حرفِ آغاز

دلّی ہمیشہ ہندوستان کے دل کی دھڑکنوں کا محور و مرکز رہی ہے۔ اسی لیے عالم میں انتخاب اس شہر بے نظیر کی تاریخ و تہذیب، علم و فن اور زبان و ادب کو پورے ملک کی نمائندگی کا شرف حاصل ہے۔ آزاد ہندوستان کی یہ تاریخی راجدھانی بجا طور پر اردو زبان و ادب کی راجدھانی بھی کہی جا سکتی ہے۔ اسی کے گرد و نواح میں کھڑی بولی کے بطن سے زبانِ دہلوی یا اردو نے جنم لیا جو اپنی دھرتی کی سیاسی، سماجی، تہذیبی اور معاشرتی ضرورتوں کے زیرِ سایہ نشو و نما پا کر اس عظیم تہذیب کی ترجمان بن گئی جسے ہم گنگا جمنی تہذیب کا نام دیتے ہیں اور جو ہماری زندہ و تابندہ تاریخی وراثت ہے۔

دلّی کے ساتھ اردو زبان اور اردو ثقافت کے اسی قدیم اور اٹوٹ رشتے کے پیشِ نظر ۱۹۸۱ء میں دہلی اردو اکادمی کا قیام عمل میں آیا اور ایک چھوٹے سے دفتر سے اکادمی نے اپنی سرگرمیوں کا آغاز کیا۔ آج دہلی اردو اکادمی کا شمار اردو کے فعّال ترین اداروں میں ہوتا ہے۔ اردو زبان و ادب اور اردو ثقافت کو فروغ دینے کے لیے اکادمی مسلسل جو کوششیں کر رہی ہے، انھیں نہ صرف دہلی بلکہ پورے ملک نیز بیرونی ممالک کے اردو حلقوں میں بھی کافی سراہا گیا ہے۔

اکادمی کے دستورالعمل کی رو سے دہلی کے لیفٹننٹ گورنر پہلے اکادمی کے چیئرمین ہوتے تھے، دہلی میں منتخب حکومت کے قیام کے بعد اکادمی کے چیئرمین دہلی کے وزیرِ اعلیٰ ہو گئے ہیں جو دو سال کے لیے اکادمی کے اراکین کو نامزد کرتے ہیں۔ اراکین

کا انتخاب دہلی کے ممتاز ادیبوں، شاعروں، صحافیوں اور اساتذہ میں سے کیا جاتا ہے جن کے مشوروں کی روشنی میں چیئرمین کی منظوری سے اکادمی مختلف کاموں کے منصوبے بناتی اور انھیں روبہ عمل لاتی ہے۔ اکادمی اپنی سرگرمیوں میں دہلی اور بیرونِ دہلی کے دیگر اردو اداروں سے بھی باہمی مشورت اور تعاون قائم رکھتی ہے۔

پیشِ نظر کتاب (اس آباد خرابے میں) جو ہمارے عہد کے ممتاز و منفرد نظم گو شاعر اختر الایمان کی خود نوشت سوانح حیات ہے، اکادمی کے اشاعتی سلسلے کی ایک اہم کڑی ہے۔ اختر الایمان کا انفرادی امتیاز ان کی خوے آزادہ روی میں تھا۔ انھوں نے انجمن ترقی پسند مصنفین اور حلقۂ اربابِ ذوق دونوں کے اثرات سے الگ اپنی ایک راہ نکالی اور اس پر ایسے نقشِ قدم چھوڑے جو ہمیشہ روشن رہیں گے۔ اس کتاب کی اشاعت کی منظوری اکادمی نے اختر الایمان صاحب سے ان کی زندگی میں حاصل کر لی تھی۔ افسوس ہے کہ ان کی عمر نے زیادہ وفا نہ کی اور مسودہ کتابت کے مراحل میں تھا کہ وہ ہمارے درمیان سے اٹھ گئے۔ ہم محترمہ سلطانہ ایمان اور جناب بیدار بخت کے شکر گزار ہیں جن کے تعاون سے اس کی اشاعت عمل میں آسکی۔ اب انھی کے شکریے کے ساتھ اس کا دوسرا ایڈیشن شائع کیا جارہا ہے۔

ہم اردو اکادمی دہلی کی چیئر پرسن محترمہ شیلا دکشت وزیر اعلیٰ دہلی کی عنایات کے لیے تہِ دل سے ممنون ہیں۔ اکادمی کے وائس چیئرمین پروفیسر گوپی چند نارنگ کے مفید مشورے ہمارے لیے رہنمائی کا کام کرتے ہیں اس کا اعتراف بھی ضروری ہے۔ ساتھ ہی اکادمی کی تحقیقی و اشاعتی کمیٹی کے اراکین کے بھی ہم شکر گزار ہیں۔

اس کتاب کی اشاعتِ دوم اختر الایمان کی مقبولیت کا ایک اور ثبوت ہے۔

مخمور سعیدی

سکریٹری

پیش لفظ

میری یہ خود نوشت "اس آباد خرابے میں" کے عنوان سے پچھلے کچھ دنوں سے قسط وار "سوغات" میں شائع ہوئی ہے۔ کچھ پڑھنے والے ایسے ہیں جن کی نظر سے یہ صفحات مسلسل گزر رہے ہیں۔ ان کی شکایت ہے کہ میری زندگی سے متعلق بہت سی باتیں ہیں جو میں نے یا دانستہ نظر انداز کر دی ہیں یا میرے ذہن سے نکل گئی ہیں۔

یہ خود نوشت کسی خاص پلان کے تحت وجود میں نہیں آئی۔ ایسے ہی ایک مرتبہ خالی الذہن بیٹھے بیٹھے مجھے خیال آیا کہانیاں کیا ہوتی ہیں؟ گزرے ہوئے واقعات کی بازگشت، یادداشت کی شکل میں انھیں کاغذ پر محفوظ کرنے کی نیت؟ پھر یہ کہ کہانی تو خیالی ورزش یا کدو کاوش ہے مگر جو کچھ آدمی پر گزرتی ہے وہ تو خیالی نہیں۔ اگر اس کو قلمبند کیا جائے تو کیا وہ کہانی نہیں بن جائے گی؟ یہ سوچ کر میں نے ایک روز ایسے ہی اپنے بارے میں سوچنا شروع کر دیا بغیر کسی غلو کے یا ان میں کوئی آمیزش کیے بغیر اور ایک حد تک لکھ کر چھوڑ دیا۔ اس خیال کے تحت کہ میری زندگی یا اس کی کہانی ایسی کون سی اہم ہے کہ دنیا کو سنائی جائے۔

بڑے شہروں میں کبھی کبھی ادبی ہنگامے ہوتے ہیں ایک مرتبہ بمبئی میں ایسا ہی سلسلہ تھا۔ بہت سے ادیب اور شاعر آئے تھے۔ ان میں سے کچھ مجھ سے بھی قریب تھے ملنے آئے غالباً وحید اختر، شہریار اور شاذ تمکنت۔ ایک دو اور تھے جن کے نام اس وقت ذہن میں نہیں۔ یونہی باتوں باتوں میں مجھے ان صفحات کا خیال آگیا جو خود نوشت کے طور پر لکھے تھے اور میں نے وہ صفحات ان دوستوں کو پڑھ کر سنائے۔ سب نے کہا اچھے ہیں مگر بات پھر رفت گزشت ہوگئی۔ کچھ مدت بعد محمود ایاز کو سوغات کے اجرار کا خیال آیا تو انھوں نے

مجھے لکھا کہ خود نوشت کے وہ صفحات بھیج دوں۔ مجھے اس وقت یہ بھی یاد نہیں کہ ایاز کو کیسے معلوم تھا کہ میں خود نوشت لکھنے کی نیت کر رہا تھا، مگر میں نے وہ صفحات بھیج دیے اور چھپ گئے۔ پڑھنے والوں کو پسند آئے اور سوغات کے اگلے شمارے کے لیے محمود ایاز کی فرمائش آئی کہ اگلے صفحات بھی بھیج دوں مگر آگے تو کچھ تھا ہی نہیں سوا چند اور صفحات کے میں نے وہ بھیج دیے اور محمود ایاز کی فرمائش پر خود نوشت باقاعدہ لکھنی شروع کر دی۔
اس بیچ ایک مرتبہ شہریار کا علی گڑھ سے خط آیا، میں وہ خود نوشت ضرور پوری کروں، انھوں نے لکھا تھا ترتیب کے لیے تردد نہ کروں جب جو ذہن میں آتا جائے لکھ دوں۔ میں نے وہی کیا۔ بہت سے واقعات آگے کے پیچھے ہیں اور پیچھے کے آگے۔

میں نے اس خود نوشت میں جیسی مجھ پر گزری ہے سب لکھ دیا۔ روکھے پھیکے واقعات ہیں۔ ان میں کوئی جی کو لبھانے والی بات نہیں۔ اگر کسی کو خود نوشت کا پڑھنا تضیعِ اوقات معلوم ہو تو میں شرمسار ہوں۔ ساتھ ہی یہ بھی کہہ دوں کہ یہ پورے واقعات نہیں۔ کچھ ایسے لوگ ابھی تک حیات ہیں جن سے میرا ایسا ذہنی یا قلبی واسطہ رہا ہے جو صرف میرے ان کے درمیان تھا جن کا میں نے ان صفحات میں ذکر نہیں کیا۔ دوسرا ڈر یہ تھا کہ انھیں بیان کروں گا تو میرے واقعات جھوٹے لگنے لگیں گے۔ میں بظاہر روکھا پھیکا سا آدمی ہوں میری زندگی میں کوئی چمک دمک یا افراط و تفریط بھی نظر نہیں آتی بہت کچھ ایسا ہے کہ اسے لکھوں گا یا اس کے بارے میں لکھوں گا تو افسانہ طرازی یا خود ساختہ بات محسوس ہوگی۔
فلم کی چالیس پینتالیس سالہ زندگی میں سوا سو کے آس پاس فلمیں لکھیں۔ کچھ معروف ہیں کچھ غیر معروف۔ ان میں کام کرنے والے لڑکے اور لڑکیاں، سب ہی سے برابر دوستانہ مراسم۔ کب کہاں، کیا کیا؟ کس سے کب کس طرح ملے کتنی قربت کتنی دوری رہی؟ اب یہاں وہ سب بیان کرنا دخل در معقولات محسوس ہوتا ہے۔ کچھ ایسی دوستیاں بھی ہیں جو لمحات میں بٹی ہوئی ہیں۔ ان کی شدت اتنی ہی ہے جتنی برسوں کی قربت سے پیدا ہو سکتی ہے مگر ان کا ذکر بیجا سا معلوم ہوتا ہے۔ بہت سے مناظر اسی طرح بدلتے چلے گئے۔ جیسے فلم کے منظر بدلتے ہیں۔ کچھ ایسے افراد یا شخصیتیں بھی ہیں جن کا فلم سے تعلق نہیں مگر مجھ سے قریب رہے۔

اخترالایمان

مقدمہ

اخترالایمان کی خود نوشت "اس آباد خرابے میں" جو آپ کے ہاتھوں میں ہے، کتابی شکل میں ان کے انتقال کے بعد چھپی ہے وہ خود بھی چاہتے تھے کہ جب تک 'سوغات' میں آخری باب نہ چھپ جائے کتاب بازار میں نہ آئے۔

اختر صاحب اپنی سوانح پر کوئی پانچ چھ سال سے کام کر رہے تھے مگر یہ کام مسلسل نہیں تھا۔ سوانح قسط وار "سوغات" میں چھپ رہی تھی جس کے ایڈیٹر محمود ایاز کے تقاضے پر ایک یا ایک سے زیادہ باب لکھ کر بھیج دیا کرتے تھے۔ اور پھر دوسرے کاموں میں مصروف ہو جاتے تھے۔ "سوغات" سال میں دو بار چھپتا ہے۔ مختلف ابواب کے لکھنے میں فاصلے کی وجہ سے بعض دفعہ ایک ہی بات دہرائی گئی ہے۔

جب میں نے یہ خود نوشت پڑھی تو مجھے اختر صاحب کے حافظہ پر حیرت بھی ہوئی اور داد دینے کو بھی جی چاہا اس لیے کہ اکثر روزمرہ کی باتیں انھیں یاد نہیں رہتی تھیں اور بھولی بسری باتوں کا بھی بہت کم ذکر کرتے تھے۔ وہ ہر باب کے کئی کئی ڈرافٹس (DRAFTS) لکھا کرتے تھے اور مطمئن ہونے کے بعد ہی چھپنے کے لیے بھیجتے تھے مگر اپنی سوانح کے دیباچہ کے یہی چند صفحات لکھے تھے چونکہ دیباچہ اختتام تک نہیں پہنچا اس لیے صرف یہی ایک ڈرافٹ تھا۔ میں نامکمل دیباچہ اس کتاب میں شامل کر رہی ہوں۔ مختصر ہونے کے باوجود یہ مجھے مکمل اور اہم لگتا ہے۔

جب زبیر رضوی اردو اکادمی کے سکریٹری تھے تو یہ طے ہوا تھا کہ یہ سوانح اردو اکادمی کتاب کی شکل میں چھاپے گی۔ جو باب "سوغات" میں چھپتے تھے اس کی کتابت اکادمی میں

بھی ہو جاتی تھی۔ اختر صاحب کا خیال تھا کہ جب سب باب لکھے جائیں گے اور کتابت مکمل ہو جائے گی تو وہ ان پر نظر ثانی کریں گے۔ اگرچہ انھیں اس بات کا احساس تھا کہ بعض واقعات ایک دفعہ سے زیادہ بیان ہو گئے مگر وہ کتاب کی اٹھان سے مجموعی طور پر مطمئن تھے۔

پندرھواں باب محمود ایاز کو بھیج کر انھیں اطمینان ہو گیا کہ یہ کام بھی مکمل ہو گیا۔

اختر صاحب کے گردے خراب تھے اور ان کی DIALYSIS ہفتہ میں دو بار ہوتی تھی۔ ۹ مارچ ۱۹۹۶ء کو وہ DIALYSIS کے بعد تقریباً ۱ بجے دوپہر کو ہسپتال سے گھر آئے۔ میں نے کھانے کے لیے پوچھا تو انھوں نے منع کر دیا۔ یہ کوئی نئی بات نہیں تھی۔ کبھی ہسپتال سے آ کر وہ کھانا کھاتے تھے اور کبھی آتے ہی سو جاتے تھے اور شام کو دیر سے سو کر اٹھتے تھے۔ اس روز وہ بغیر کھانا کھائے لیٹ گئے۔ انھیں سردی لگ رہی تھی۔ میں نے ان کے پہلو میں گرم پانی کی بوتل رکھدی اور کمبل اڑھا دیا۔ حسب معمول وقفہ وقفہ سے ان کو دور سے دیکھ لیتی تھی۔ وہ آرام سے سوئے ہوئے تھے۔ تقریباً پانچ بجے میں نے دیکھا کہ کروٹ بدل چکے تھے اور کمبل پیروں سے ہٹ گیا تھا۔ میں نے کمبل بالکل پیروں سے ہٹا دیا اور ہلکی چادر اڑھا دی۔ کچھ دیر بعد مجھے احساس ہوا کہ بدن میں کوئی جنبش نہیں ہے میں نے جلدی سے آکسیجن لگا دی اور نبض دیکھنے کی کوشش کی تو بہت آہستہ رو لگی۔ چہرے کو چھوا تو گرم تھا۔ خیری (مسز باقر مہدی) دوسرے کمرے میں بیٹھی تھیں۔ میں نے انھیں بلایا اور بلڈ پریشر ناپنے کے آلہ سے ان کا بلڈ پریشر دیکھنا چاہا مگر گھبراہٹ میں کچھ پتہ نہ لگا۔ میں نے فوراً اپنی بیٹی شہلا اور بیٹے رامش کو فون کیا۔ تھوڑی دیر میں شہلا، رامش اور ڈاکٹر سبھی آ گئے۔ ڈاکٹر نے بتایا کہ ان کا انتقال کوئی ایک گھنٹے پہلے ہو چکا تھا۔

اختر صاحب کی زندگی میں اکثر مشکلیں آئیں مگر برے سے برے حالات میں بھی وہ کبھی زندگی سے مایوس نہیں ہوئے۔ ان کے خالق نے جس کام کے لیے انھیں اس دنیا میں بھیجا تھا وہ ہمیشہ خلوص کے ساتھ کرتے رہے۔ انگریزی میں ایک محاورہ ہے جو ان پر پوری طرح صادق آتا ہے۔ ——— HE WAS AT PEACE WITH HIMSELF. ——— موت کے وقت بھی یہ

سکون ان کے چہرے پر تھا۔ ہلکی سی مسکراہٹ دیکھ کر یہ شبہ بھی نہیں ہوتا تھا کہ اب وہ اس دنیا میں نہیں ہیں۔

اکتوبر ۱۹۹۲ء میں ڈاکٹروں نے بتایا کہ ان کے گردے پوری طرح کام نہیں کرتے جس کی وجہ سے انھیں DIALYSIS کروانی پڑے گی۔ یہ عمل چار پانچ گھنٹے کا ہوتا ہے جس میں ایک طرح سے جسم کا پورا خون صاف کیا جاتا ہے۔ تب ہی سے ان کی DIALYSIS ہفتہ میں دو بار ہونے لگی اور یہ سلسلہ ان کی وفات تک قائم رہا۔ یہ بڑا صبر آزما اور تھکا دینے والا عمل تھا اس لیے DIALYSIS کے فوراً بعد وہ خاصے مضمحل ہو جاتے تھے اور تقریباً ایک روز بعد تازہ دم ہوتے تھے۔ نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ ہفتہ میں صرف دو تین روز ہی وہ ٹھیک رہتے تھے جس دوران وہ لکھنے پڑھنے کا کام یکسوئی سے کر سکتے تھے۔ اس سوانح کے بہت سے حصّے ان ہی دنوں لکھے گئے تھے۔

۱۲ر نومبر ۱۹۹۶ء کے دن اختر صاحب کی ۸۰ ویں سالگرہ شہلا کے گھر ایک چھوٹی سی محفل میں منائی گئی۔ اس محفل میں سودرن بھائی سردار بھائی (مدھوسودن)، سردار جعفری، اندیور، ندا فاضلی، بیدار بخت، یوسف ناظم اور کچھ دیگر لوگ شامل تھے۔ اسی روز پتہ چلا کہ ان کے گردے مکمل طور پر بیکار ہو گئے مگر اختر صاحب پر اس خبر کا کوئی خاص اثر نہیں ہوا اور حسب دستور اپنے کاموں میں مصروف رہے اور آخری وقت تک اپنے سارے ضروری کام کرتے رہے۔

ان کی وفات کے بعد بہت لوگوں نے تعزیت کے خط بھیجے۔ جلسے ہوئے جن میں اظہارِ افسوس کیا گیا۔ میں اس سب کے لیے شکر گزار ہوں۔

اختر صاحب کی وفات سے کچھ دن پہلے ہی ان کی نئی نظمیں 'آجکل' 'شب خون' اور 'ایوان اردو' میں "ذکرِ مغفور" "زمستان سرد مہری کا" اور "نجات" کے عنوان سے چھپیں۔

ان نظموں سے کچھ لوگوں نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ اپنے آخری دنوں میں اختر الایمان اپنی زندگی سے مایوس ہو گئے تھے۔ میں یہ عرض کرنا چاہتی ہوں کہ "ذکرِ مغفور" ۳ر مارچ ۱۹۹۶ء کو مکمل ہوئی "زمستان سرد مہری کا" ۷ر اگست ۱۹۹۱ء کو اور "نجات" ۲۲ر فروری

۱۹۹۳ء کو اختر صاحب نظم مکمل ہونے کے بعد اس کے نیچے تکمیل کی تاریخ ڈالتے تھے اکثر نظم کے شروع کرنے سے تکمیل تک کا وقفہ خاصا لمبا ہوتا تھا۔ ان کی مختلف بیاضوں میں ان تینوں نظموں کے بہت سے ڈرافٹس ہیں جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ نظمیں بھی ایک طویل عرصے میں لکھی گئی ہیں۔ گویا انھوں نے DIALYSIS سے پہلے شروع کی تھیں اگر یہ بات نہ بھی ہو تو بھی ان نظموں سے یہ کہیں ظاہر نہیں ہوتا کہ شاعر زندگی سے مایوس ہے یا موت سے ڈرا ہوا ہے۔

اخترالایمان ہمیشہ اس بات کے قائل تھے کہ زندگی کسی ایک المیے سے ختم نہیں ہو جاتی۔ یہ بات انھوں نے اپنی کئی نظموں میں کہی ہے۔ مثلاً بازآمد میں کہتے ہیں

حلقہ در حلقہ نہ آہن کو تپا کر ڈھالیں
کوئی رنجیدہ نہ ہو!
زیست در زیست کا یہ سلسلہ باقی نہ رہے!

"ذکر مغفور" سے صاف ظاہر ہے کہ سوگواری کا موسم ہمیشہ نہیں رہتا۔ رہ بھی نہیں سکتا وہی گھر جہاں موت نے کہرام اٹھایا تھا کچھ دن بعد نئی زندگی اور خوشیوں کا گہوارہ بن جاتا ہے۔

اختر صاحب کو اس بات کا تو احساس تھا کہ ان کا وقت قریب آرہا تھا مگر اس احساس میں رنج اور افسردگی کا شائبہ تک نہ تھا۔ نظم "کاوش" ۱۳ را پریل ۱۹۹۳ء میں مکمل ہوئی اس نظم کے آخری چار مصرعے میرے خیال کی تائید کرتے ہیں۔

چلو ایک تیز دھارے میں کہیں یہ ڈال دیں کشتی
لطافت ٹھنڈے پانی کی کریں محسوس کچھ تھوڑا نکھر جائیں
ہنسیں بے وجہ یونہی غل مچائیں بے سبب دوڑیں
اڑیں ان بادلوں کے پیچھے اور میلوں نکل جائیں

سلطانہ ایمان

باب ①

جب آنکھ کھلی میرے سرہانے ایک قبر تھی اور ابا کی آواز کانوں میں آرہی تھی۔ وہ مجھے جگا رہے تھے۔ میری عمر اس وقت گیارہ سال کی تھی۔ ان دنوں سے متعلق اب جو بھی یاد ہے اس کی شکل ترتیب دار واقعات کی نہیں ایک منتاج کی سی ہے۔ ذہن نے جو اہم سمجھا محفوظ کر لیا باقی محو ہو کر رفت وگزشت ہو گیا۔

رات کتنی گزر چکی تھی اب کچھ یاد نہیں صرف اتنا یاد ہے ہم عبداللہ پور (جمنا نگر) کے اسٹیشن پر اترے تھے۔ پلیٹ فارم پر لگی ہوئی مٹی کے تیل کی لالٹینیں اجالا کرنے کی پوری کوشش کر رہی تھیں اس کے باوجود بھی گرد و پیش پر اندھیرا غالب تھا۔ میرے پاس ایک ٹین کا صندوق تھا جس کی بناوٹ ایسی تھی جیسے جسم پر آبلے پڑ جاتے ہیں جگہ جگہ سے اٹھا ہوا تھا۔ ابا نے وہ صندوق میرے سر پر رکھ دیا اور باقی سامان خود اٹھا لیا اور ہم اسٹیشن سے باہر نکل کر بغیر کوئی سواری لیے ہوئے ایک لمبی سڑک پر چل کھڑے ہوئے۔

ہم کہاں جا رہے تھے مجھے کچھ معلوم نہیں تھا۔ پچھلا گاؤں ہم جہاں سے چلے تھے اس کا نام کمباسی تھا۔ اس گاؤں کے بارے میں ایسی کوئی تفصیل نہیں جو دلچسپ ہو۔ ایسا بھی کوئی واقعہ نہیں جو بہت اہم ہو۔ سوا اس بات کے کہ جس گھر میں ہم رہتے تھے کہا جاتا تھا وہاں آسیب کا اثر ہے۔ وہ ایک حجّام کا مکان تھا جس کا ایک حصّہ اس نے ہمیں دے رکھا تھا۔ اس مکان میں میرا ایک چھوٹا بھائی رضوان پیدا ہوا تھا، جو تقریباً ہفتہ بھر یا پندرہ دن زندہ رہ کر مر گیا تھا۔ اپنے اس چھوٹے بھائی سے مجھے اتنا لگاؤ ہو گیا تھا کہ میں اس کی قبر پر چلا جاتا تھا اور وہاں بیٹھے روتا رہتا تھا۔ بستی کا کوئی آدمی ادھر سے گزرتا تھا تو مجھے گھر لے آتا تھا۔

میرے والد امامت کا پیشہ کرتے تھے۔ انھوں نے مذہبی تعلیم سہارنپور میں حاصل کی تھی۔ بہت اچھے قاری تھے۔ انھیں دیہات بہت پسند تھے۔ امامت کے علاوہ مسجد کے صحن میں مکتب

کھولتے تھے جہاں دیہات کے ہر عمر کے لڑکے لڑکیاں پڑھنے آتے تھے۔ کمیاسی میں جمیلہ نام کی ایک لڑکی ان کے پاس پڑھنے آتی تھی۔ گورا رنگ، لانبا قد، چھریرا بدن، دل آویز ناک نقشہ۔ ابا اس میں بڑی دلچسپی لیتے تھے۔ کچھ دن بعد جمیلہ نے آنا بند کر دیا اور ابا نے یہ گاؤں چھوڑ دیا۔

میرا خیال ہے کہ کم و بیش ایسا ہی واقعہ ہر جگہ پیش آیا تھا۔ ابا گھر میں سوتے کبھی نہیں تھے۔ مسجد کے حجرے میں رہا کرتے تھے۔ اماں نے مجھے سمجھایا تھا رات کو جب سو رہے ہو آنکھ کھل جائے اور باہر کسی کو اپنا نام پکارتے ہوئے سنو تو جواب مت دینا۔ وہ آسیب ہے۔ سردیوں کی راتوں میں ایسا بہت بار ہوا۔ باہر کسی کو اپنا نام پکارتے ہوئے سنا مگر میں نہ اٹھا نہ بولا۔ میرا خیال ہے وہ آواز ابا کی تھی۔ ابا اور اماں میں ایک دوری تھی۔ وہ زیادہ تر اپنے میکے میں رہتی تھیں۔ اماں ان پڑھ تھیں۔ ابا کے مزاج میں تھوڑی رنگینی تھی۔ شاید یہ دو باتیں اس دوری کا سبب تھیں۔

یہ دیہات جس میں میرا بچپن گزرا زیادہ تر مسلمان آرائیوں اور راجپوتوں کے تھے اور اکثر لڑکیاں اپنے قد و قامت، رنگ، چھب اور نقش و نگار کے اعتبار سے ایسی ہی تھیں جیسی جمیلہ تھی۔ ان دیہاتوں کا اور میرا بڑا ذہنی تعلق ہے۔ میں بچپن سے اکیلا ہوں۔ والدہ جب اپنے میکے چلی جاتی تھیں میں والد کے پاس رہتا تھا۔ میری تعلیم کا ہرج نہ ہو اس خیال سے وہ مجھے اماں کے ساتھ نہیں جانے دیتے تھے۔ میری تعلیم کا تصور ان کے ذہن میں وہی تھا جو انھوں نے خود حاصل کی تھی۔ قرآن حفظ کرنا اور اردو فارسی کی تھوڑی شد بد تاکہ بڑا ہو کر میں بھی ان کی طرح امامت کا پیشہ اختیار کر سکوں مگر یہ خانہ بدوشانہ زندگی جو میرے والد نے اختیار کر رکھی تھی، اس نے کبھی مجھے ایک طرح کی تعلیم پر نہیں جمنے دیا۔ کبھی سرکاری اسکول میں داخل کر دیا جاتا تھا، کبھی قرآن حفظ کرنے پر لگا دیا جاتا تھا اور بس دن رات اسی طرح گزرتے چلے جا رہے تھے۔

ان تصویروں میں جن کا تعلق میرے ذہنی پس منظر سے ہے ایک تصویر میرے ذہن میں بہت واضح ہے۔ میں ایک بیل گاڑی کے پاس کھڑا ہوں۔ ہم ایک گاؤں چھوڑ کر دوسرے گاؤں میں جا رہے ہیں۔ ہمارا سامان بیل گاڑی میں لادا جا رہا ہے اور میں یہ منظر بڑی بے بسی کے ساتھ دیکھ رہا ہوں۔ بے بسی اس لیے کہ میں یہ گاؤں نہیں چھوڑنا چاہتا تھا۔ اس گاؤں کا نام رکڑی تھا۔ یہاں بہت سے جوہڑ تھے۔ جوہڑوں میں کنول اور نیلوفر کھلتے تھے۔ سب طرف بڑے بڑے آموں کے

گھنے باغ تھے۔ باغوں میں کھلیان پڑتے تھے۔ کویلیں کوکتی تھیں۔ پپیہے بولتے تھے۔ ہرے ہرے جنگلوں اور کھیتوں میں ہرنوں کی ڈاریں کلیلیں کرتی دکھائی دیتی تھیں۔ کیکر اور کھجور کے پیڑوں میں بیوں کے گھونسلے تھے جن میں بیٹھے وہ جھولتے رہتے تھے، گیت گاتے رہتے تھے۔ ایک دوسرے کا تعاقب کرتے رہتے تھے۔ بٹیرے تھے۔ شامائیں تھیں، لال تھے جو موسم کی تبدیلی کے ساتھ رنگ بدلتے تھے۔ مینائیں تھیں، خوبصورت آواز والے دیگر تھے غرض کہ وہ سب کچھ تھا جو مجھے مرغوب اور پسند تھا۔ مگر میری مرضی نہیں چلی۔ مجھے گاڑی میں بٹھا دیا گیا اور گاڑی مجھے لے کر روانہ ہوگئی مگر میں وہیں کھڑا رہ گیا۔ یہی وہ گاؤں رکرای۔ تھا جسے چھوڑ کر ہم کمباسی گئے تھے۔

عبداللہ پور (جمنا نگر) سے چل کر ہم جگادھری پہنچے۔ شہر کے باہر، سڑک کنارے ایک چوکی تھی وہاں جو چوکیدار تھا ابّا سے جانے کیوں اس کی تکرار ہوگئی۔ ابّا ایک دم بگڑ گئے۔ جھگڑا شاید اس پر ہوا تھا کہ وہاں رات گزارنا چاہتے تھے۔ اس جھگڑے کے بعد انھوں نے وہاں رات گزارنے کا ارادہ ترک کر دیا اور دوسری سمت جانے والی ایک کچّی سڑک پر مڑ گئے۔

رات چاندنی تھی۔ کچّی سڑک پر تھوڑی دیر چلنے کے بعد ایک بہت بڑا تالاب آیا۔ ابّا تالاب کے کنارے رک گئے۔ آگے تالاب سے گزر کر جانا تھا۔ تھوڑی دیر سوچنے کے بعد ابّا نے کہا میرے پیچھے پیچھے آؤ، اور لاٹھی سے پانی ناپتے ہوئے تالاب میں اتر گئے اور دھیرے دھیرے لاٹھی سے پانی ناپتے ناپتے دوسری طرف پہنچ گئے۔ تالاب سے گزرنے کے بعد راستے میں دو تین باغ پڑے مگر ابّا نہیں رُکے۔ اس کے بعد ایک کانس کا جنگل آیا مگر وہ چلتے رہے۔ ہم بہت دیر تک چلتے رہے۔ جنگل کے بولتے سنّاٹے کے سوا اور کچھ سنائی نہیں دیتا تھا۔ گاہے گاہے آس پاس سے گیدڑوں کے بولنے کی آواز سنائی دے جاتی تھی۔ بہت دیر چلنے کے بعد پھر ایک جوہڑ آیا جس کے دائیں طرف کانس کا جنگل تھا اور سامنے ایک باغ۔ ابّا نے باغ میں سامان رکھ دیا۔ ایک چادر نکال کر بچھا دی اور کہا سو جاؤ۔ میں لیٹتے ہی سو گیا۔

یہ جگہ جہاں ہم نے رات قیام کیا تھا ایک قبرستان تھا۔ کمباسی سے ہم جس جگہ کے لیے روانہ ہوئے تھے اس کا نام سگھ مدرسہ تھا۔ ابّا نے ایک راہ گیر سے دریافت کیا۔ معلوم ہوا سگھ مدرسہ اس جگہ سے بہت قریب ہے۔ وہ باغ جہاں ہم نے رات قیام کیا تھا اور سگھ مدرسہ کے بیچ وہی کانس

کا جنگل جس کا میں نے ذکر کیا ہے اسی باغ سے تھوڑے فاصلے پر ایک گاؤں تھا۔ جس کا نام سگھ تھا اسی کی نسبت سے اس مدرسے کا نام سگھ مدرسہ تھا۔ تھوڑی دیر بعد ہم سگھ مدرسہ پہنچ گئے۔

سگھ مدرسہ دراصل ایک یتیم خانہ تھا جو ایک بغیر چھت کی مسجد اور چند پھونس کے چھپروں پر مشتمل تھا۔ اس سگھ مدرسہ کے مہتمم اور روح رواں حافظ اللہ دیا نام کے ایک صاحب تھے۔ گورے چٹے، قد تھوڑا نکلتا ہوا، طباق سا چہرہ اور پھیلی ہوئی ناک۔ بات چیت میں اچھے تھے اور گوارا آداب و اطوار کے انسان تھے۔ جب ہم سگھ مدرسہ میں آئے اماں اپنے میکے چلی گئی تھیں۔ ابا یہاں کیوں آئے تھے مجھے نہیں معلوم اس لیے کہ یہاں امامت کا کوئی سلسلہ نہیں تھا۔ اس مدرسے میں تیس پینتیس لڑکے تھے۔ یہاں دینی تعلیم کا انتظام بھی تھا۔ جہاں نہ صرف اس مدرسے کے لڑکے پڑھتے بلکہ سگھ بستی کے لڑکے لڑکیاں بھی آتے تھے۔

یہ مدرسہ جنگل کے بیچوں بیچ تھا جس کے دو طرف کھیت تھے تیسری طرف آموں کا باغ اور سگھ بستی اور چوتھی جانب کانس کا بہت بڑا جنگل، جس کے ایک سرے پر ایک بہت بڑی جھیل تھی جس کے پانی میں مگر مچھ تیرتے دکھائی دیتے تھے جو کبھی کبھی کنارے پر بھی آجاتے تھے اور دھوپ میں لیٹے رہتے تھے۔ جھیل کا بیشتر حصہ نرسل اور بٹیرے کے جھنڈ سے پٹا ہوا تھا۔

یہاں مرغابی اور پپیہے کا شکار کرنے بہت شکاری آتے تھے۔ خاص طور پر انگریز۔ سردیوں میں جب کانس کا جنگل پھولتا تھا تو بہت اچھا لگتا تھا۔ مدرسے میں پڑھانے کے لیے ایک نابینا حافظ تھے جن سے لڑکے بہت چڑتے تھے۔ پڑھاتے میں بات بات پر لڑکے کی گردن جھکا کر پیچھے اس کے پاجامے میں ہاتھ ڈال دیتے تھے اور بدھیاں مارتے تھے۔

کچھ روز ساتھ رہ کر میرے والد مجھے چھوڑ کر چلے گئے۔ بعد میں پتہ چلا انھوں نے امامت کا پیشہ ترک کر دیا اور مدرسے کے لیے چندہ اکٹھا کرنے کا کام اپنے ذمے لیا تھا۔ مدرسے کے لیے چندہ وہ گاؤں گاؤں گھوم کر کرتے تھے۔ حافظ اللہ دیا بھی زیادہ تر یہی کام کرتے تھے اور گرمیوں میں چندہ اکٹھا کرنے شملہ چلے جاتے تھے۔ یہاں پھر قرآن حفظ کرنے کا سلسلہ شروع ہو گیا۔

جانے سے پہلے ایک دن ابا نے مجھے نماز سکھائی۔ پوچھا سورۂ فاتحہ آتی ہے میں نے نیت باندھے باندھے کہا ــــــ "آتی ہے"۔

کہنے لگے نماز کی نیت بندھی ہو تو بولا نہیں کرتے۔ میں نے نیت باندھے باندھے کہا ــــ "اچھا"

سگھ مدرسہ چندے کے روپیہ پر کم چل رہا تھا اللہ کی مرضی اور توکل پر زیادہ۔ یہاں کھانا کم اور کھانے کا انتظار زیادہ رہتا تھا۔ راتوں کو افزائشِ رزق کے لیے چلّہ کشی اور قرآن خوانی ہوتی۔ جب کئی دن تک آس پاس کے گاؤں سے کوئی دعوت یا اور کچھ کھانے کو نہیں آتا تھا لڑکوں کو منہ اندھیرے اٹھایا جاتا تھا۔ انھیں کچھ کنکریاں دے دی جاتی تھیں جن پر وہ قرآن کی سورۃ کئی کئی بار پڑھ کر دم کیا کرتے تھے۔ کون سی سورۃ تھی اس وقت مجھے یاد نہیں۔ سردیوں کی راتوں میں اٹھنا مصیبت معلوم ہوتا تھا مگر قہرِ درویش برجانِ درویش۔

سگھ مدرسہ کی اہم چیزوں میں حافظ اللہ دیا کی ایک خوبصورت گھوڑی بھی تھی جس کی ٹہل بشیر نام کا ایک لڑکا کیا کرتا تھا۔ بشیر پر کریم بھی بہت مہربان تھا۔ کریم مدرسے کا چپراسی تھا۔ اور جب لڑکے کہیں باہر دعوت کھانے جاتے تھے وہ ان کے ساتھ جایا کرتا تھا ایک روز ہم قریب کے گاؤں سے دعوت کھا کر پلٹ رہے تھے، راستے میں مارکنڈہ ندی پڑتی تھی جو برسات کے دنوں کے علاوہ اکثر سوکھی پڑی رہتی تھی۔ واپسی میں کریم نے ندی کی ریت پر لڑکوں کو کھیل کی ترغیب دی اور لڑکے ٹھنڈی ریت پر کھیلنے لگے۔ کریم نے بشیر سے کشتی لڑنے کا پروگرام بنایا اور اسے گرا کر چت کرنے کی کوشش کرنے لگا اور بہت دیر تک اس کوشش میں مصروف رہا مگر بشیر نے جیسے زمین پکڑ لی تھی کریم کی ہزار کوشش کے باوجود چت ہو کر نہیں دیا۔ آخر کریم نے کہا وہ ہار گیا۔ کھیل ختم ہو گیا اور لڑکے مدرسہ کے لیے روانہ ہو گئے۔

کچھ دن بعد ابا واپس آ گئے اماں بھی آ گئیں۔ ایک رات اماں سوتے سوتے ایک دم ہڑبڑا کر اٹھیں۔ انھیں اپنے سینے پر کچھ رینگتا ہوا محسوس ہوا۔ انھوں نے جھٹک دیا۔ ابا نے جلدی سے لالٹین جلائی دیکھا ایک چھوٹا سا سانپ ہے۔ ایک رات ہم چولھے کے پاس بیٹھے کھانا کھا رہے تھے۔ اچانک چولھے کی عقبی دیوار سے ایک بہت بڑا سانپ نکلا اور تیزی

سے دوسری طرف چلا گیا اور غائب ہوگیا۔ اس کے علاوہ اور بھی کچھ یادیں ہیں جن میں دو اہم یہ ہیں۔ ایک لالی کا سر اور دوسرے برسات کے کیڑے۔

سکھ مدرسہ میں دو بہن بھائی پڑھتے تھے۔ لڑکے کا نام میرے ذہن میں نہیں لڑکی کا نام لالی تھا۔ وہ کسی بیرے یا بٹلر کے بچے تھے جو شملہ میں کام کرتا تھا۔ انھیں حافظ اللہ دیا لے آئے تھے۔ لالی بہت چھوٹی تھی۔ یہی کوئی چار پانچ سال کی ہوگی۔ سب لڑکے اس سے بڑا لاڈ کرتے تھے۔ ایک روز سو کر اٹھے تو معلوم ہوا لالی غائب ہے۔ سب کو بڑا تعجب ہوا۔ وہ کہاں جا سکتی ہے۔ مدرسے میں ہر جگہ ڈھونڈا مگر نہیں ملی۔ سب جنگل کی طرف دوڑے اسے پکارتے ہوئے کچھ لڑکے جنگل میں ایک طرف گئے کچھ دوسری طرف آخر لالی مل گئی۔ ایک کھڈ کے باہر کچھ خون، خون میں لت پت لالی کے کپڑے اور اس کی کھوپڑی پڑی تھی۔ اسے لکڑ بگھا اٹھا لے گیا تھا۔

ہر طرف جنگل ہونے کی وجہ سے رت کو بھنگے اور پتنگے بہت آتے تھے اور جب کھانا کھانے بیٹھتے تھے تو دال میں گر گر جاتے تھے۔ ان کی بو اتنی تیز اور خراب ہوتی تھی کہ اب تک میری ناک میں بسی ہوئی ہے۔

کچھ مدت بعد ابا اور حافظ اللہ دیا میں اختلاف ہوگیا۔ کیوں؟ اس کی تفصیل مجھے نہیں معلوم مگر اس اختلاف میں نابینا حافظ کا ہاتھ ضرور تھا۔ جانے کس بات پر ایک دن حافظ صاحب سے باتیں کرتے کرتے ابا چراغ پا ہوگئے اور لکھنے کی لکڑی کی تختی جو ان دنوں خاص طور پر مکتبوں میں استعمال ہوتی تھی اٹھا کر ان کی کمر پر دے ماری۔ اس واقعہ کے بعد سکھ مدرسے سے ہمارا سلسلہ منقطع ہوگیا اور ہم رہنے کے لیے سکھ بستی میں چلے گئے۔

سکھ بستی پچاس ساٹھ گھروں کا ایک چھوٹا سا گاؤں تھا جس میں زیادہ تر مسلمان راجپوت اور ارائیں کاشت کار تھے۔ وہاں رحمت اللہ نام کا ایک شخص تھا جس نے اپنی حویلی کا ایک حصہ ہمیں رہنے کے لیے دے دیا تھا۔ میری تعلیم کا دھرّہ پھر بدل گیا۔ میں سکھ مدرسے میں قرآن حفظ کر رہا تھا مگر سکھ بستی میں آنے کے بعد ابا نے مجھے سرکاری اسکول میں داخل کرا دیا۔ سکھ سے ڈیڑھ

میل کے فاصلے پر ایک پرانا قصبہ تھا جس کا نام بوڑیہ تھا۔ وہاں ایک مڈل اسکول تھا۔ پڑھنے کے لیے میں وہاں جانے لگا۔ مدرسے کے قریب ایک محل نما مکان، محل نما کیا محل ہی تھا۔ کس کا تھا نہیں معلوم۔ بہت سال بعد معلوم ہوا وہ بیربل کا محل تھا۔ قصبہ بوڑیہ بھی بہت قدیم بستی معلوم ہوتا تھا جگہ جگہ منہدم مکانات تھے۔ ایسا محسوس ہوتا تھا یہ شہر ضرور کسی قدیم تہذیب کا حصہ ہے۔ ابھی سال پہلے میں نے اخبار میں پڑھا وہاں کھدائی ہوئی دو تین صدی قبل مسیح کی تہذیب کے آثار ملے۔

سگھ بستی سے نکلتے ہی دائیں بائیں آموں کے باغ تھے اور بیچ میں کانس کا جنگل۔ بوڑیہ کا راستہ اسی جنگل سے ہوکر گزرتا تھا۔ یہ اسی کانس کے جنگل کا سلسلہ تھا جو سگھ مدرسے کے اردگرد پھیلا ہوا تھا۔ مارکنڈ ندی اس جنگل کو چھوتی ہوئی گزرتی تھی۔ پانی صرف برسات کے دنوں میں ہوتا تھا۔ باقی دنوں میں مارکنڈہ سوکھا پڑا رہتا تھا۔ چلچلاتی دھوپ اور یخ بستہ سردیوں میں جب میں اس ندی کی ریت پر سے ننگے پاؤں گزرتا تھا تو میرے آنسو نکل آتے تھے۔ تلوؤں کو دھوپ اتنا نہیں جلاتی تھی جتنا سردی جلاتی تھی۔ مجھے اکثر ایسا احساس ہوتا ہے جیسے اس بستی میں کئی جنم گزارے تھے۔ کتنا اتار چڑھاؤ دیکھا اور بھگتا جیسے ہفت خواں طے کیا ہو۔

کچھ کردار اس بستی کے میرے ذہن میں بہت واضح ہیں۔ پہلے تو ایک ہی نام کے تین آدمی۔ ایک وہ رحمت بخش جس نے ہمیں اپنی حویلی میں جگہ دی تھی۔ دوسرا رحمت جو بالکل سامنے والی حویلی میں رہتا تھا۔ اور تیسرا رحمت ایک زمین دار تھا جس کا شوق ڈاکے ڈالنا تھا۔ پہلی بار جب میں نے دیکھا اسے پولیس گرفتار کرکے لے جا رہی تھی اور اس کے دونوں ہاتھ پیچھے کی طرف بندھے ہوئے تھے۔

اس کا ایک لڑکا تھا شیر علی جو سگھ مدرسے میں پڑھنے آتا تھا۔ اس کی وجہ سے میرا اس گھر میں آنا جانا تھا۔ رحمت کی دو بیویاں تھیں۔ پہلی بیوی سے شیر علی تھا۔ دوسری ایک بڑی خوش شکل بڑی ہنسوڑ، لوٹا سا قد عورت تھی جس کا نام نیازی تھا۔ سنا تھا وہ کوئی طوائف تھی۔ ایک بار کہیں مجرا کر رہی تھی۔ رحمت نے دیکھا اور اسے پسند آگئی مجرا کرتی محفل سے اٹھا لایا اور شادی کر لی۔

رحمت چھ فٹ سے نکلتا ہوا، چھریرے چست بدن کا، مردانہ خط و خال کا، قبول صورت آدمی تھا۔ اپنی لاٹھی کے ایک سرے پر چھوٹی سی تیز کلہاڑی پیوست کیے رہتا تھا۔ یہ زمانہ جب

میں نے اسے دیکھا ایک طرح سے تیاگ کا زمانہ تھا۔ اس نے ڈاکہ زنی تقریباً چھوڑ دی تھی اور اپنی چوپال میں بیٹھے اپنے کارنامے سناتا رہتا تھا۔ اس کے بارے میں جو کہانیاں سنی تھیں۔ ان سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ بہت تیز رفتار تھا۔ ہرن سے زیادہ تیز بھاگتا تھا۔ کسی کے ہاتھ نہیں آتا تھا۔ اور موقعہ واردات پر کبھی نہیں پکڑا گیا۔ اس کے واقعات میں ایک یہ بھی تھا کہ ایک بار اس نے بیلوں کا تانگا دیکھا جو بہت خوبصورت بنا ہوا تھا۔ اسے پسند آیا اور سر پر اٹھا کر بھاگ گیا۔

جس رحمت کے گھر میں ہم تھے۔ اس کی بیوی کا نام اللہ دی تھا۔ ایک بار رحمت کسی کام سے گاؤں سے باہر گیا ہوا تھا۔ آدھی رات کو اللہ دی کے چلانے اور شور مچانے کی آواز آئی ہم باہر نکل آئے۔ دیکھا صحن میں ایک آدمی کھڑا تھا۔ گھر کے صحن میں پیڑ کا گدا پڑا تھا۔ اس اس نے اٹھا کر ہماری طرف پھینکا جو ہماری چھوٹی بہن اختری کو لگا۔ اس کی حرکت پر اماں خفا ہو کر چلانے لگیں۔ وہ آدمی فوراً باہر چلا گیا۔ ایک دو روز بعد جب رحمت واپس آیا اسے اس واقعے کا علم ہوا۔ اللہ دی نے اپنے شوہر سے کیا کہا ہمیں نہیں معلوم مگر میاں بیوی میں بظاہر کوئی جھگڑا نہیں ہوا۔

دو چار روز بعد معلوم ہوا رحمت پھر کسی کام سے گاؤں سے باہر جا رہا ہے۔ شام ہو رہی تھی۔ ہم نے دیکھا ایک پوٹلی میں کچھ باندھے اسے اپنی لاٹھی کے سرے پر لٹکائے وہ حویلی کے باہر جا رہا ہے۔ وہاں سے اس نے کہا "ملانی، گھر کا دھیان رکھنا ایک دو دن کے لیے گھر سے باہر جا رہا ہوں"۔ بات ختم ہو گئی۔ رات کھانا کھا کر سو گئے۔ اچانک شور ہوا۔ ہم ہڑبڑا کر اٹھے۔ گھر سے باہر آئے تو دیکھا رحمت کسی کا پیچھا کرتا ہوا گھر سے باہر نکلا اور لاٹھی میں لگی ہوئی اپنی کلہاڑی سے اس پر وار کیا مگر حویلی کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ وہ آدمی بھاگ نکلا۔ رات آدھی سے زیادہ گزر چکی تھی۔ کسی نے کسی سے کوئی بات نہیں کی اور جا کر سو گئے۔ اگلے روز بات کی تفصیل معلوم کی۔ اللہ دی کو یقین تھا کہ اس کا عاشق اسے پھر پریشان کرنے آئے گا۔ میاں بیوی نے پلان بنایا۔ رحمت ایسا ظاہر کر گیا وہ باہر جا رہا ہے اور اندھیرا ہونے کے بعد واپس آ جائے گا۔ اندازہ ٹھیک نکلا۔ عاشق پھر آیا مگر ہوشیار ہو کر آیا۔ صحن کا دروازہ اس نے کھلا چھوڑ دیا تھا اسی وجہ سے بھاگ نکلا۔ یہ بات کبھی نہیں کھل سکی۔ اللہ دی کا واقعی معاشقہ تھا یا اس کا عاشق ضرورت سے زیادہ من چلا تھا۔

اماں میری وجہ سے پریشان تھیں۔ ان کا خیال تھا پڑوسی ہونے کی وجہ اللہ دی کا عاشق کہیں مجھے پریشان نہ کرے۔ مگر ایسا نہیں ہوا۔ اسکول کے راستے میں اس آدمی سے ملاقات ہوئی تو وہ بڑے پیار سے ملا۔ افسوس ظاہر کیا کہ پیڑ کا گدا پھینکنے کی وجہ سے میری بہن کو چوٹ آئی۔ اس نے کہا وہ رحمت کو نہیں چھوڑے گا۔ اس نے ایسا بتایا کہ اللہ دی کی شہ پر وہ گھر آیا تھا مگر اللہ دی ڈر گئی اور اس نے شور مچا دیا۔ میں نے دیکھا اس کا الٹا پاؤں پیچھے سے کٹا ہوا تھا جس پر اس نے پٹی باندھ رکھی تھی۔ کچھ دنوں بعد اللہ دی کا عاشق مر گیا کیا ہوا تھا نہیں معلوم۔

وہ رحمت جس کی حویلی ہمارے گھر کے سامنے تھی اس کا واقعہ بھی ایک المیہ ہے۔ پڑوس کے مکان میں اس کی ایک بیوہ بہن رہتی تھی۔ ایک رات بہن کے گھر میں چیخ پکار سن کر وہ بہن کی مدد کو گیا۔ دیکھا گھر میں ایک پاگل گیدڑ گھس آیا ہے۔ گیدڑ نے رحمت پر حملہ کیا اور اسے کاٹ لیا۔ چند روز بعد رحمت پاگل ہو گیا۔ وہ گیدڑ کی طرح چلانے لگا تھا۔ لوگوں نے اسے پلنگ پر لٹا کر رسیوں سے باندھ دیا اور پانی کی بالٹیاں بھر بھر کر اس پر ڈالتے رہے اس کی بیوی، دو بیٹے اور ایک بیٹی اس کام میں لگے رہتے تھے۔ عیدالفطر کے دن اس کا انتقال ہو گیا۔ کچھ دن بعد میں نے دیکھا بوڑیہ کا ایک مہاجن اپنے قرضے کی ادائیگی میں ان کے بیل کھول لے جا رہا ہے مگر بستی کے لوگوں نے بیچ میں پڑ کر کچھ فیصلہ کرا دیا اور وہ بیل نہیں لے گیا۔ میں ان ہی لڑکوں کے ساتھ کبھی کبھی ان کے کھیت میں جاتا تھا اور ہل چلانا سیکھتا تھا۔

باب ②

سکھ بستی میں جو گھر ہمیں ملا تھا اس کی چھت میں کنکھجورے بہت تھے۔ کچے گھروں کی چھت میں کڑیوں کے اوپر سرکنڈہ نہیں ڈالتے، جانے کیوں اس گھر میں تھا۔ وہ سرکنڈہ گل گیا تھا۔ اور اس میں کنکھجورے پیدا ہوگئے جو رات کو اکثر ہمارے اوپر گرتے رہتے تھے مگر ہم اس پریشانی کے بعد بھی اسی گھر میں رہتے تھے۔

میرے والد ہمیں اس گاؤں میں چھوڑ کر خود جگادھری چلے گئے تھے اور وہاں چنگی میں ملازمت کر لی۔ ہفتہ عشرہ میں ایک بار گھر آتے تھے۔ خرچ کی تنگی تھی یا کوئی اور وجہ میری والدہ نے دو تین گائیں پال لی تھیں اور ان کا دودھ شہر میں بھیجنے لگی تھیں۔ جب میں اسکول جاتا دودھ اپنے ساتھ لے جاتا اور ایک حلوائی کی دکان پر دے دیتا تھا۔ وہ ہاتھ کے ہاتھ مجھے پیسے دے دیتا تھا۔ جو میں لاکر اماں کو دے دیتا تھا۔

یہ سارا علاقہ بہت ہرا بھرا تھا۔ باغوں اور تالابوں کے علاوہ گاؤں کے نزدیک ایک بارہ دری تھی۔ اس میں کوئی رہتا نہیں تھا۔ بارہ دری خالی پڑی تھی دیواروں اور چھتوں پر شکست و ریخت کے آثار نمایاں ہونے لگے تھے۔ ایک حوض تھا جو سوکھا پڑا تھا۔ اس کا فوارہ ٹوٹ گیا تھا مگر جامن، جموے، کٹھل، بڑھل، لسوڑے، گوندنی، مولسری، مہوا، آم، دنیا بھر کے پیڑ اس میں تھے۔ کہیں کہیں کچھ گلاب کے پودے بھی تھے۔ جب مولسری اور مہوے کا زمانہ آتا تھا ساری بارہ دری خوشبو سے بھر جاتی تھی۔ جب کوئی کام نہیں ہوتا تھا میں اس بارہ دری میں آکر بیٹھ جاتا تھا۔ میرے دوست بہت ہوتے تھے مگر اکثر کے ساتھ خلا ملا نہیں ہوتا۔ مجھے تنہائی اچھی لگتی ہے۔ کوئی جگہ مجھے بھا جائے میں وہاں بلا مقصد کے بیٹھ سکتا ہوں۔ گھنٹوں بیٹھ سکتا ہوں۔ اس بستی میں یہ بارہ دری تھی۔ کبھی کبھی میرے ساتھ بستی کے لڑکے بھی ہوتے تھے مگر اب مجھے ان میں سے کسی کا نام یاد نہیں سوا ایک لڑکے کے۔ اس کا نام فتح دین تھا۔

فتح دین بہت خوش طبع، رنگین مزاج آوارہ منش لڑکا تھا۔ لمبا، دُبلا پتلا، کالا، پھیڑی ناک دیکھنے میں بالکل ایک لمبی چھپکلی معلوم ہوتا تھا مگر ہنستا بہت تھا۔ سگھ مدرسہ سے ڈھائی تین فرلانگ کے فاصلے پر عین جھیل کے سامنے بہت اونچے ٹیلے پر بو علی شاہ قلندر کا مزار تھا۔ فتح دین کا باپ اس مزار کا متولی تھا، اس مزار پر غالباً سجادوں کے آخر دنوں میں ایک میلہ لگتا تھا جس پر دور دور کے گاؤں سے لوگ چڑھاوے چڑھانے آتے تھے۔ چڑھاوے میں ملیدہ اناج اور پیسے ہوتے تھے۔ میلے کے دنوں میں فتح دین کے ساتھ میں بھی وہاں چلا جاتا تھا۔ وہاں ایک جوگی کا لڑکا آیا کرتا اور اپنی سارنگی پر لوک گیت گایا کرتا تھا۔ وہ میرا ہی ہم عمر تھا میں بیٹھا اس سے لوک گیت سُنا کرتا تھا۔ اس کی آواز بڑی اچھی تھی۔ اس کی آواز میں ایک مٹھاس اور ایک نامعلوم درد سا تھا۔

مزار پر مور کے پروں کی بنی ہوئی جھاڑو (مورچھل) رکھی رہتی تھی۔ فتح دین کا باپ چڑھاوا چڑھانے والوں کے سروں کو اس مورچھل سے چھو کر قبولیت کا اظہار کرتا تھا۔ کبھی کبھی جب فتح دین کا باپ اِدھر اُدھر ہوتا تھا۔ میں بھی یہی کرتا اور چڑھاوے میں جو پیسے ہوتے تھے اٹھا کر اپنی جیب میں رکھ لیتا تھا۔

جگا دھری سگھ سے پیدل تقریباً گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹے کا راستہ تھا۔ ایک بار میں ابّا سے ملنے جگا دھری گیا۔ وہ جب نماز پڑھنے مسجد میں گئے تو اپنے ساتھ مجھے بھی لے گئے۔ اس مسجد کے امام نے مجھ سے کہا تمہارے والد نے دوسری شادی کر لی ہے۔ وہی بات آ کر میں نے امّاں سے کہہ دی اور اس دن سے گھر میں فساد کھڑا ہو گیا تھا جب والد سگھ آتے امّاں کے اور ان کے درمیان سخت لڑائی ہوتی۔ ایک روز وہ لڑائی اتنی بڑھی کہ ناقابل برداشت ہو گئی۔ میں نے اٹھ کر ابّا کو ایک طرف کر دیا اور دونوں کے بیچ کھڑا ہو گیا۔ اس دن کے بعد سے ابّا نے سگھ آنا بہت کم کر دیا۔

سگھ اور بوڑیہ کے درمیان ایک اور چھوٹا سا قصبہ تھا جس کا نام عادل پور تھا وہاں ایک لڑکا رہتا تھا جس کا نام شنکر تھا۔ وہ بھی میرے ساتھ اسی بوڑیہ اسکول میں پڑھتا تھا۔ ہم دونوں ایک دوسرے کو اتنا چاہتے تھے کہ کم و بیش ہر وقت ساتھ رہتے تھے۔

وہ میرا ہی ہم سن تھا۔ میں گھر سے اسکول کے لیے منہ اندھیرے ہی نکل پڑتا تھا اور جب عادلپور پہنچتا تھا تو شنکر کو راستے میں انتظار کرتا ہوا پاتا تھا۔ ایک روز شنکر نے کہا وہ سسرا جا رہا ہے اس کے ماموں نے بلایا ہے۔ جانے کے بعد وہ پھر نہیں پلٹا۔ میں بالکل تنہا رہ گیا۔ اس تنہائی کا نتیجہ یہ ہوا کہ فتح دین سے میری دوستی بڑھ گئی وہ "دوجینا" تھا۔ نظر نام کا ایک لڑکا تھا۔ اسے کبھی باغوں کے کونے کھدروں میں لیے پڑا رہتا تھا اور ایک لڑکی تھی اس سے کبھی اس کی دوستی تھی۔ ایک روز وہ مجھے اپنے ساتھ لے گیا۔ وہ لڑکی جس کا میں نے ابھی ذکر کیا ہے جنگل میں اس کا انتظار کر رہی تھی۔ فتح دین لڑکی کو سرکنڈے کے ایک جھنڈ کے پیچھے لے گیا۔ تھوڑی دیر بعد آیا اور مجھ سے کہا اب تم جاؤ۔ میں گیا۔ وہ ننگی ٹیڑی کی طرح آسمان کی طرف ٹانگیں اٹھائے لیٹی تھی۔ اس منظر کو دیکھ کر مجھے ایسی گھبراہٹ ہوئی کہ میں وہاں سے بھاگ کھڑا ہوا۔ مگر اس واقعے کے بعد بھی فتح دین سے میری دوستی ختم نہیں ہوئی ہم ساتھ جنگلوں اور باغوں میں گھومتے رہتے تھے۔ دور دور کے گاؤں میں رات کو نوٹنکی دیکھنے چلے جاتے تھے۔ میلوں اور عرسوں میں ساتھ جاتے تھے۔ اس آوارہ گردی اور سنگت کا یہ نتیجہ ہوا کہ گھر سے اسکول کے لیے جو فیس کے پیسے ملے تھے میں نے ایک میلے میں خرچ کر دیئے۔ اسکول جانا بند کر دیا۔ یہاں تک کہ اسکول سے میرا نام کٹ گیا۔ اب میرا معمول یہ بن گیا تھا کہ میں اپنی گایوں کو خود چرانے کے لیے لے جاتا تھا۔ گاؤں میں کسی کا ایکھ (اوکھ) کٹتا تھا وہ کاٹنے جاتا تھا۔ جس کے عوض بیس گنے اور گو لے ملتے تھے۔ کسی کا گیہوں یا چنے کا کھیت کٹتا تھا وہاں جاتا تھا۔ اور کٹائی کے عوض شام کو ایک گٹھری چنے یا گیہوں ملتا تھا۔ مگر یہ ڈھرّہ بہت دن نہیں چلا۔ میرے نانا اور ماموں آکر میری والدہ کو اپنے ساتھ لے گئے اور والد مجھے اپنے ساتھ جگادھری لے آئے۔ یہ ۱۹۲۸ء کی بات ہے۔

میری والدہ کے مزاج میں خود اعتمادی اور ضد بہت تھی۔ وہ ناخواندہ تھیں۔ اپنا نام تک لکھنا نہیں آتا تھا مگر انھوں نے کبھی اپنے کو معذور یا میرے والد کا دست نگر نہیں سمجھا وہ اپنی گزر بسر کے لیے کچھ نہ کچھ کر لیتی تھیں بھینسیں پال لیتی تھیں یا پھر کپڑے سینے شروع کر دیتی تھیں۔ وہ مرتے مرگئیں مگر ان کے ذہن سے یہ بات نہیں نکلی کہ میرے والد کی

دوسری بیوی ہے جبکہ آج تک اس کا کوئی ثبوت نہیں ملا۔ آخر زمانے میں اپنے والد کو میں نے وطن بھیج دیا تھا۔ جہاں دماغ کی رگ پھٹ جانے سے اسی سال کی عمر میں ان کا انتقال ہوگیا۔ انتقال کے وقت میری والدہ کی عمر پچھتر سال تھی۔ جو ضد میری والدہ کے مزاج میں تھی وہی والد کے مزاج میں تھی۔ اس لیے کہ وہ بھی خودساختہ آدمی تھے۔ وہ حافظ تھے۔ اور عربی، فارسی، ہندی اور اردو کے ماہر تھے۔ انھوں نے طب پڑھی تھی مگر وہ سب انھوں نے اپنی محنت سے کیا تھا۔ اس طرح کے لوگ جو خودساختہ ہوتے ہیں زندگی کی صعوبتیں انھیں کبھی ضدی اور ہیکڑ بنا دیتی ہیں اور کبھی منکسر المزاج۔ جب میرے دادا کا انتقال ہوا میرے والد کی عمر بھی گیارہ بارہ سال کی تھی میرے دادا گڑھوال میں کپڑے کا کاروبار کرتے تھے۔ ان کے مرنے کے بعد ان کے بڑے دو لڑکوں نے دکان، دکان کا اثاثہ، دو تین مکان اور جو کچھ بھی انھوں نے چھوڑا تھا سب آپس میں بانٹ لیا۔ میرے والد گھر چھوڑ کر سہارنپور چلے گئے، اور حافظ قرآن ہو کر امامت پیشہ ہو گئے۔

جگادھری آکر میری تعلیم کا ڈھرہ پھر بدل گیا۔ مجھے پھر ایک ایسے اسکول میں داخل کر دیا گیا جہاں قرآن خوانی کی تعلیم ہوتی تھی۔ میونسپلٹی میں جہاں والد کام کرتے تھے اس کے ایک چپراسی کے گھر میں ہمیں رہنے کی جگہ ملی۔ اس چپراسی کا لڑکا پولس میں سپاہی تھا۔ اور اس کی بیوی دق کی مریض تھی۔ یہ کہاروں کا محلہ تھا۔ مرد ڈولیاں اور پالکیاں اٹھانے کا کام بھی کرتے تھے اور عورتیں مہریاں تھیں چونکہ اس شہر میں ڈولیوں کا بہت رواج نہیں تھا۔ اس لیے مرد بھی زیادہ تر امراء کے گھروں میں پانی ہی بھرتے تھے۔ ان دلوں نل کا رواج نہیں تھا۔ پڑوس میں ایک بڑی سانولی سی لڑکی رہتی تھی۔ میری ہی ہم سن تھی۔ وہ آکر میرے پاس ہی بیٹھا کرتی تھی ایک بار اپنے ساتھ مندر بھی لے گئی تھی۔ میری اس قدر دل دادہ تھی کہ جب اسے کوئی کام نہیں ہوتا تھا میرے یہاں آجاتی تھی۔ وہ لڑکی، آج جب میں اس کا تصور کرتا ہوں تو محسوس ہوتا ہے خوشبو کا ایک جھونکا تھی۔ میرے خیال میں اسے کوئی نام دیا ہی نہیں جا سکتا۔ وہ ایک بہت اچھا سا، خوبصورت سا، غیر مرئی سا خیال تھا ایک جھنکار تھی پازیب کی، پائل کی، جھرنے کی۔

کچھ دن بعد میری والدہ واپس آگئیں اور ہم نے وہ محلہ چھوڑ دیا۔ اب جو گھر ہمیں ملا تھا وہ

شہر کے دوسرے کنارے پر تھا۔ گھر کے بالکل سامنے ایک گندا نالہ تھا۔ کچھ دن تو اس کی بُو نے بہت پریشان کیے رکھا رات کو سونا مشکل تھا کچھ بُو کی وجہ سے کچھ مچھروں کی وجہ سے مگر پھر عادت ہو گئی۔ بُو بھی نہیں آتی تھی اور مچھر بھی نہیں کاٹتے تھے۔ یا ہم نے بو اور مچھروں سے مفاہمت کر لی تھی یا انھوں نے۔

وہ مدرسہ جس میں اب پڑھنے جاتا تھا ایک مسجد کا حصہ تھا۔ میرا لحن اور قرأت بہت اچھی تھی۔ وہ مولوی صاحب جو یہاں تعلیم دیتے تھے انھوں نے مجھے بالکل تماشے کا بندر بنا دیا تھا۔ باہر کی کوئی مذہبی شخصیت جب بھی مدرسے میں آتی تھی مجھ سے قرأت سنواتے تھے۔ ایک مناجات تھی

ع ترے ذات ہے اکبری سروری
مری بار کیوں دیر اتنی کری

وہ ترنم سے سنواتے تھے اور مجھے مانیٹر بنا دیا تھا۔ اس اسکول میں تین لڑکوں سے میری بہت اچھی دوستی تھی۔ اچھن، لچھن دو بھائی تھے۔ ایک لڑکا اور تھا جس کا نام اسمٰعیل تھا۔ دوستی زیادہ تر اس وجہ سے بھی ہوئی کہ وہ بھی میرے گھر کے آس پاس ہی رہتے تھے۔ یہ تینوں ڈیرہ دار طوائفوں کے لڑکے تھے۔ اچھن اور لچھن تو ایسے ہی تھے۔ مزاج اور طبیعت میں تھوڑا الھڑپن تھا مگر اسمٰعیل سنجیدہ طبیعت کا لڑکا تھا۔ اسمٰعیل کی ماں کا نام حشمت تھا۔ وہ بہت سخت پردہ کرتی تھی مگر بہنیں پیشہ کرتی تھیں۔ اس کی تین بہنیں تھیں عشرت، مشتری اور گلاب۔ گلاب تو میری ہم عمر تھی مگر عشرت اور مشتری بڑی تھیں اور بہت خوبصورت بھی یہ مجھے بہت بعد میں جا کر معلوم ہوا کہ ڈیرہ دار طوائفوں میں گھر کی بہو پیشہ نہیں کرتی۔ اسمٰعیل کی ماں اتنا سخت پردہ کرتی تھی کہ اسمٰعیل کبھی مجھے اپنی ماں سے ملانے نہیں لے گیا عشرت اور مشتری کے پاس میں اکثر جا کر بیٹھ جاتا تھا۔ مگر وہ بہت اچھی اور مہذب لڑکیاں تھیں۔

ایک بار ایسا ہوا، یہ اسمٰعیل سے ملاقات اور دوستی سے بہت پہلے کا واقعہ ہے۔ ایک روز میں نے دو نہایت خوبصورت لڑکیوں کو پیادہ پا دو تین آدمیوں کے ساتھ جاتے دیکھا مجھے وہ اتنی اچھی لگیں کہ میں بھی ساتھ ہو لیا۔ کچھ دور چلنے کے بعد قلعے جیسے پھاٹک اور

برجیوں والا ایک مکان آیا وہ اس کے اندر داخل ہوگئیں میں بھی چلا گیا۔ اندر ایک تخت پر ایک ادھیڑ عمر کا تنومند آدمی بیٹھا تھا۔ دونوں سلام کرکے اس کے پاس بیٹھ گئیں۔ میرا خیال ہے وہ جگادھری کا کوئی بہت بڑا رئیس یا چھوٹا موٹا راجہ ہوگا۔ وہ غالباً علیل تھا۔ اور یہ دونوں لڑکیاں اس کی عیادت کو گئی تھیں۔ ان صاحب نے میری طرف دیکھا اور پوچھا یہ لڑکا کون ہے۔ وہ دونوں ناواقف تھیں۔ وہ صاحب زیرلب مسکرا کر خاموش ہوگئے۔ اسمٰعیل سے دوستی کے بعد جب میں اس کے گھر گیا تو پھر ان لڑکیوں کو دیکھا اور اس نے بتایا کہ وہ اس کی بہنیں ہیں۔ ایسا ہی سخت پردہ اچھن اور للجھن کی ماں بھی کرتی تھی۔ میں ان کے گھر بھی جایا کرتا تھا۔ ان کی چھوٹی بہن استاد سے گانے کی تعلیم لیا کرتی تھی اور بڑی بہن ساتھ گایا کرتی تھی۔ ایک بار سے زیادہ میں نے دیکھا لڑکی جب کوئی غلطی کرتی تھی استاد پوری طاقت سے سارنگی بجانے کا گز گھما کر مارتے تھے۔ لڑکی بلبلا کر دوہری ہوجاتی تھی۔ ایک بار کسی نے مجھے ایک منتر سکھایا جسے پڑھ کر میں گال اور کھال میں سے سوئی نکال دیتا تھا۔ اچھن یہ تماشہ دکھانے کے لیے مجھے اپنی ماں کے پاس لے گیا۔ وہ ادھیڑ عمر کی عورت تھی اور میں بچہ ہی تھا۔ مگر وہ اس پر خفا ہوئی کہ وہ مجھے اندر کیوں لے گیا۔

والدہ کے پاس آجانے سے وہ آزادی اور آوارگی جو مجھے سنگھ میں میسر تھی نہیں رہی میں بنیادی طور پر خواب کار ہوں۔ گھنٹوں بلکہ دنوں تنہا بیٹھا اپنے آپ میں گم رہ سکتا ہوں۔ لوگوں سے ملنا جلنا یا ہاؤ ہو مجھے بہت تھوڑی دیر کے لیے اچھا لگتا ہے۔ اگر یہ کام لمبا ہوجائے تو میں ہنگامہ چھوڑ کر پچھلے دروازے سے بھاگ لیتا ہوں۔ یہاں جگادھری میں گندے نالے کے دوسری طرف بہت سے باغ تھے اور کنڈ کے کنارے کئی مندر تھے۔ اس جگہ کو غالباً سورج کنڈ کہتے تھے۔ میں کسی تنہا گوشے میں کنڈ کے کنارے سیڑھیوں پر جاکر بیٹھ جاتا تھا اور لوگوں کو کنڈ میں پوجا کرتے اور پیسے پھینکتے ہوئے دیکھتا رہتا تھا۔ کبھی کبھی کنڈ میں نہاتا تھا اور وہ پیسے کیچڑ میں سے چنتا تھا جو لوگ پوجا کے وقت پھینکتے تھے۔

یہ گھر جس میں ہم رہتے تھے اس کے پڑوس میں ایک کمہار کا گھر تھا۔ جو بہت اچھے برتن بناتا تھا۔ اس کی ایک بیٹی تھی جس کا نام سیتا تھا۔ میں اکثر اسے اپنے گدھوں کو کھیتوں میں چرانے کے لیے جاتے دیکھا کرتا تھا۔ آج جب میں اس کے بارے میں سوچتا ہوں یا کبھی

اس کا خیال آجاتا ہے تو ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے وہ راجکماری سیتا ہی کا کوئی جنم تھا۔ لانبا قد، چمپئی رنگ، بے داغ خوبصورت چہرہ بہت خوش آئند سا چلنے کا انداز مگر ان سب باتوں سے تو کوئی سیتا نہیں ہو جاتی۔ نام رکھ لینے سے کیا ہوتا ہے۔

تھوڑے دن بعد ہم یہ گھر چھوڑ کر دوسرے گھر میں جا بسے۔ تھا وہ بھی اس گندے نالے کے کنارے مگر یہاں سات گھر چھوڑ کر۔ اس گھر اور پڑوس کے گھر کے درمیان دیوار میں ایک دروازہ بھی تھا۔ جس میں سے وہ لوگ ہمارے یہاں اور ہم ان کے ہاں جا سکتے تھے۔ میرا خیال ہے یہ دونوں مکان ایک ہی مکان کا حصّہ تھے۔ جس کے مالک پڑوس کے مکان والے تھے۔ میں نے اس گھر کے مرد کو کبھی نہیں دیکھا اور دیکھا بھی ہوگا تو وہ بالکل میرے ذہن میں نہیں البتہ اس گھر کی عورتیں مجھے یاد ہیں۔ ایک ماں دو بیٹیاں۔ بڑی بیٹی جوان تھی۔ اور طبعًا کھلنڈری۔ اس گھر کے برابر یعنی وہ مکان کا حصّہ جس میں ہم تھے اس سے ملی ہوئی دیوار کے دوسری طرف ایک طویلہ تھا جس میں ایک چھیل چھبیلا سا نوجوان اپنے تانگے گھوڑے سمیت رہتا تھا۔ اس نے دیوار کے اندر سے دو تین اینٹیں نکال رکھی تھیں اور جب موج آتی تھی۔ یا جب اس نوجوان تانگے والے کو فرصت ہوتی تھی بڑی بیٹی اور ماں، دونوں اس سے ٹھٹھول اور چھیڑ چھاڑ کیا کرتی تھیں۔ دوسری بیٹی کا نام شکورن تھا۔ وہ بڑی خاموش سی تھی۔ اس کا ناک نقشہ بہت سادا تھا۔ مگر اس کے اندر ایک چھب تھی وہ زور سے نہیں ہنستی تھی۔ بہت نرمی سے مسکراتی تھی۔ میں اور وہ دونوں دوست ہو گئے۔ میں اکثر اس کے گھر جانے لگا۔ ایک دن اس نے مجھے اپنا ریشمی رومال دیا جو بہت دن تک میرے پاس رہا۔ پھر نہ جانے کہاں کھو گیا۔ کچھ دن بعد مجھے اس کے یہاں جانے سے گھبراہٹ ہونے لگی۔ میں جب جاتا تھا اس کی ماں میرے پاس بیٹھ جاتی تھی اور میری رانوں میں چٹکیاں لیتی تھی یہ بات میں نے شکورن سے نہیں کہی۔ مگر اس کے گھر جانا کم کر دیا۔ وہ ہمارے یہاں آنے لگی۔

میری والدہ کے جگادھری آجانے سے وہ دوسری بیوی والا قضیہ پھر کھڑا ہو گیا۔ میرے والد نے اس زمانے میں ایک دو باتیں ایسی کیں جن سے اس شبہ کو تقویت ملی۔ وہ مولوی آدمی، صوم و صلوٰۃ کے پابند، داڑھی رکھتے تھے۔ مگر انھوں نے اچانک داڑھی منڈوا دی۔

کسی نے کہا شراب بھی پینے لگے ہیں۔ کسی نے کہا حشمت کے گھر جاتے لگے ہیں وغیرہ وغیرہ۔ ان تمام باتوں کا ایک ہی نتیجہ نکلا۔ ایک روز میں نے دیکھا میرے ایک رشتہ کے بزرگ جو ایک طرح سے میرے دادا ہوتے تھے اپنے بیٹے سمیت آپہنچے۔ وہ میرے والد کے ماموں تھے جو بھی باتیں آپس میں ہوئی ہوں مگر والدہ ان کے ساتھ گھر چلی گئیں یعنی اپنے میکے اور میں پھر تنہا رہ گیا۔ والد سے خائف بھی ہو گیا تھا' اس لیے کہ والدہ کے کہنے سے میں نے چند بار ان کا پیچھا کیا تھا کہ وہ کہاں جاتے ہیں کیا کرتے ہیں یہ جاننے کے لیے اور یہ بات والد کو معلوم ہو گئی تھی۔

ہو سکتا ہے یہ محض میرے دل کا چور ہو ان کے ذہن میں ایسی کوئی بات ہی نہ ہو مگر وہ کسی ایسے کام میں ضرور مصروف تھے کہ میری طرف سے توجہ ہٹ گئی میں پھر من مانی کرنے لگا۔ کبھی اسکول جاتا تھا کبھی نہیں جاتا۔ ایک بار تنہا سگھ چلا گیا تھا۔ والد کو اس کی خبر بھی نہیں ہوئی۔ دادی مجھے دیکھ کر بہت خوش ہوئیں۔ نیا اناج آیا تھا اس نے مسور کی دال بنائی۔ مسور کی دال اور گرم گرم روٹی کھا کر مجھے ایسا لطف آیا کہ بہت بار قورما بریانی کھا کر نہیں آتا تھا۔ اس مزے کا ایک سبب شاید یہ تھا کہ میں بہت بھوکا تھا۔

جب میں سگھ بستی میں رہتا تھا اپنی گائیں چراتا تھا۔ اور ایک طرح سے کھیت مزدور کی زندگی گزار رہا تھا میرے ذہن میں یہی تھا کہ بس اب یہی میرا مستقبل ہے۔ میں اس رحمت کے لڑکوں سے جو گیدڑ کے کاٹنے سے پاگل ہو کر مر گیا تھا۔ ہل چلانا سیکھا کرتا تھا۔ اگر پھالی ذرا ٹیڑھی ہوتی تھی وہ میرے ہاتھ پہ بڑے زور سے پینی مارتے تھے۔ اپنی نہاد اور گرد و پیش کی وجہ سے میرے ذہن میں زندگی کا کوئی ارفع و اعلیٰ تصور نہیں تھا۔ میں آج جو زندہ ہوں یہ بھی محض اتفاق ہے۔ ورنہ اپنی طرف سے میں نے کبھی کوئی ایسی کوشش نہیں کی کہ زندہ رہوں۔ وہ نہر جس کے کنارے میں اپنی گائیں چرایا کرتا تھا۔ میں تیرتا ہوا اس کے بیچ پہنچ جاتا تھا۔ جبکہ میں بہت اچھا تیراک نہیں تھا۔ ان جنگلوں میں تنہا گھومتا پھرتا تھا جس میں بھیڑیے اور بکڑ بگھے تھے۔ جب سرکنڈے کا جنگل پھولتا تھا اور جھڑ بیریوں میں بیر آتے تھے جنگلی لکر دندے اپنی بہار پہ آتے تھے ان کے پھولوں میں

اتنی مہک ہوتی تھی۔ اس مہک کا پیچھا کرتے ہوئے میں کگروندوں کے جھاڑ تلاش کرتا پھرتا تھا۔ یہ سوچے بغیر کہ یہاں بہت سے خطرے ہیں۔ سکھر بستی کے کھیتوں میں بچے نگینے ڈھونڈا کرتے تھے۔ بوڑیہ کے مکانوں سے بہت قدیم تہذیب کا اندازہ ہوتا تھا۔ بوڑیہ اور جگادھری کے مکان، ان کی لکھوری اینٹوں کی سڑکیں اس قدامت کی نشانی تھیں جس کی تاریخ مجھے معلوم نہیں تھی۔ اس وقت اس بات کا احساس بھی نہیں تھا۔ علم البشر مجھے ہمیشہ برانگیخت کرتا تھا۔ بشر کا آغاز اس کا عروج اس کا زوال یہ سب مجھے جانے کہاں کھینچ لے جاتے ہیں۔ ابھی دو ایک سال ہوئے جب میں نے ایک خبر پڑھی۔ وہ سکھر کے بارے میں تھی۔ وہاں آثار قدیمہ کے محکمے نے کھدائی کی اور دو تین صدی قبل مسیح کے مکانات کے آثار ملے۔

وہ جو میں نے اوپر ذکر کیا میرا زندہ رہنا محض ایک اتفاق ہے اس سے متعلق ایک اور واقعہ مجھے اب تک یاد ہے۔ میں ابا کے ساتھ جگادھری آیا تھا۔ واپسی میں انھوں نے کسی سے کہہ کر مجھے تانگے میں بٹھا دیا۔ پلان یہ تھا کہ میں پہلے بوڑیہ گاؤں جاؤں۔ وہاں سے سکھر قریب ہے۔ بوڑیہ سے گھر چلا جاؤں۔ تانگے والے دونوں نوجوان لڑکے تھے۔ تانگے کا گھوڑا بہت سرکش تھا اور قابو میں نہیں آرہا تھا۔ شاید وہ گھوڑا انھوں نے نیا نیا خریدا تھا۔ اس تانگے میں آگے کی طرف دونوں تانگے والے اور ایک صاحب بیٹھے۔ پیچھے میں اور میرے ساتھ ایک موٹا آدمی۔ کوئی بوڑیہ کا مہاجن معلوم ہوتا تھا شہر سے نکلنے کے تھوڑی ہی دیر بعد گھوڑا بے قابو ہو کر اس تیزی سے بھاگا کہ روکنا مشکل ہو گیا۔ روکنے کے لیے جب اس نے راسیں کھینچیں تو راسیں ٹوٹ گئیں۔ اب گھوڑا تھا اور سڑک۔ سڑک پر ایک پلیا تھی تانگے کا پہیہ پوری طاقت کے ساتھ اس سے ٹکرایا۔ جب راسیں ٹوٹیں آگے جو صاحب بیٹھے تھے وہ کود گئے اور پتھروں کے ایک ڈھیر پر گرے۔ پلیا سے ٹکرانے کے بعد تانگہ الٹ گیا۔ پھر کیا ہوا مجھے نہیں معلوم۔ تھوڑی دیر کے بعد جب میرے حواس قائم ہوئے تو دیکھا آگے پیچھے کی دونوں گدیاں میرے نیچے ہیں۔ ایک گردن کے نیچے اور ایک چوتڑوں کے نیچے۔ مجھے ایک خراش بھی نہیں آئی تھی۔ مگر جو صاحب کودے تھے وہ لہولہان تھے۔ اور میرے برابر جو موٹا آدمی بیٹھا تھا۔ اسے بہت چوٹیں آئی تھیں۔ وہ بے ہوش تھا اور تانگے والے دونوں

لڑکے بری طرح زخمی ہو گئے تھے۔ ان کے ہاتھوں اور ماتھے سے خون بہہ رہا تھا۔ بہت لوگ اکٹھا ہو گئے۔ ایک آدمی نے مجھے اٹھایا۔ دیکھا مجھے کچھ نہیں ہوا۔ کہنے لگا "جا بے لونڈے تو بھاگ" اور دوسرے لوگوں کی دیکھ ریکھ میں لگ گئے۔

بوڑیہ کی یادوں میں تو ایسی کوئی خاص یاد نہیں سوائے رام کرشن کے گھر کے ــــ رام کرشن میرا ہم جماعت تھا اور دیوالی کے دنوں میں ہم اس کے گھر میں رام لیلا کا ڈرامہ کیا کرتے تھے۔ میں کیا بنتا تھا۔ مجھے بالکل یاد نہیں۔ رام کرشن کی ایک بہن تھی جس کے منہ پر چیچک کے بہت داغ تھے اتنے کہ اس کا شمار کم رو لڑکیوں میں ہو سکتا ہے مگر وہ درو پدی بنتی تھی۔ جگادھری مقابلتاً بڑا شہر تھا۔ یہ شہر برتنوں کے لیے بہت مشہور ہے۔ ہر دوسری گلی سے ٹھٹھیروں کے ہتھوڑوں اور دھونکنیوں کی آواز آتی رہتی تھی۔

میں سورج کنڈ سے جو پیسے ڈھونڈ کر لایا کرتا تھا۔ ان کے دہی بڑا کھایا کرتا تھا۔ شام کے وقت ایک دہی بڑے والا لکڑی کی بہت بڑی پرات میں دہی بڑے لے کر آتا تھا۔ جو بہت ہی نرم اور مزے دار ہوتے تھے۔ مجھے بہت بعد میں پتہ چلا کہ جگادھری برتنوں کے علاوہ دہی بڑوں کے لیے بھی مشہور ہے کمہاروں کا محلہ جہاں ہم بہت آغاز میں جا کر رہے تھے وہاں پڑوس کی ایک گلی کے ایک لڑکے سے میری ملاقات ہوگئی وہ تانگہ چلاتا تھا اور سگریٹ میں بھر کے چرس پیتا تھا۔ اس نے دو چار بار مجھے بھی دو چار کش دیئے۔ مگر چرس اچھی نہیں لگی مجھے اس میں بو بہت تھی۔

ایک بار جب میں اسکول سے آ رہا تھا راستے میں ایک مہاجن کے لڑکے کی بارات ملی۔ بہت بھیڑ تھی۔ میں بچ کر ایک طرف کھڑا ہو گیا۔ دولھا کے اوپر سے روپئے نچھاور کیے جا رہے تھے۔ چاندی کا ایک روپیہ میرے نزدیک آ کر گرا۔ میں نے اٹھالیا اور لا کر اماں کو دے دیا۔ عید قریب تھی۔ انھوں نے ہرے رنگ کی زری کا ایک ٹکڑا خریدا اس روپیہ سے اور میرے لیے صدری بنوا دی وہ صدری لٹھے کی شلوار کے ساتھ میں نے عید پر پہنی۔

والدہ کے میکے چلے جانے کے بعد سگھڑ، بوڑیہ، جگا دھری اور اس کے آس پاس کے باغوں کی آوارہ گردی سے میں اوبھ گیا۔ ابّا کے اور میرے درمیان بھی بظاہر کوئی قدر مشترک نہیں رہ گئی تھی۔ ایک روز میں نے جہاں ابّا پیسے رکھا کرتے تھے۔ وہاں سے چرائے اور جگا دھری کو ہمیشہ کے لیے خیرباد کہہ دیا۔

باب ۲

میں نے ایک زمانے میں اپنی منظوم سوانح لکھنے کا ارادہ کیا تھا۔ وہ خواہش تکمیل کو تو نہیں پہنچی مگر اس کے کچھ حصے ہو گئے تھے۔ آغاز یوں کیا تھا۔

اس جہانِ گُل و بلبل و زاغ میں
اتری ہند کے چھوٹے سے گاؤں میں
ایک کاتک کی ٹھٹھری ہوئی رات میں
شب کے پچھلے پہر تاروں کی چھاؤں میں
پھونس کے ایک چھپتر میں پیدا ہوا
حسبِ دستور کچھ دیر رویا کیا
اور پھر جیسے جی کو قرار آگیا
جیسے دار المحن سازگار آگیا

یہ پھونس کا چھپتر میری ننھیال ہے۔ وہ چھوٹی سی بستی جو چالیس پچاس گھروں پر مشتمل تھی آج بھی ہے مگر بڑھ پھیل گئی ہے۔ میں تو برسوں سے نہیں گیا۔ سنا ہے اب وہاں ریڈیو اسٹیشن اور ایک بہت بڑی اناج کی منڈی بن گئی ہے۔ اس بستی کا نام قلعہ پتھر گڑھ ہے۔ کچھ اسے گھسٹ پوری بھی کہتے ہیں۔ پتھر گڑھ اس لیے کہ بڑے بڑے پتھروں سے بنا ہوا یہاں ایک قلعہ ہے جسے نجیب الدولہ نے بنوایا تھا۔ گھسٹ پوری غالباً اس لیے کہلاتی ہے کہ جب نجیب الدولہ کو انگریزوں کے مقابلے کے بعد ہار ہوئی اور قلعہ خالی کرایا گیا تو متعلقین اور شاگرد پیشہ لوگوں نے قلعہ خالی کرنے سے انکار کر دیا۔ نتیجے میں انھیں گھسیٹ گھسیٹ کر قلعے سے نکالا گیا۔ اس کے باوجود بھی وہ یہاں سے نہیں گئے۔ قلعے کے باہری میدان میں آباد ہو گئے۔ یہ بستی قلعے کے سامنے آباد ہے۔ اس کے ایک سرے پر ایک

چھوٹی سی مسجد ہے جہاں میرے ماموں نماز پڑھایا کرتے تھے۔ ایک زمانے میں یہ قلعہ نظر بندی کے لیے بھی استعمال ہوتا تھا۔ ایک طرح کا CONCENTRATION CAMP تھا اب تو کم و بیش ناپید ہو گیا ہے۔ ایک قبیلہ تھا جسے روہیل کھنڈی میں بھانتو کہتے تھے۔ یہ آدی واسی قسم کے لوگ تھے اور پیشے سے زیادہ تر جرائم پیشہ تھے۔ ان کو ایک جگہ اکٹھا کرکے اس قلعے میں رکھا گیا تھا۔ جب کوئی کہیں جاتا تھا صدر دروازے پر اپنی حاضری لکھوا کر جاتا تھا۔ سلطانہ ڈاکو اسی قبیلے کا ایک فرد تھا۔ وہ بھی اس قلعے میں محصور تھا۔ اور جب اپنا گروہ بنا لیا تو قلعے کی دیوار پھاند کر بھاگ گیا تھا۔ لال ڈھانگ اس جگہ سے قریب ایک علاقہ ہے جہاں سے ہمالیہ کا جنگل شروع ہو جاتا ہے۔ وہ اس کی جائے پناہ تھی۔

میرے بچپن میں قلعہ بستی میں جب کوئی بیاہ شادی ہوتی تھی بھانتو اس میں شریک ہوتے تھے یہ نہیں معلوم اپنا حصہ لینے آتے تھے یا ان میں اور بستی کے لوگوں میں بھائی چارہ ہو گیا تھا۔ جتنی شادیاں اس زمانے کی یاد ہیں اس میں ان کی شرکت بھی یاد ہے۔ بعد کے زمانے میں سلطانہ ڈاکو کو پکڑے جانے کے بعد قلعہ خالی کر دیا گیا تھا اور انھیں منتشر کر دیا گیا تھا کہ پھر اکٹھا ہو کر لوٹ مار نہ کریں۔

جگادھری چھوڑنے کے بعد میں اسی بستی قلعے میں آیا تھا۔ جب جگادھری سے چلا تھا میرے ذہن میں نجیب آباد تک پہنچنے کا راستہ تھا۔ اتنا معلوم تھا کہ ایک شہر سہارنپور راستے میں پڑتا ہے اور وہاں سے نجیب آباد کے لیے دوسری گاڑی لینی پڑتی ہے۔

جگادھری سے ایک چھوٹی لائن عبداللہ پور (جمنا نگر) جاتی تھی۔ عبداللہ پور جنکشن تھا۔ میں نے سوچا عبداللہ پور سے نجیب آباد کا ٹکٹ لے کر کسی سے پوچھ لوں گا۔ اور سہارنپور پہنچ کر گاڑی بدل لوں گا۔ اور میں نے وہی کیا۔ نجیب آباد سے گھر کا راستہ مجھے معلوم تھا۔ نجیب آباد کے اسٹیشن پر اتر کر جب میں ماموں کے یہاں پہنچا۔ اماں سامنے آنگن میں ایک پیڑھے پر بیٹھی تھیں۔ مجھے دیکھ کر حیران بھی ہوئیں اور پریشان بھی۔

"محمد اختر تم؟" اماں مجھے ہمیشہ محمد اختر کہا کرتی تھیں میں نے انھیں بتا دیا۔ جگادھری سے بھاگ آیا ہوں اور واپس نہیں جاؤں گا۔ اماں کو میری عادت معلوم تھی۔

جب مجھے کوئی بات لگ جاتی ہے تو میں اپنا ارادہ نہیں بدلتا۔ انھوں نے ہاتھ پکڑ کر مجھے پاس بٹھا لیا اور سوچنے لگیں۔ سوچنا کیا پریشان ہوئی ہوں گی اب میرے بیٹے کا کیا ہوگا۔ سو اتن بہ تقدیر کے مستقبل تو میرے جیسے لوگوں کا ویسے بھی کچھ نہیں ہوتا۔ جہاں بیٹھ گئے وہی اپنی زمین ہے جہاں رات ہوگئی محلسرائے!

اگلے روز ماموں مجھے نجیب آباد کی سرور والی مسجد کے مدرسے میں داخل کر آئے۔ وہ خود بھی دینیات پڑھاتے تھے۔ میرے ماموں کا نام عبدالحمید تھا۔ وہ اوصاف حمیدہ کے مالک تھے۔ اور مجھ سے بڑی محبت کرتے تھے۔ میری والدہ کا خاندان آٹھ افراد پر مشتمل تھا۔ نانا، نانی، ماموں ممانی، تین خالائیں اور میری والدہ۔ اماں اپنے بھائی بہنوں میں سب سے بڑی تھیں۔ ان کا نام سلیمن تھا۔ ان سے چھوٹی بہن کا نام جمعرت (جمّو) ان سے چھوٹی حمیدن اور مجیدن تھیں۔ ممانی کا نام مجھے یاد نہیں۔

سرور والی مسجد میں داخلے کے بعد میرا پھر قرآن حفظ کرنے کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ ایک روز جو میں مدرسے سے واپس آیا دیکھا میری دلّی والی خالہ آئی ہوئی ہیں۔ جمّو (جمعرت) مجیدن اور میری والدہ، ان تینوں کی شادی راؤ کھیڑی میں ہوئی تھی۔ راؤ کھیڑی میری ددھیال ہے اور اب یہ بھی نجیب آباد ہی کا حصہ ہے۔ یہاں گھر کے افراد کے بارے میں تھوڑی سی تفصیل کی ضرورت ہے۔

میرے دادا کے انتقال کے بعد میرے والد بھی گھر چھوڑ کر سہارنپور چلے گئے تھے۔ اور وہاں کے کسی خیراتی ادارے میں تعلیم پاکر حافظ اور قاری ہو گئے تھے۔ چونکہ گھر کا سب سامان، اور اثاثہ جو دادا نے چھوڑا تھا اس پر ان کے دو بڑے بھائیوں نے قبضہ کر لیا تھا۔ اس لیے اپنے چھوٹے بھائی محمد یامین کو بھی اپنے ساتھ سہارنپور ہی لے گئے تھے اور تعلیم دلا کر انھیں حافظ قرآن بنا دیا تھا۔ میرے چچا محمد یامین ہی سے میری خالہ حمیدن کی شادی ہوئی تھی۔ اور وہ دلّی میں رہتے تھے۔ وہاں ایک اسکول میں پڑھاتے بھی تھے پنڈت کے کوچے میں ایک مسجد تھی وہاں امامت بھی کرتے تھے۔

چونکہ میرے چچا کو میرے والد ہی نے پڑھایا لکھایا اور اپنے پاس رکھا تھا اس لیے

وہ ان پر اپنا حق سمجھتے تھے۔ حمیدن خالہ کے بیان کے مطابق ابا نے میرے چچا کو لکھا تھا "اختر آوارہ ہو گیا ہے، اور گھر سے بھاگ کر قلعہ چلا گیا ہے۔ اسے اپنے پاس بلا لو۔" ابا کے اس حکم کی تعمیل میں میری خالہ مجھے لے جانے کے لیے آئی تھیں۔ آج حمیدن خالہ حیات نہیں میری والدہ اور جمّو خالہ بھی اللہ کو پیاری ہو چکی ہیں۔ مجیدن خالہ حیات ہیں۔ انھیں کے بڑے لڑکے یاسین سے میری چھوٹی بہن رحمت کی شادی ہوئی ہے۔ یہ دونوں بمبئی میں ہیں یاسین اور رحمت کو میں نے پندرہ بیس سال پہلے بمبئی ہی بلا لیا تھا اور اب تک یہیں ہیں۔ ان دونوں کے یہاں کوئی اولاد نہیں۔

باب ۴

میرا اگلا قدم دلی شہر تھا۔ یہ ۱۹۲۰ء کی بات ہے۔ دلی میں جہاں میں نے ابتدائی چار سال گزارے اس جگہ کا نام مؤیدالاسلام تھا۔ یہ ایک ریفارمیٹری اسکول اور یتیم خانہ تھا۔ یہ دریا گنج میں واقع تھا۔ اور غالباً آج بھی ہے۔ اب اسے بچوں کا گھر کہتے ہیں۔

سکھ مدرسہ جنگل تھا مگر مؤیدالاسلام عروس البلاد اور حکومت کے پایۂ تخت میں ایک قلعہ۔ یہ لال پتھروں سے بنی ہوئی ایک مضبوط اور بہت بلند عمارت تھی جس کو چھوتا ہوا ایک فیل قامت اور مضبوط لکڑی کا پھاٹک تھا جس میں ہر وقت ایک بڑا سا تالا پڑا رہتا تھا اور ایک چوکیدار پہرے پر رہتا تھا۔ اندر تو کوئی بھی جا سکتا تھا۔ مگر باہر جانے کے لیے خاص طور پر لڑکوں کے لیے مینجر کے پروانۂ راہ داری کی ضرورت تھی۔ پھاٹک پھر بھی نہیں کھلتا۔ پھاٹک میں بنی ہوئی بڑی سی کھڑکی کھلتی تھی۔ اور پھر بند ہو جاتی تھی۔

یہ جگہ ریفارمیٹری اس اعتبار سے تھی کہ جو لڑکے گھروں سے بھاگ جاتے تھے اور والدین کی شکایت پر پکڑے جاتے تھے۔ یا آوارہ گردی میں پکڑے جاتے تھے۔ کمشنر کے حکم سے پولس انھیں یہیں لے کر آتی تھی۔ اگر کوئی وارث آتا تو اطمینان ہونے کے بعد انھیں رخصت کر دیا جاتا تھا ورنہ لڑکا یہیں رہتا تھا۔ یہی مؤیدالاسلام اگلے چار سال کے لیے میری تقدیر بننے والا تھا۔

خالہ کے ساتھ دلی آنے کے بعد دو چار روز تو بڑی میری آؤ بھگت ہوئی۔ سویاں پکیں، حلوے بنے۔ چچا مجھے ہر جگہ ساتھ لیے پھرتے۔ اس اسکول میں بھی لے گئے جہاں وہ پڑھاتے تھے اور ہیڈ ماسٹر غلام رسول صاحب سے ملوایا۔ اس مسجد میں بھی لے گئے جہاں نماز پڑھاتے۔ یہ مسجد پنڈت کے کوچے میں تھی۔ پھر ایک دن مجھے ساتھ لیا اور پسر کی والوں سے ہوتے ہوئے، چاوڑی بازار سے گزر کر دریا گنج پہنچے اور مؤیدالاسلام

کے بڑے پھاٹک کے سامنے آکر کھڑے ہوگئے اور دروازہ کھٹکھٹایا۔ کھڑکی کھلی، اور مجھے اندر لے گئے۔ سامنے غلام رسول بیٹھے ہمارا انتظار کر رہے تھے۔ وہ مجھے منیجر کے پاس لے گئے۔ ان کا نام عطاء اللہ تھا۔ کچھ آہستہ آہستہ ان سے کہا۔ منیجر بزرگ آدمی تھے۔ آنکھیں بہت تیز تھیں۔ کمر ذرا جھکی ہوئی تھی۔ انھوں نے مجھے مسکرا کر دیکھا اور میں اگلے چار سال کے لیے مؤیدالاسلام کا ایک حصہ بن گیا۔ چچا مجھے اس طویل و عریض چار دیواری میں چھوڑ کر چلے گئے اور ہدایت کر گئے کوئی ضرورت ہو تو غلام رسول صاحب سے کہوں جب انھیں وقت ملے گا مجھے دیکھنے آجایا کریں گے۔

مؤیدالاسلام کے سکریٹری یا متولی خان بہادر یوسف پائی والے تھے۔ یہ ایک پنجابی برادری کے ایک متمول اور با اثر شخص تھے۔ پنجابی برادری کے لوگ زیادہ تر تجارت پیشہ اور سوداگر ہوتے ہیں۔ تحقیق نہیں مگر میرا خیال ہے مؤیدالاسلام کی یہ عمارت بھی پنجابی برادری کے کسی شخص یا بہت سے لوگوں نے مل کر بنائی ہوگی۔ یہ ایک کشادہ عمارت تھی۔ صدر دروازے سے داخل ہوں تو دائیں طرف باورچی خانہ اور اس سے ملے ہوئے غسل خانے اور بیت الخلاء تھے۔ سامنے کئی کمرے تھے جن میں سے ایک منیجر صاحب کا دفتر تھا اور ایک میں مؤیدالاسلام کے کاغذات اور کھاتے اور حساب کتاب کی کتابیں رکھی تھیں۔ ایک بے چھت کا کمرہ تھا۔ دائیں بائیں رہائش کے لیے کمرے بنائے گئے تھے۔ اگر اس عمارت کو دو منزلہ بنایا جاتا تو یہ بہت شاندار عمارت بنتی اور اس میں کالج بنایا جا سکتا تھا۔ ممکن ہے اس کے بانی کے ذہن میں ایسا ہی کوئی بڑا مقصد ہو مگر افسوس وہ مقصد پورا نہیں ہوا تھا اب صرف یہ ایک ایسی جگہ تھی جہاں ساٹھ ستر معذور اور کچھ تندرست لڑکے رہتے تھے جن کی کفالت مؤیدالاسلام کرتا تھا۔ معذور لڑکوں کو ذہنی یا جسمانی مریض کہا جا سکتا تھا۔ ان میں سے چند کا ذکر کرتا ہوں۔

ایک لڑکا احمد خاں تھا۔ وہ نسلاً پٹھان تھا۔ نہیں معلوم اپنی جائے پیدائش کی جگہ سے یہاں تک کیسے پہنچ گیا تھا۔ اس کا سر گنبد کی طرح تھا۔ آنکھیں اندر دھنسی ہوئی تھیں۔ جیسے ہاتھی کی آنکھیں ہوتی ہیں اور چلنے کا انداز بالکل گینڈے جیسا تھا۔ اس کی گردن اتنی موٹی

تھی کہ پیچھے دیکھنے کے لیے گردن گھمانا مشکل تھا۔ وہ گھوم کر دیکھتا تھا۔ لڑکے اسے عجیب الخلقت چیز سمجھ کر چھیڑتے رہتے تھے اس کا سر تک دیوار سے ٹکرا دیتے تھے۔ وہ جز بز ہو کر رہ جاتا تھا۔ اور ردِ عمل بالکل ایسا ہوتا تھا جیسے کسی حیوان کا ہو سکتا ہے۔

ایک لڑکا حاجی گل تھا۔ وہ بھی پٹھان تھا۔ اس کی ساخت بھی عجیب تھی۔ جسے لفظوں میں بیان کرنا مشکل ہے۔ مگر وہ احمد خاں کی طرح کند نہیں تھا۔ اور ہر وقت ہنستا رہتا تھا۔ وہ بھی آدمی کم مشین زیادہ تھا۔ اس کا استعمال زیادہ تر کھانے کی چیزیں چرانے کے لیے کیا جاتا تھا بعض حضرات دعوت کرتے تھے تو لڑکوں کو گھر بلانے کی جگہ مؤید الاسلام ہی میں کھانا بھجوا دیتے تھے۔ اور اس کھانے کو سپرنٹنڈنٹ کی نگرانی میں رکھا جاتا تھا۔ شنتر قسم کے لڑکے رات کو حاجی گل سے کہتے تھے بھوک لگی ہے جاؤ بریانی چرا لاؤ اور وہ چرا لاتا تھا۔ مختصر یہ کہ اس کو اس طرح کسی کام پر لگا دو کر دیتا تھا۔ ایک لمبی فہرست ہے معذور لڑکوں کی۔ ان میں ایک پگلی بھی تھی جس کا نام مجھے یاد نہیں۔

ایک لڑکا عبدالشکور تھا۔ وہ نابینا تھا۔ اسے ذہنی مریض کہنا چاہیے۔ وہ ایک کونے میں بیٹھا رہتا تھا۔ اس میں خصوصیت یہ تھی کہ وہ مؤید الاسلام کے ہر لڑکے کو پاؤں کی چاپ سے پہچانتا تھا۔ اگر کوئی لڑکا اس کے نزدیک آکر شی ای ای کی آواز نکالتا تھا تو وہ خوب چیختا چلاّتا تھا۔ اور چھیڑنے والا جب بھاگتا تھا تو وہ اسے پاؤں کی چاپ سے پہچان لیتا اور ایسا کبھی نہیں ہوا کہ اس نے کسی لڑکے کو پہچاننے میں غلطی کی ہو۔

غرض کہ مؤید الاسلام ریفارمیٹری بھی تھا۔ مریض خانہ بھی، یتیم خانہ بھی اور ایک باقاعدہ اسکول بھی۔ یہ ایک ایسا سرکاری طور پر منظور شدہ اسکول تھا جہاں آٹھویں جماعت تک باقاعدہ تعلیم دی جاتی تھی۔ اور شہر کے بھی کافی لڑکے پڑھنے آتے تھے۔

مختصر یہ کہ چچا مجھے مؤید الاسلام میں چھوڑ کر چلے گئے۔ چپراسی نے مجھے لے جا کر ایک کمرہ اور ایک پلنگ دکھایا اور کہا یہ تمہارا کمرہ ہے اور یہ تمہارا بستر۔ مؤید الاسلام جاتے وقت چچا نے راستے میں ایک دکان سے مجھے حلوا دلوایا تھا۔ پتے میں لپٹا ہوا۔ وہ حلوہ ابھی تک میرے ہاتھ میں تھا۔ جب چپراسی چلا گیا تو وہ حلوہ میں نے ایک طرف رکھ دیا۔ کھانے

کو جی نہیں چاہا میرا۔ کچھ لڑکے میرے پاس آئے اور مجھ سے بات کرنی چاہی مگر میں نے کسی سے بات نہیں کی۔ گرمیوں کا موسم تھا۔ لڑکے باہر دالان میں سوتے تھے سب اپنی اپنی چارپائی لے کر باہر چلے گئے۔ میں اندر ہی بیٹھا رہا۔ جیسے جیسے رات بڑھی لڑکے سو گئے۔ میں ایسے ہی بیٹھا رہا۔ نیند نہیں آئی۔ پھر جانے کیوں مجھے رونا آگیا۔ ایسی اپنی ذات میں تنہائی کی زندگی تو میں بچپن سے گزار رہا تھا۔ پندرہ سال پرانی عادت تھی مگر اس رات مجھے محسوس ہوا جیسے کسی نے میرے ساتھ چھل کیا ہے اور روتے روتے سو گیا۔

صبح بہت سویرے چپراسی نے جگا دیا۔ "اٹھو نماز کا وقت ہوگیا ہے" مؤید الاسلام کے عین سامنے ڈی اے وی ہائی اسکول تھا۔ اس کے پیچھے ایک چھوٹی سی مسجد تھی۔ جسے جنگل والی مسجد کہتے تھے۔ لڑکے وہاں نماز پڑھنے جاتے تھے۔

مؤید الاسلام میں مجھے چوتھی جماعت میں داخلہ ملا۔ وہ لکڑی کا چھت کو چومتا ہوا بڑا دروازہ میرے لیے واقعی ایک ایسا دروازہ ثابت ہوا جہاں سے میری زندگی کا سفر شروع ہو رہا تھا۔ یہاں مجھے دو تین استاد ایسے ملے جن کی محبت اور شفقت میں نہیں بھولتا۔ ایک عبدالصمد صاحب تھے انگریزی پڑھاتے تھے۔ اسکول کے ہیڈ ماسٹر بھی تھے انھوں نے میری ہمت افزائی کی۔ گورے چٹے۔ چھ فٹ سے نکلتے ہوئے بڑے حلیم الطبع انسان تھے۔ ایک بار چھٹیوں میں گھر گئے۔ ملتان کے رہنے والے تھے۔ چھٹیاں ختم ہوئیں تو عبدالصمد کی جگہ اُن کے والد آئے۔ بزرگ سفید ریش ہم سے مل کر رونے لگے، اور بتایا کہ صمد صاحب کا انتقال ہوگیا۔

ایک ماسٹر نعمت علی خاں تھے۔ اچھے تھے۔ شاعر بھی تھے۔ غزل کہتے تھے۔ جب انھیں پتہ چلا میں بھی کچھ لکھتا لکھاتا ہوں بڑے طنزیہ انداز میں پوچھا کرتے تھے۔ "ردیف قافیہ جانتا ہے کیا ہوتا ہے"۔ انھوں نے ردیف قافیے کی اتنی رٹ لگائی کہ میرے ذہن سے ردیف قافیے کی وقعت ختم ہوگئی۔

ایک ماسٹر عبدالواحد تھے۔ وہ احمدی فرقے سے تعلق رکھتے تھے۔ میری ذہنی تربیت میں ان کا بڑا ہاتھ ہے۔ وہ مجھ سے تقریریں لکھواتے تھے اور جلسوں میں بولنے کی

ترغیب دیتے تھے۔ میں شعر یا نثر جو بھی لکھتا تھا اسے بڑی توجہ سے سنتے تھے۔ یہ ان ہی کی ترغیب اور ہمت افزائی کا نتیجہ تھا کہ میں نے مؤیدالاسلام ہی میں ایک ناول لکھ ڈالا تھا۔ وہ کہاں گیا نہیں معلوم۔ غرض کہ یہ دو استاد عبدالصمد اور عبدالواحد تھے جنھوں نے میرا مستقبل ہموار کرنے یا اسے دریافت کرنے میں بڑی مدد کی۔ تھوڑے دن بعد عبدالواحد بھی مؤیدالاسلام چھوڑ گئے اور پھر کبھی ان سے ملاقات نہیں ہوئی۔

مؤیدالاسلام میں ایک قاری محمد الیاس تھے۔ امروہہ کے رہنے والے تھے۔ لڑکے ان سے بہت چڑتے تھے۔ ایک وجہ تو یہ کہ وہ ہاتھ میں ہر وقت بید لیے رہتے تھے اور بات بے بات لڑکوں کو پیٹتے تھے۔ دوسرے یہ کہ ان کے بارے میں مشہور تھا وہ امرد پرست ہیں، لڑکے ان کے خلاف اتنے تھے کہ ایک مرتبہ ایک لڑکے نے جب نماز پڑھنے کے لیے گئے، دھتورے کے بیج لاکر ان کے کھانے میں ملا دیے۔ وہ نیم پاگلوں کی حالت میں رات بھر مؤیدالاسلام میں چلّاتے پھرے۔ وہاں ایک بوڑھا چپراسی تھا۔ اس نے جانے کیا لاکر انھیں گھوٹ کر پلایا تب کہیں ٹھیک ہوئے۔

ایک قاری الیاس ہی کیا امرد پرستی اور اغلام۔ ان دنوں عام بیماری اور بدعت تھی میں مؤیدالاسلام میں بہت سے لڑکوں کو جانتا تھا جن میں کچھ فاعل تھے کچھ مفعول ادریس نام کا ایک لڑکا تھا۔ اس کا صحیح نام رات کا چوکیدار ہونا چاہیے۔ اس کی ماں چیلوں کے کوچے میں کسی جگہ کام کرتی تھی اور دن میں ایک بار اس سے ملنے آتی اور بہت سی چیزیں کھانے کے لیے لایا کرتی تھی وہ دونوں پاؤں سے معذور تھا۔ بیساکھیوں کے سہارے چلتا تھا۔ وہ رات کے قصے مجھے بہت سنایا کرتا تھا۔ اسے رات کو نیند نہیں آتی تھی۔ لڑکے کیا کر رہے ہیں سب دیکھتا رہتا تھا۔ گرمیوں میں لڑکے باہر دالان میں سوتے تھے۔

مؤیدالاسلام کیا یہ بدعت پورے معاشرے ہی میں تھی شبیر نام کا ایک لڑکا تھا۔ شہر سے پڑھنے آتا تھا۔ ایک مرتبہ اس کے باپ نے اسکول میں آکر بہت پیٹا۔ معلوم کرنے پر پتہ چلا وہ رات کو اپنے عاشق کے ساتھ گھر سے باہر رہا۔ شبیر اچھا خوبصورت اور شرمیلا

سالڑکا تھا۔ افسوس ہوا اس کے بارے میں جان کر۔ ایک اور لڑکا تھا۔ اس کا نام احمد تھا۔ وہ بھی شہر سے پڑھنے آتا تھا۔ عوض نام کا ایک شخص تھا اس کا عاشق۔ چیلوں کے کوچے میں رہتا تھا اور سانپ پکڑ کر بیچنے کا کام کرتا تھا۔ اس کا الٹا ہاتھ کٹا ہوا تھا۔ سنا ہے اسے سانپ نے کاٹ لیا تھا۔ زندگی بچانے کے لیے اسے ہاتھ کٹوانا پڑا تھا۔ وہ چھٹی کے بعد باہر احمد کا انتظار کرتا رہتا تھا۔ احمد میرے ساتھ پڑھتا تھا۔ میں نے سمجھایا ایسا کرنا بُری بات ہے۔ اور اس نے عوض سے ملنا کم کر دیا۔ عوض کو پتہ چل گیا۔ ایک روز جو میں باہر نکلا عوض نے مجھے پکڑ لیا۔ بہت گالیاں دیں اور میرے منہ پر زور سے تھپڑ مارا۔ مؤید الاسلام کے بعد اس طرح کے بہت سے لڑکوں سے میرا واسطہ پڑا جن کا ذکر میں آگے کروں گا۔

یہ جو کچھ میں ان صفحات میں درج کر رہا ہوں اسے سوانح کا نام نہیں دینا چاہیے۔ یادداشت سمجھیے۔ وہ بھی اس لیے قلندر کی سفر کے اختتام پر آدمی کو یاد تو رہے کیسے کیسے مقامات اور منزلوں سے گزرے ہیں۔ میں نے اپنا شمار ہمیشہ بے وقوف لوگوں میں کیا ہے جب کسی کام کا وقت اور موقعہ گزر جاتا ہے۔ مجھے اس وقت خیال آتا ہے کہ فلاں وقت کیا کرنا چاہیے تھا کیا نہیں کرنا چاہیے تھا۔

مؤید الاسلام ہی کی یادوں میں سے ایک یہ بھی ہے کہ وہاں ایک وبا پھیلی اور اوپر نیچے کئی لڑکے مر گئے۔ ان میں سے ایک میرے دوستوں کے حلقے میں تھا۔ وہ بھی پشاور کا رہنے والا تھا۔ اور ہم اسے خان کہہ کر بلاتے تھے۔ ایک روز اچانک خان کا انتقال ہو گیا۔ سب لڑکے دوسرے کمرے میں چلے گئے۔ مگر جانے کیوں میرے ذہن میں ایسا بیٹھا ہوا تھا کہ مُردے کو اکیلے نہیں چھوڑنا چاہیے۔ میں کمرہ چھوڑ کر نہیں گیا اور وہیں خان کے برابر پلنگ پر لیٹ کر اسے کہانیاں سناتا رہا۔

مؤید الاسلام ایک اچھا ادارہ ہوتے ہوئے بھی اور اتنے متمول اور دور تک دسترس رکھنے والے مربیوں کے باوجود ایک بھیک کا ہی ٹھیکرہ تھا۔ جب میں مؤید الاسلام میں داخل ہوا اس وقت صورتحال مختلف تھی۔ سرائے بیرم خاں میں ایک دستکاری اسکول تھا، جہاں بہت اچھا فرنیچر اور مکان کی زیبائش کی چیزیں بنانی سکھائی جاتی تھیں۔ مؤید الاسلام

سے آٹھ جماعت پاس کر کے لڑکے اس دستکاری اسکول میں بھی بھیجے جاتے تھے جہاں سے وہ اچھے دستکار ہو کر نکلتے تھے۔ مگر جانے کیوں وہ انتظام ختم کر دیا گیا۔ آٹھویں جماعت پاس کرنے کے بعد اگر لڑکے کو ہنر نہیں آتا تو محنت مزدوری کرنے یا بھیک مانگنے کے سوا دوسرا کوئی کام کر بھی نہیں سکتا۔

سگھڑ مدرسہ اور مؤیدالاسلام میں فرق صرف رہن سہن اور درجے کا تھا۔ سگھڑ مدرسہ کی دعوتوں میں چاول ملتے تھے اور مؤیدالاسلام کی دعوتوں کا مینو تاج محل ہوٹل کے مینو سے بھی اچھا تھا۔ سگھڑ مدرسہ کی دعوتیں کھیت مزدوروں اور کاشت کاروں کی دعوتیں تھیں۔ مویدالاسلام کی دعوتیں زیادہ تر دلی کے تاجروں اور سوداگروں کی دعوتیں جہاں خمیری روٹی، قورمہ، فیرنی، بریانی، زردہ، لال روٹی، باقرخانی اور تلیجے عام تھے۔ دعوتوں میں شرکت کا طریقہ سگھڑ مدرسے اور مؤیدالاسلام میں ایک ہی تھا۔ دو تین چپراسیوں کے ساتھ سب لڑکے لائن میں آگے پیچھے چلتے تھے۔ دعوتیں اکثر شام کو ہوتی تھیں۔ اور شہر میں کہیں بھی جانا ہو جامع مسجد کے چوک سے اکثر گزرنا ہوتا تھا۔ شام کو گزری کا بازار، کٹورے بجنے کی آوازیں ـــــ پھول والوں کی آوازیں اور جامع مسجد کی سیڑھیوں پر خورد و نوش کی سجی ہوئی دکانوں کے ساتھ ایک جھوجری آواز بھی سنائی دیتی تھی اس آواز کے مالک کا نام اشفاق تھا۔ وہ شاعر تھا اور اپنی غزلوں کی چار چار چھ چھ صفحے کی کتابیں چھاپ کر گا گا کر جامع مسجد کے چوک میں بیچا کرتا تھا۔ اس کا رنگ بہت گورا تھا اور سر کے بال سرخ۔ اچھے نکلے ہوئے قد کا آدمی تھا، اور اس سارے ماحول میں اس کی آواز بھی اچھی لگتی تھی۔ جانے کیوں ادھر سے گزرتے وقت کئی بار میرے ذہن میں خیال آیا ایسی شاعری تو میں بھی کر سکتا ہوں۔ اور میں نے شاعری شروع کر دی۔ ایک دو بار اشفاق سے بھی ملا۔ اچھا منہ کا آدمی تھا۔

اشفاق کی دیکھا دیکھی شاعری تو شروع کر دی، مگر پھر کن کن منزلوں سے گزرنا پڑا، اس بات کی وضاحت شاعری پر بات ہو گی تو تفصیل سے لکھوں گا۔ مؤیدالاسلام کے ذکر سے تو جان چھوٹے۔

مؤیدالاسلام سے متعلق میں نے جن ذہنی مریضوں کا ذکر کیا ہے وہ تو اس زندگی کا ایک حصہ ہے۔ وہاں کئی اور لڑکے تھے جیسے شیریں جان، عثمان بانی۔ یہ دونوں لڑکے حبشی تھے۔ شیریں جان تو ایسا ہی بلا سا تھا مگر عثمان بانی فٹ بال میں بڑی شہرت کا مالک تھا۔ وہ محمڈن اسپورٹنگ میں گول کیپر تھا۔ اسے میں نے ایک دو بار کھیلتے ہوئے دیکھا تھا۔ گیند پکڑنے کے لیے ایسے ہوا میں زقند بھرتا تھا جیسے انسان نہیں پرندہ تھا۔ اس وقت کا بڑا نامور کھلاڑی تھا۔ اس کے علاوہ اور کئی لڑکے تھے یاسین، نور محمد، خورشیدالاسلام، شبیر قریشی، اقبال وغیرہ وغیرہ مگر آگے چل کر سوا خورشیدالاسلام کے سب لاپتہ ہو گئے۔ خورشیدالاسلام علی گڑھ چلے گئے تھے۔ اور ایم۔اے، پی۔ایچ۔ڈی کرکے وہیں شعبہ اردو میں کام کرنے لگے تھے۔ انھوں نے کئی کتابیں بھی لکھیں۔ باقی لڑکوں کے لاپتہ ہونے کا سبب وہی تھا ادھ کچرا پن۔ آٹھویں جماعت پاس کرنے کے بعد سوا کسی گھر یا دفتر میں چپراسی گیری کرنے کے اور لڑکا کیا کر سکتا ہے۔

مجھے مؤیدالاسلام میں چوتھی جماعت میں داخلہ ملا۔ جب میں نے بوڑیہ اسکول چھوڑا تھا میں وہاں چوتھے ہی درجے میں پڑھتا تھا۔ ۲۰ء سے ۲۴ء تک چار سال ایسے نکل گئے کہ دن کب آیا کب نکل گیا۔ پتہ ہی نہیں چلا۔ سبب وہی میرے اساتذہ کی شفقت اور توجہ تھی۔ میں پڑھنے کے لحاظ سے بہت اچھا طالب علم نہیں تھا۔ نمبر فرسٹ کلاس اور سکینڈ کے درمیان آتے تھے مگر مطالعہ کرنے میں اور معلومات عامہ میں بہت ہوشیار تھا۔ بہت اچھا مقرر سمجھا جاتا تھا اور شاعری بھی گوارا کرتا تھا افسانے بھی لکھا کرتا۔

مؤیدالاسلام میں جب میرا آخری سال تھا مجھے نمونیہ ہو گیا۔ جامع مسجد کے نزدیک سرکاری اسپتال تھا۔ کنگ ایڈورڈ میموریل یا ملکہ وکٹوریہ اس وقت ذہن میں نہیں مؤیدالاسلام کے لڑکے علاج کے لیے وہیں بھیجے جاتے تھے۔ یہ خیراتی اسپتال تھا۔ جب نمونیہ ہوا مجھے بھی وہیں داخل کیا گیا۔

چچا مجھے دیکھنے کے لیے آئے تو انھیں اندیشہ ہوا میں مر نہ جاؤں۔ انھوں نے میری والدہ کو لکھا۔ وہ تو آگئیں مگر مجھ سے ملاقات نہیں ہوئی۔ سبب یہ تھا کہ چچا نے کبھی

میری والدہ کو یہ بات بتائی ہی نہیں کہ میں یتیم خانے میں رہتا ہوں۔ اس واقعے کی تھوڑی سی تفصیل یہ ہے:

سرکاری اسپتال میں داخل کرنے کے بعد لوگ جیسے بھول گئے تھے۔ چچا کبھی آجاتے تھے مؤیدالاسلام سے بھی کبھی کوئی چپراسی آجاتا تھا۔ میں اتفاق سے بہت سخت جان واقع ہوا ہوں۔ لوٹ پیٹ کر ٹھیک ہوگیا۔ اسپتال میں ایسا ہوا کہ میرے برابر جو دو مریض تھے ان میں سے ایک مرگیا۔ خیر اللہ کی مرضی ایک دن سبھی کو یہ دن دیکھنا ہے پھر اتفاق ایسا ہوا کہ اگلے روز دوسرا مریض بھی مرگیا۔ نرسوں کو فوراً اس کی موت کا علم نہیں ہوا۔ جو نرس دوا پلانے آئی اس نے توجہ نہیں دی۔ مرنے والے کا منہ کھلا تھا اس میں دوا انڈیل دی۔ پھر ایک دم اسے احساس ہوا وہ مرگیا ہے اس نے چپراسی یا وارڈ بوائے کو آواز دی اور کہا کہ لاش اتار کر نیچے فرش پر رکھ دے۔ وہ تو یہ کہہ کر چلی گئی۔ وارڈ بوائے آیا اس نے سوچا کون لاش کو اٹھانے کا تردد کرے۔ اس نے پلنگ کھڑا کر دیا۔ لاش دھڑ سے نیچے گری۔ یہ دیکھ کر میں ہڑبڑا گیا۔ کسی سے کچھ نہیں کہا۔ اٹھ کر اسپتال سے بھاگ کھڑا ہوا اور گرتا پڑتا نیاریوں کے محلے میں چچا کے یہاں پہنچا تب اماں کو اصل صورت حال کا پتہ چلا اور یہی بات میری خالہ اور اماں کے درمیان لڑائی کی بنیاد بن گئی۔ صلح صفائی کے باوجود دونوں میں کبھی میل نہیں ہوا۔

غالباً خان بہادر یوسف پائی والے اپنی ٹوپی میں کچھ مزید چمکتے پردں کا اضافہ کرنا چاہتے تھے۔ ایک روز لڑکوں کو حکم ملا فوراً تیار ہو جائیں اور نہا دھو کر باقاعدہ تیار ہونے کے بعد یونیفارم کا خاکی کوٹ بھی پہنیں اور جامع مسجد میں حاضری کو تیار ہو جائیں۔ وہاں پہنچے تو دیکھا بڑا پولس کا پہرہ ہے اور سرکاری عملے کے لوگ ادھر ادھر گشت لگا رہے ہیں۔ ہمیں ایک لائن میں کھڑا کر دیا گیا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کیا ہو رہا ہے۔ تھوڑی دیر کے بعد بھگدڑ سی مچی۔ معلوم ہوا وائسرائے بہادر لارڈ لن لتھگو تشریف لائے ہیں۔ نہایت خندہ پیشانی کے ساتھ انھوں نے ایک ایک لڑکے سے ہاتھ ملایا اور ہمیں رخصت کر دیا گیا۔ میں واپسی میں راستے بھر یہی سوچتا رہا لارڈ لن لتھگو کو اس ملاقات

کا کیا فائدہ ہوا۔ اور ہمیں کیا ملا۔ مگر یہ نہیں جانتا تھا ہر جگہ ایک تیسرا آدمی ہوتا ہے جسے بچولیا کہتے ہیں اور آخر میں ہر بات کا فائدہ اس بچولیے کو زیادہ ہوتا ہے اور کسی کو کم اور یہاں یوسف پائی والے خاں بہادر بچولیے تھے۔

۱۹۲۴ء میں میری مؤیدالاسلام کی زندگی ختم ہو گئی۔ وہاں سے انگریزی کے ساتھ آٹھویں جماعت پاس کر لی تھی۔ میرے پاس ایک ٹین کا صندوق تھا۔ جس کی ساخت ایسی تھی جیسے جسم پر آبلے پڑ جاتے ہیں۔ جب میں خالہ کے ساتھ دلّی جا رہا تھا اماں نے وہ صندوق میرے ساتھ کر دیا تھا۔ چچا نے وہی صندوق مؤیدالاسلام میں میرے پاس پہنچا دیا تھا جس روز مؤیدالاسلام چھوڑا وہی صندوق میرے سر پر تھا اور میں مستقبل کی تلاش میں دلّی کی سڑکوں پر سے گزر رہا تھا۔

باب ۵

مؤیدالاسلام چھوڑنے کے بعد میں پھر چچا کے یہاں گیا۔ وہ نیاریوں کے محلے میں ایک تنگ سی گلی میں رہتے تھے جہاں ارد گرد کے مکانوں میں ٹین کے صندوق بنانے کا کام ہوتا تھا۔ اور دن بھر ٹین کو ٹھوکنے پیٹنے کی آوازیں کانوں میں آتی رہتی تھیں۔ اس دوران میرے والد بھی دلّی آگئے تھے۔ یہ نہیں معلوم وہ خود آئے تھے۔ یا چچا نے انھیں بلایا تھا۔ مگر وہ چچا کے ساتھ نہیں رہتے تھے۔ کشن گنج کی کسی مسجد میں رہتے تھے اور وہیں پیش امام تھے۔ حجروں کی زندگی مجھے پسند نہیں اس لیے میں ان کے پاس نہیں گیا۔

چچا کا مکان بہت چھوٹا تھا۔ صرف ایک کمرے پر مشتمل کمرے سے ملی ہوئی ایک چھوٹی سی کوٹھری تھی۔ سامنے ایک چھوٹا سا صحن تھا جس میں ایک کونے میں چولہا رکھا تھا اور ایک طرف پاخانہ بنا ہوا تھا۔ گھر میں آدمی زیادہ نہیں تھے۔ میرے چچا، میری خالہ اور ان کا بیٹا عبدالسلام۔ چار سال پہلے جب میں دلّی آیا تھا۔ ان کے یہاں کوئی اولاد نہیں تھی۔ اب ایک لڑکا تھا۔ مؤیدالاسلام کی وسیع عمارت میں چار سال گزارنے کے بعد ایسی تنگ جگہ میں گھٹن محسوس ہوتی تھی۔ اس کے علاوہ میرے ذہن میں یہ بات بھی تھی امّاں اور خالہ میں اس بات پر کھنچاؤ پیدا ہو گیا تھا کہ انھوں نے مجھے یتیم خانے میں رکھا۔ اس لیے میں چچا کے یہاں نہیں رہنا چاہتا تھا۔ مگر میری خواہش اپنی جگہ اور صورتحال اپنی جگہ۔ اسی طرح کی مجبوریوں میں انسان جیتے ہیں، جیتے کیا ہیں "گزران" کرتے ہیں۔ صبح کی شام اور شام کی صبح کرتے ہیں۔ اسی صبح شام کے درمیان کہیں ایسے لمحے بھی آجاتے ہیں جن میں بہجت کی تلاش ہوتی ہے۔ خوشی کے بہانے ڈھونڈے جاتے ہیں اور زندگی کے ان لمحوں کو مختلف تسلّی بخش نام دے کر آدمی دن رات کے چکّر سے گزرتا رہتا ہے۔

ان میں تھوڑے لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جو زندگی کا مقصد جاننا چاہتے ہیں۔ کوئی مقصد دکھائی نہیں دیتا تو اسے مقصد دینا چاہتے ہیں۔ میرا شمار کن لوگوں میں ہو سکتا ہے نہیں کہہ سکتا۔ مگر میں بے چین رہتا تھا۔ میرا خون گرم اور آنکھیں جلتی رہتی تھیں جڑا ہوا بھی انسانوں کے اس طبقہ سے تھا جو پیٹ بھرنے کو زندگی سمجھتے تھے۔ والد کے ذہن میں میرا مستقبل ایک پیش امام یا اسکول ٹیچر سے زیادہ کچھ نہیں تھا۔ پنڈت کے کوچے میں ایک مسجد تھی۔ میرے والد کی طرح چچا وہاں کے امام تھے۔ مسجد کے اوپر ایک کمرہ تھا۔ فرصت کا وقت وہاں گزارتے تھے۔ کبھی کبھی میں بھی وہاں چلا جاتا تھا اور بے مقصد دلی کی خاک چھانتا پھرتا تھا۔ دیہات میں پیدا ہوا تھا، دیہات میں ہی بچپن کا بیشتر حصہ گزرا تھا۔ مثال سامنے کھیت مزدوروں یا کاشت کاروں کی تھی یا پھر مسجدوں میں امامت کرنے والے مولوی تھے یا اسکول کے استاد۔ خواب ایسے دیکھتا تھا جیسے بازوؤں میں پر نکل آئے ہیں۔ لوگ مجھے پکڑنے کی کوشش کر رہے ہیں اور میں اڑ کر کبھی اس ڈال پر کبھی اس ڈال پر۔ ذہن میں ایک ہی بات بیٹھی ہوئی تھی اڑنے کے لیے پر چاہئیں تو علم حاصل کرو۔ مگر کیسے وسائل کہاں ہیں؟

ایک روز فتح پوری مسجد کے سامنے سے گزر رہا تھا۔ دوسرے دروازہ پر دیکھا۔ "فتح پوری مسلم ہائی اسکول" لکھا ہوا ہے۔ میں تھوڑی دیر رُکا۔ پھر قدم آپ سے آپ اسکول کی طرف اٹھ گئے۔ سیڑھیاں چڑھ کر اوپر چلا گیا اور ہیڈ ماسٹر کے دفتر کے سامنے پہنچ گیا۔ دروازہ پر نام لکھا ہوا تھا "صوفی صغیر حسن" سیدھا دفتر میں چلا گیا۔ سامنے کرسی پر ایک درمیانی عمر کا شخص بیٹھا ہوا تھا۔ چہرے پر مٹھی بھر کالی داڑھی تھی۔ رنگ کھلتا ہوا گندمی تھا۔ وہ کچھ پڑھنے میں مصروف تھے۔ اپنے حال میں اس طرح بیٹھے ہوئے اچھے لگ رہے تھے۔ میں ابھی سوچ رہا تھا انھیں کیسے مخاطب کروں کہ انھوں نے نظر اٹھا کر دیکھا اور مجھے سامنے کھڑا دیکھ کر پوچھا:

"کون چاہیے تمھیں؟ کس سے ملنا ہے؟"

میں نے اپنا نام بتایا "میں اختر الایمان ہوں..... اور....."

انھوں نے ٹوکا "نام تو غلط ہے تمھارا۔"

"مگر کام غلط نہیں کرتا۔" میرے منہ سے نکل گیا۔ وہ سن کر مسکرائے۔ میں نے مدعا بتایا اور پورا اتا پتہ دیا۔۔۔ مؤیدالاسلام سے مڈل پاس کیا ہے۔ چار سال وہیں گزارے ہیں۔ آگے پڑھنا چاہتا ہوں مگر میرے پاس وسائل نہیں۔"

"وہ سوچنے لگے۔ اتنے میں ایک استاد وہاں آگئے۔ نام غوث محمد تھا صوفی صاحب نے ان سے میرا مدعا بیان کیا۔ انھوں نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔" یہ آپ کے لیے کیا مشکل کام ہے؟ فیس معاف کر دیجیے۔"

"اور کھیل کی فیس؟ وہ تو معاف نہیں ہو سکتی۔"

"وہ کتنی ہے ساڑھے تین آنے۔" پھر مجھ سے پوچھا "کیوں بھئی دے سکتے ہو ساڑھے تین آنے؟"

میں سوچنے لگا۔ غوث صاحب نے لقمہ دیا" دو تین ٹیوشن کر لینا مشکل حل ہو جائے گی" اور واقعی مشکل حل ہوگئی۔ میں ابا کے پاس گیا اور داخلے کے لیے پیسے مانگے۔ انھوں نے بادل ناخواستہ دے دیے۔ میں نے تین چار ٹیوشن کرلیں اور گاڑی چل پڑی۔

چاندنی چوک میں فخرالدین نام کے ایک صاحب تھے۔ میاں بیوی دونوں ڈاکٹر تھے ان کے لڑکے محمود کو پڑھانا تھا۔ وہ ٹیوشن تو نہیں ملی مگر محمود سے میری دوستی ہوگئی اور بہت دن قائم رہی۔ جب وقت ملتا میں اس کے پاس چلا جاتا تھا۔ محمود کی والدہ بہت ہی خلیق عورت تھیں۔ مجھ سے بہت محبت سے ملتی تھیں۔ اسکول کے بعد میں اپنی بھاگ دوڑ میں مبتلا ہوگیا۔ ایک دن اچانک معلوم ہوا کہ محمود کا انتقال ہوگیا۔ اس کا مسکراتا ہوا خوبصورت چہرہ آج تک میرے ذہن میں ہے۔

فتح پوری اسکول کی زندگی میرے لیے بہت مصروف اور مشکل بھری زندگی تھی۔ میرے پاس کئی ٹیوشن تھیں۔ ایک کشن گنج میں تو دوسری پھاٹک حبش خاں میں۔ تیسری نیاریوں کے محلے میں تو چوتھی کہیں اور۔ دن بھر شہر کے ایک کنارے سے دوسرے کنارے تک دوڑتا رہتا تھا۔ سردیاں تو ٹھیک تھیں مگر گرمیوں میں چوٹی سے ایڑی تک پسینے میں شرابور

رہتا تھا۔ اس کے علاوہ والی بال کی ٹیم کا کپتان تھا۔ فٹ بال ٹیم کے پہلے گیارہ لڑکوں میں تھا۔ اور ان کے علاوہ اسٹوڈینٹس فیڈریشن کے لیے کام کرتا تھا۔ اگر وقت مل جاتا تھا تو کمپنی باغ میں جاکر ورزش کرتا تھا۔

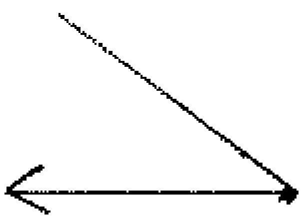
فتح پوری میں عبدالواحد صاحب کا بدل غوث صاحب مل گئے تھے۔ میری ذہنی تربیت میں ان کا بڑا حصہ ہے۔ وہ پانی پت کے رہنے والے تھے۔ میرے پڑھنے لکھنے کو بہت بڑھاوا دیتے تھے۔ جہاں جہاں اسکولوں میں، شہر میں اور شہر سے باہر تحریری مقابلے ہوتے تھے مجھے وہاں لے جاتے تھے انھوں نے میرے لیے اسکول میگزین نکالا اور مجھے اس کا ایڈیٹر بنایا۔ مؤیدالاسلام میں جو شعر گوئی کا سلسلہ شروع ہوا تھا اسے بھی بڑھاوا دیا۔ اب میرا رجحان غزل سے ہٹ کر نظم کی طرف ہو گیا تھا۔ اسکول میگزین میں میری ایک نظم چھپی جس کا عنوان "گورِ غریباں" تھا۔ اساتذہ اور لڑکوں نے اسے بہت پسند کیا۔ اور مجھے بہت داد ملی۔ نظم کیا تھی میرے ذہن میں نہیں مگر ایک طرح "گرے" کی ایلیجی سے متاثر تھی۔ میں نے ان ہی دنوں طباطبائی کا اردو ترجمہ پڑھا تھا۔

فتحپوری اسکول میں داخلے کے بعد میں نے چچا کا گھر چھوڑ دیا تھا۔ اور ایک کمرہ کرایہ پر لے کر گلی چابک سواروں میں اٹھ آیا تھا۔ فتحپوری مسجد کے آس پاس بہت سے چھوٹے بڑے ہوٹل تھے۔ ان ہی میں ایک پشاوری ہوٹل تھا۔ یہاں دو پیسے کی تندوری روٹی ملتی تھی۔ میں دو روٹیاں اور دو پیسے کا سالن لیتا تھا۔ اور دوپہر کا کھانا وہیں کھاتا تھا۔ شام کا کچھ کھانا نہیں تھا۔ جو جہاں مل گیا کھا لیا نہیں ملا تو نہیں کھایا۔

جب میرا اسکول کا آخری سال تھا۔ اچانک کسی بات پر انتظامیہ کمیٹی اور اساتذہ میں اختلاف ہو گیا۔ جھگڑے کی نوعیت اس وقت میرے ذہن میں نہیں غالباً اساتذہ کی تنخواہ بڑھانے کا معاملہ تھا۔ اس سے ملتی جلتی کوئی اور بات جس کا تعلق اساتذہ کی بہتری سے تھا۔ اختلاف اتنا بڑھا کہ ہڑتال تک نوبت پہنچ گئی۔ لڑکوں نے استادوں کا ساتھ دیا۔ خان بہادر رشید احمد بندوق والے انتظامیہ کے صدر یا سکریٹری تھے۔ لڑکوں نے ان کے اور دوسرے ممبروں کے خلاف جلوس نکالے۔ میں پیش پیش تھا۔ خوب بڑھ بڑھ

کر زوردار تقریریں کیں۔ جب کسی طرح فیصلہ نہ ہوسکا تو طے پایا معاملہ اسٹوڈینٹس فیڈریشن کے سپرد کر دینا چاہیے۔ مقیم فاروقی فیڈریشن کے سکریٹری تھے۔ فاروقی سنٹ سٹیون کالج کے طالب علم تھے۔ اتفاق سے رشید بندوق والے کا پوتا بھی سنٹ سٹیون میں پڑھتا تھا اور مقیم فاروقی کا ہم جماعت اور دوست تھا۔ مزید اتفاق یہ ہوا کہ فیڈریشن نے فیصلہ اساتذہ کے خلاف اور انتظامیہ کے حق میں دے دیا۔ لڑکوں نے نتیجہ یہ نکالا کہ فیڈریشن کے سکریٹری نے رشید بندوق والے سے دوستی نبھائی ہے اور حاجی رشید بندوق والے کے حق میں فیصلہ دیا ہے۔ بڑا بلوہ ہوا۔ موافق اور مخالف پارٹیوں میں "تو تو" "میں میں" ہوئی نورالعارفین میرے ایک دوست سوشلسٹ پارٹی کے ممبر تھے۔ میں اور وہ مل کر فیڈریشن کے دفتر گئے اور مقیم فاروقی سے خوب جھگڑا کیا۔ وہ اپنی صفائی دیتے رہے مگر ہم نے نہیں مانا۔ اس کے بعد میں نے فیڈریشن چھوڑ دی۔ کچھ دن بعد میٹرک کا نتیجہ بھی نکل آیا۔ میں پاس بھی ہو گیا تھا۔ میں نے اسکول کی ذراعی پارٹی میں اساتذہ کا شکریہ ادا کیا۔ سب سے رخصت ہوتے وقت میں واقعی رنجیدہ تھا خاص طور پر غوث صاحب اور صوفی صغیر حسن۔ ان ہی میں ایک دادا ابا بھی تھے، نام کیا تھا مجھے یاد نہیں۔ اقتصادیات پڑھاتے تھے۔ وہ بہت زیادہ ضعیف تھے۔ کلاس میں لڑکے شرارت کرتے تھے اور وہ انھیں مارنے کے لیے بڑھتے تھے تو لڑکے بھاگ جاتے تھے اور وہ انھیں پکڑ نہیں سکتے۔ وہ بید ہاتھ میں لیے پیچھے پیچھے اور لڑکا آگے آگے۔ یہ تماشا تقریباً روز ہی ہوتا تھا۔ میں نے اقتصادیات چھوڑ دی تو انھوں نے بہت سمجھایا مگر میں نے ان کی بات نہیں مانی۔ مجھے حساب وکتاب والا کام ہی نہیں کرنا تھا۔

فتحپوری اسکول سے رخصت ہوتے وقت صوفی صغیر حسن نے جو سرٹیفکیٹ مجھے دیا اس کی نقل یہ ہے۔ سرٹیفکیٹ انگریزی میں تھا۔ اس کا اردو ترجمہ یوں ہے:



اسکول سرٹیفکیٹ

۱۰/۶/۱۹۳۷

محمد صغیر حسن

ایم اے (تاریخ، اقتصادیات)

ہیڈ ماسٹر

فتحپوری مسلم ہائی اسکول

دہلی

محمد اختر الایمان ابن فتح محمد نے اس اسکول سے میٹرک کا امتحان اس سال پاس کیا ہے۔ اور اچھے سکینڈ کلاس نمبر حاصل کیے ہیں۔ یہ اسکول کے ہونہار لڑکوں میں تھا۔ بہت اچھے اخلاق اور عادات کا لڑکا ہے۔ ذہنی اور جسمانی دونوں طرح سے بہت صحت مند ہے۔ بہت اچھا خوش بیان مقرر ہونا اس کی دماغی صلاحیت کا ثبوت ہے۔ یہ فٹ بال کی الیون کا ممبر بھی ہے۔ یہ اس کی جسمانی صلاحیت کی دلیل ہے۔ بد قسمتی سے یہ غریب ہے۔ اسکول میں اس کی فیس معاف تھی۔ کالج یا یونیورسٹی جہاں یہ آگے پڑھنا چاہتا ہے اگر وہاں اسے خاطر خواہ مدد نہ ملی تو اس کا ترقی کرنا مشکل ہے۔ میں بڑے زور دار الفاظ میں اس کی سفارش کرتا ہوں۔

محمد صغیر حسن

دلی میں اینگلو عربک کالج مسلمانوں کی ایک مشہور درسگاہ تھی۔ یہ قدیم دلی مدرسہ کا ایک نیا رخ ہے۔ اس کا پرنسپل ایک انگریز تھا ——————— نتیجہ آنے کے بعد وہ سرٹیفکیٹ لے کر میں ان کے پاس چلا گیا۔ انھوں نے مجھے داخلہ دے دیا ——————— اور میں اینگلو عربک کالج کا طالب علم بن گیا۔ بعد میں اس کا نام دلی کالج ہوا اور پھر ذاکر حسین کالج۔

باب (۶)

لال پتھر سے بنی ہوئی اجمیری دروازہ کی عمارت نئی دلی اور پرانی دلی کے درمیان حد فاصل ہے۔ اس کے عین سامنے سڑک کے دوسری طرف لال رنگ کی ایک بڑی سی عمارت ہے اسی کا نام اینگلو عربک ہائی اسکول ہے یہ قدیم دلی مدرسہ کی نئی شکل ہے جس کی پیداوار اردو ادب کے بہت سے مشاہیر ہیں۔ جن میں ڈپٹی نذیر احمد بھی شامل ہیں۔ یہ دلی مدرسہ وہی ہے جہاں غالب کو بطور استاد کے بلایا گیا تھا۔ انگریز پرنسپل ان کو لینے کے لیے دروازہ پر نہیں آیا تو وہ الٹے پاؤں لوٹ گئے تھے۔

اسی عمارت کے احاطہ میں اضافہ ایک نئی عمارت کا ہے۔ جو اینگلو عربک کالج کہلاتی ہے۔ اس کا پرنسپل بھی ایک انگریز تھا۔ نام البرٹ واکر تھا۔ میں صوفی صغیر کا سرٹیفکیٹ لے کر ان کے پاس گیا۔ انھوں نے پڑھا، کچھ اِدھر اُدھر کے سوالات کیے۔ میری آدھی فیس معاف کرنے کا وعدہ کیا اور مجھے پہلے سال میں داخلہ دے دیا۔

کالج کی زندگی ایک سانحہ سے شروع ہوئی۔ سعید نام کا ایک لڑکا اسکول میں میرا ہم جماعت تھا۔ صدر بازار میں رہتا تھا۔ اس کا تعلق جس برادری سے تھا وہ چمڑے والے کہلاتے تھے۔ دلی کا صدر بازار ان کا مرکز تھا۔ ادھر اسلم نام کا بھی میرا ایک شاگرد تھا۔ جسے میں ٹیوشن پڑھاتا تھا۔ وہ ٹیوشن میں نے چھوڑنے کا ارادہ کر لیا تھا۔ سوچا ادھر جاؤں گا تو سعید سے بھی مل لوں گا۔ آگے اس کا ارادہ کیا ہے وہ بھی معلوم ہو جائے گا۔

سعید کے گھر گیا وہاں دو لڑکے اور تھے۔ میں ان دونوں کو جانتا تھا۔ ہمارے ہی اسکول میں تھے۔ ایک سعید کا چچازاد بھائی تھا اشرف۔ دوسرے کا نام یعقوب تھا۔ سب خوش تھے۔ پاس ہو گئے تھے۔ طے ہوا دن ساتھ گزارا جائے۔ مختلف پروگرام بنے کہیں باہر چل کر کھانا کھائیں۔ پک نِک پہ جائیں یا کوئی فلم دیکھیں آخر میں جمنا پر جاکر

نہانے کا پروگرام بنا۔

ہم نے جمنا پر جاکر کپڑے اتار کر کنارہ پر رکھ دیے۔ جب پانی کم ہوتا تھا۔ جمنا دو تین حصّوں میں بٹ جاتی تھی۔ کہیں پانی، کہیں ریت۔

لوگ پُل کے نیچے نہاتے تھے اور ریت پر کھیلتے تھے۔ مجھے تیرنا آتا تھا۔ ان تینوں کو نہیں آتا تھا۔ میں نے پانی میں اتر کر غوطہ مار کر ہاتھ پانی سے باہر نکال کر انھیں بتایا، کہاں کتنا پانی ہے۔ کنارہ پر خوانچہ والے بیٹھے رہتے ہیں۔ سعید کچھ کھانے کے لیے ایک خوانچہ والے کے پاس کچھ خریدنے چلا گیا۔ پل کے نیچے کچھ فاصلے پر کچھ لڑکے مچھلی پکڑ رہے تھے۔ میں تیر کر ان کے پاس چلا گیا۔ اچانک جو نظر پڑی دیکھا یعقوب اور اشرف میرے پیچھے آ رہے تھے۔ میں چلاّیا آگے مت بڑھنا بہت پانی ہے مگر انھوں نے نہیں سُنا اور دیکھتے ہی دیکھتے گہرے پانی میں غائب ہو گئے۔

میں گھبرا کر واپس آیا اور سعید کو بتایا جو ابھی تک خوانچہ والے کے پاس بیٹھا تھا۔ وہ رونے لگا۔ جو لوگ نہا رہے تھے میں نے چلاّ کر انھیں بتایا دو لڑکے پانی میں ڈوب گئے۔ ایک دو تیراک پانی میں کودے بھی مگر یعقوب اور اشرف کا پتہ نہیں چلا۔ سعید نے پولس کی مدد لی اور اپنے گھر فون کیا دیکھتے ہی دیکھتے جمنا پر سوداگر برادری کے لوگوں کی بھیڑ لگ گئی۔ تیراک چھوڑے گئے۔ بجرے پانی میں اتارے گئے۔ رات بھر تلاش جاری رہی۔ مگر ان دونوں کی لاشیں نہیں ملیں۔ پولس نے میرا بیان لیا۔ جو واقعہ تھا میں نے بتایا۔ رات پریشانی میں گزری۔ اگلے روز صبح کو دونوں لاشیں ابھر کر اوپر آ گئیں۔ میں نے دیکھا کہ ان کے چہرے کا گوشت مچھلیوں نے کھا لیا تھا۔ اس کے بعد میں نے مچھلی کھانی چھوڑ دی اور کم و بیش اب تک وہی حال ہے۔

گلی چابک سواران فتحپوری اسکول سے نزدیک تھی۔ کالج سے دور ہو گئی۔ میں کوئی ایسی جگہ تلاش کرنے لگا جو کالج سے نزدیک ہو۔ ایک دوست نے بتایا کہ بارہ دری شیر افگن خاں میں ایک جگہ ہے۔ مکان کے مالک حاجی شمن کا مٹھائی کا کاروبار تھا۔ بلیماران میں ان کی مٹھائی کی بہت بڑی دکان تھی اور بہت مشہور تھی۔ میرے والد خالی وقت میں ان

کی دکان کا کھاتا لکھتے تھے۔ فجر کی نماز سے فارغ ہوکر دکان پر آجاتے تھے۔ اور ظہر کے وقت تک رہتے تھے۔ میں نے ابا سے کہا اور بارہ دری والی جگہ مجھے مل گئی۔

یہ مکان ایک چھوٹی سی گلی میں تھا۔ ادھر اُدھر اور بہت سی پتلی پتلی گلیاں تھیں۔ چاروں طرف سے دن بھر چاندی کے ورق کوٹنے کی آوازیں آتی رہتی تھیں۔ غالباً ہر گھر کی بیٹھک میں ایک کارخانہ تھا۔ تھوڑے دن تو مجھے ان آوازوں سے الجھن ہوئی پھر عادت ہوگئی اور کبھی جب کارخانے بند ہوتے تھے اور ورق کوٹنے کی آوازیں نہیں آتی تھیں تو ایک کمی کا احساس ہوتا تھا۔

یہ مکان بہت بڑا نہیں تھا۔ باہر کی طرف دو بیٹھکیں تھیں۔ ہر بیٹھک سے ملا ہوا اندر ایک ایک گھر تھا۔ ان دونوں گھروں کے اوپر ایک ایک منزل اور تھی۔ اوپر کی ایک منزل میں دلی کے جوتے والوں کا ایک خاندان رہتا تھا۔ اور دوسری میں رحمٰن صاحب اور ان کے بیوی بچے۔ ان کا بہت بڑا کنبہ معلوم ہوتا تھا۔ مہمان اور عزیز اکثر آتے جاتے رہتے تھے۔ نیچے کے ایک گھر میں بہار کے کچھ لوگ تھے کسی فرقہ وارانہ فساد میں لٹ پٹ کر آئے تھے۔ دوسرا گھر میرے تصرف میں تھا۔ اس سے ملی ہوئی بیٹھک بھی میرے پاس تھی۔ دوسری بیٹھک رحمٰن صاحب کے پاس تھی۔ اس کو انھوں نے اپنا دفتر بنا رکھا تھا۔ رحمٰن صاحب پیشے سے نقشہ نویس تھے۔ عمارتوں کے نقشے بناتے تھے۔

اس گھر کے ایک سرے پر لکڑی کی ایک ٹال تھی۔ دوسری طرف دو کائستھ خاندان رہتے تھے۔ میری بیٹھک کے بالکل برابر والے گھر میں جو صاحب تھے وہ کسی اسکول میں ہیڈ ماسٹر تھے۔ بزرگ آدمی تھے۔ نہایت ہنس مکھ اور خلیق۔ ان کا بڑے سے چھوٹا لڑکا منّو میرا ہم عمر تھا۔ ہندو کالج میں پڑھتا تھا۔ مجھ سے اس کی اور پورے گھر بھر کی بڑی دوستی اور بہت ملنا جلنا ہوگیا تھا۔ اور وہ تعلقات آج تک ویسے ہی ہیں۔ دوسرے گھر میں جو خاندان تھا وہ بڑا صاحب فہم اور علم کا قدر دان تھا۔ اس گھر کا بڑا لڑکا کاسری سیریواستو فلموں میں کیمرہ مین تھا۔ ان سے چھوٹا اسکول میں پڑھتا تھا۔ اس کا نام مدھو سودن تھا۔ اس خاندان سے بھی میرے مراسم ویسے ہی ہیں جیسے اس وقت تھے۔

مدھو سودن کو کہانیاں لکھنے کا شوق تھا۔ بہت زمانے بعد اس کی کہانیوں کا ایک مجموعہ "صبح سے پہلے" چھپا تھا۔ مدھو سودن نے فلموں کے لیے بھی کہانیاں لکھیں اور فلمیں بنائیں
آس پاس کی گلیوں میں اور دو تین لڑکے تھے۔ شام کشن نگم، جے گوپال اور پارسی ان سے کبھی آج تک ویسے ہی ملنا جلنا ہے۔

بیٹھک کے عین سامنے ایک مسجد تھی۔ مُلّا جی کا نام مجھے یاد نہیں رہا۔ ان کی اونگھتی ہوئی آنکھیں ابھی تک یاد ہیں۔ مسجد سے ملا ہوا ایک کمرہ تھا۔ اس میں جو صاحب رہتے تھے وہ کسی کارخانہ میں کام کرتے تھے۔ ان کے ساتھ ایک لڑکا ضرور رہتا تھا۔ گلی میں آتے جاتے ان سے دعا سلام ہو جاتی تھی۔ ایک روز رحمان صاحب نے بتایا ان کو لڑکوں کا شوق ہے۔ جو لڑکا ان کے پاس رہتا تھا وہ ان کا "لونڈا" ہے۔ رحمٰن صاحب خود بڑے رنگین مزاج آدمی تھے۔ بیٹھک میں اپنے دوستوں کے ساتھ دھماچوکڑی مچایا کرتے تھے۔ تھوڑا پینے پلانے کا شغل بھی ہوتا تھا۔

اس گلی میں ایک اور کرایہ دار تھا اس کا نام "الو" تھا وہ اس علاقے کا غنڈہ تھا۔ اور جیب کترا مشہور تھا۔ دکھانے کے لیے پان بیڑی کی دکان کھول رکھی تھی۔ جب میرے پاس کوئی آتا تھا اور ضرورت ہوتی تھی تو ٹھنڈے کی بوتلیں اسی کے یہاں سے آیا کرتی تھیں۔ اکثر مجھ سے پیسے بھی نہیں لیتا تھا۔ مجھ پر مہربانی کا سبب یہ تھا کہ میں تعلیم بالغاں کے مرکز میں کام کرتا تھا۔ اس مرکز کا تعلق اینگلو عربک کالج سے تھا۔ جامعہ ملیہ کے اساتذہ بھی اس میں دلچسپی لیتے تھے۔ کبھی کبھی کالج میں ڈاکٹر ذاکر حسین اور مولوی شفیق الرحمٰن بھی آیا کرتے تھے اور اس سلسلے میں مشورہ دیتے تھے۔ میں شام کو کالج کے مرکز میں بھی پڑھاتا تھا۔ اور بارہ دری شیر افگن خاں کی ایک مسجد میں بھی اسکول کھول رکھا تھا جہاں عشاء کی نماز کے بعد بڑی عمر کے لوگوں کو پڑھاتا تھا۔ الو میری اس بات سے بہت خوش تھا۔

"ماسٹر جی ہم تو بے پڑھے ہی رہ گئے۔ بری صحبت نے الٹے رستے پر ڈال دیا۔ اب تو دیکھو پولس بھی سڑک پر پیدل نہیں چلنے دیتی۔ سائیکل پہ آتا جاتا ہوں۔" میں نے ہنس کے کہا "تب تو ہاتھ کی صفائی دکھانے کا موقع نہیں ملتا ہوگا۔"

"اللہ بڑا کارساز ہے" ہنس کے بولا۔ "سال کے سال خواجہ غریب نواز کے عرس میں اجمیر شریف جاتا ہوں۔ سال بھر کا خرچ نکل آتا ہے۔"

"الو بھائی پان بیڑی کا کام کیا بُرا ہے۔ یہ سب چھوڑ ہی دو نا۔"

"بس جی وہ اللہ ہی چھڑائے گا تو چھوٹے گا۔"

بارہ دری شیر افگن خاں سے ملی ہوئی گلی پیپل مہادیو تھی۔ گلی سے نکل کر سامنے قاضی کا حوض تھا۔ وہاں سے سڑک سیدھی اجمیری دروازہ کو جاتی تھی۔ اس کے سامنے اینگلو عربک کالج تھا۔

ٹیوشن میں اب بھی پڑھاتا تھا مگر لڑکوں کے گھر نہیں جاتا تھا۔ اپنے یہاں بلا لیا کرتا تھا۔ پنجابی برادری اور چاندی والوں کے لڑکے اکثر خوش شکل ہوتے ہیں۔ ایک روز سامنے والے کارخانہ دار صاحب مجھ پر بہت مہربان ہوئے۔ نہایت بے تکلفی سے کہنے لگے۔ ماسٹر جی میں اپنا لونڈا خوشی سے آپ کو دیتا ہوں میرے پاس بہت دن ہوگئے اسے۔ یہ سن کر تھوڑی دیر ان کی صورت دیکھتا رہا۔ پھر رسان سے کہا انھیں میرے بارے میں کچھ غلط فہمی ہوتی ہے۔

"کیا بات کرتے ہو" انھوں نے بدک کر کہا "تمہارے پاس تو اتنی پیاری پیاری صورتوں کے لڑکے آتے ہیں۔"

مجھے ان کی بات سن کر رنج تو ہوا مگر میں نے ہنسی میں ٹال دیا اور کہا "آپ نے حق شفقہ کا اتنا خیال رکھا میں بہت شکر گزار ہوں مگر جن لڑکوں کی آپ بات کر رہے ہیں وہ تو میرے بچوں کی طرح ہیں میں انھیں پڑھاتا ہوں۔"

میرے سنجیدہ اور نرم لہجے کا شاید ان پر کچھ اثر ہوا اور بغیر کچھ کہے چلے گئے۔

رحمٰن صاحب اور ان کے گھر کے لوگوں میں بہت کٹرپن نہیں تھا۔ گھر کی عورتیں پردہ بھی کوئی خاص نہیں کرتی تھیں۔ ایک روز کہنے لگے ان کی ایک عزیزہ انگریزی پڑھنا چاہتی ہے میں پڑھا دیا کروں میں نے کہا میں تو گھروں پر جاکر نہیں پڑھاتا۔ انھوں نے کہا وہ یہیں آتی ہیں اکثر۔ آپ کے یہاں پڑھ لیں گی۔ یا آپ اوپر جاکر پڑھا دیجیے۔ "نیچے ٹھیک رہے گا" میں نے کہا اور اس طرح ایک روز کے بعد ان کی ایک عزیزہ میرے پاس آنے لگی۔ نام

کیا تھا مجھے نہیں معلوم گھر کے لوگ چھنو کہتے تھے اور پڑھائی کا سلسلہ شروع ہو گیا۔
جیسے جیسے وقت گزرا چھنو کے انداز سے ایسا محسوس ہونے لگا۔ جیسے وہ وقت گزارنے
آتی ہے۔

اس کے پاس بالشت بھر کا ایک چمڑے کا ٹکڑا تھا۔ پڑھتی کم تھی اس سے زیادہ کھیلتی
رہتی تھی جب تک وہ رہتی تھی میری طبیعت بہت مکدر رہتی تھی۔ ایسا محسوس ہوتا تھا
جیسے وہ نہاتی نہیں یا بہت کم نہاتی ہے کپڑے بھی روز نہیں بدلتی ان سے پسینہ کی بو آتی
رہتی تھی۔ یہ پوچھنا بھی اچھا نہیں لگتا تھا وہ روز نہاتی ہے یا نہیں۔ بو بھی کچھ زیادہ ہی تھی
اس کے پسینہ میں۔ پڑھتے وقت بھی جو بتاؤ دھیان سے نہیں سنتی تھی۔ ٹال مٹول کرتی تھی۔
ایک روز میں نے بگڑ کر پوچھا اس چمڑے کے ٹکڑے سے کیوں کھیلتی رہتی ہو ہر وقت
کیا ہے یہ؟

اس نے چمڑے کے ٹکڑے کے دونوں سرے کو پکڑ کر کھینچا۔ اس کے بیچ میں سلائی
کی ہوئی تھی۔ کھل کر ایسا ہو گیا جیسے اندامِ نہانی ہوتی ہے۔ میں بالکل گم ہو گیا۔ اس کی طرف
احمق کی طرح دیکھنے لگا۔ وہ دوپٹے کے پلو میں منہ دبا کر ہنسنے لگی۔ باہر سے ایک آواز آئی
"ہم بھی آ جائیں"۔ میں نے پلٹ کر دیکھا ایک بیس بائیس سال کی جوان عورت میرے سامنے
کھڑی تھی۔ بڑی بڑی خوبصورت آنکھیں۔ چہرہ آنکھوں میں کھبنے والا۔

"قیصر آپا" چھنو نے تعارف کرایا۔ وہ شرمائی لجائی نہیں۔ کوئی بناوٹ بھی دکھائی نہیں
دی۔ جو میں دیکھ رہا تھا۔ مجھے اچھا لگ رہا تھا۔ کہنے لگی چھنو آپ کی بہت تعریف کرتی ہے۔
"میں آپ کی تعریف کروں گا برابر ہو جائیں گے" میں نے کہا۔
وہ مسکرائی۔ پھر میرے بارے میں باتیں کرنے لگی۔ آپ کالج میں پڑھتے ہیں۔ یہاں
اکیلے رہتے ہیں۔ وغیرہ وغیرہ اور یہ سرسری ملاقات طول کھینچ گئی۔ مجھے لڑکیوں کا کوئی خاص تجربہ
نہیں تھا۔ لگاوٹ کی باتیں کیسے کرتے ہیں۔ وہ بھی نہیں معلوم تھیں۔ کچھ دن بعد ایسا ہوا چھنو
کے آنے کے تھوڑی دیر بعد وہ بھی آ جاتی تھی۔ اور بیٹھی رہتی تھی۔ میں نے کہا میں چھنو
کو پڑھاتا ہوں آپ مجھ کو پڑھا دیا کیجیے۔ وہ ہنسنے لگی۔ "کیا پڑھو گے" اور اس طرح پڑھنا

وڑھتا بیٹھے کھاتے لگ جاتا ہم ادھر ادھر کی باتیں کرنے لگتے۔ ایک دو دن بعد ایسا ہوا ابھی چھٹو نہیں آئی تھی۔ قیصر آگئی۔ میں نے معذرت کے انداز میں کہا" معلوم نہیں کہنا ٹھیک ہے یا نہیں مگر تم مجھے اچھی لگتی ہو۔"

اس نے اس بات کا بُرا نہیں مانا۔ جیسے جیسے ملاقات بڑھی چھٹو پس منظر میں چلی گئی میں نے اپنی پڑھائی کا بہانہ کر کے اسے بلانا بند کر دیا۔ مگر قیصر آتی رہی اور یہ پسندیدگی آہستہ آہستہ قربت میں بدل گئی۔ اس سے پہلے میں کسی لڑکی کے اتنا قریب نہیں آیا تھا۔ ہم دن دن بھر گھر سے نہیں نکلتے تھے۔ بس باتیں کرتے تھے۔ کیا باتیں کرتے تھے یہ بتانا مشکل ہے۔ لڑکا لڑکی جنھیں ایک دوسرے سے تعلق خاطر ہو اگر ان کی گفتگو نقل کی جائے یا ریکارڈ کر کے سنی جائے تو سو فیصد لایعنی اور بے معنی ہو گی۔ یہ بے معنی پن ہی ان باتوں کا حسن ہے۔ قیصر کا نہیں معلوم اپنی کہہ سکتا ہوں۔ ان دنوں میرا اس کے سوا اور کوئی موضوع نہیں تھا۔

قیصر شادی شدہ ہے یہ مجھے شروع میں نہیں معلوم تھا۔ اس کا شوہر سے اختلاف ہو گیا تھا کسی بات پر۔ دلی میں اس کی دو بہنیں تھیں۔ ایک رحمٰن صاحب کی بیوی اور دوسری بہن کا شوہر ڈاکٹر تھا۔ زیادہ تر اس بہن کے یہاں رہتی تھی جس کا شوہر ڈاکٹر تھا۔

یہ معلوم ہونے کے بعد بھی کہ وہ شادی شدہ ہے اور شوہر سے خفا ہو کر آئی ہے کبھی یہ جاننے کی کوشش نہیں کی کہ شوہر سے کس بات پر اختلاف ہو گیا۔ میں دل کے کاروبار میں ایسا کھو گیا۔ پڑھنا لکھنا سب بھول گیا۔ کالج صرف حاضری لگوانے جاتا تھا۔ ایک دن روز کی زندگی میں اچانک خلل آگیا۔ قیصر نہیں آئی آنا کیا وہ تو ان دنوں رہتی بھی رحمٰن صاحب کے یہاں تھی۔ پوچھا تو معلوم ہوا دوسری بہن کے یہاں گئی ہے۔ ایک دن دو دن میں بہت اضطراب میں تھا وہ کئی دن بعد آئی۔ ضرورت سے زیادہ چپ تھی۔

"کیا بات ہے کچھ بتا کر بھی نہیں گئیں" اس بات کا اس نے جواب نہیں دیا۔ ٹھہرے انداز میں کہا" واپس جانا ہے۔" "واپس" میں سوچ میں پڑ گیا۔" سو چو مت جانا ہی ہے۔ ایسی صورت پیدا ہو گئی ہے۔ تم مجھے چھوڑ آؤ گے؟"

اگلے روز قیصر کے ساتھ میں شام کی گاڑی سے روانہ ہو گیا۔ ایک رات کا سفر تھا میں

نے اپنے بارے میں کچھ نہیں کہا۔ نہ اس سے پوچھا۔ میں تو بے سوچے سمجھے اس آگ میں کود پڑا تھا۔ جلنا لازمی تھا۔

قیصر کا مکان کوٹھی نما تھا۔ سسرال کے لوگ متمول معلوم ہوتے تھے۔ مہمانوں کے لیے باہر بنگلہ نما بیٹھک تھی۔ مجھے اس میں ٹھہرایا۔ ایک ملازم کھانے کے وقت کھانا لے آیا گھر کے کسی آدمی سے میری ملاقات نہیں ہوئی۔ رات کو قیصر باہر آئی۔ ہم ڈیوڑھی میں کھڑے باتیں کر رہے تھے۔ باتیں کیا۔ وہ کہہ رہی تھی میں سن رہا تھا۔

وہ دلی آئے گی۔ مجھ سے ملے گی میں اسے یاد رہوں گا وغیرہ وغیرہ۔ اگلے روز میں واپس آگیا۔ ایک ملازم میرے ساتھ آیا اور گاڑی میں سوار کرا دیا۔ آتے وقت قیصر سے ملاقات نہیں ہوئی۔

واپس دلی آیا۔ گھر بڑا سونا سونا سا لگ رہا تھا۔ ستو ملنے آیا۔ اس نے بتایا کہ وہ لوگ سبھو جلہ پہاڑی جا رہے ہیں۔ یہ گھر خالی کر دیا۔ مدھوسودن کے بڑے بھائی لاہور کی کسی فلم میں سے متعلق تھے۔ وہ ان سے ملنے لاہور چلا گیا۔ پھر پہلے سال کا امتحان شروع ہوگیا۔ پڑھا وڑھا کوئی خاص نہیں تھا مگر پاس ہوگیا۔ میں اماں سے ملنے گھر چلا گیا۔

باب (۷)

میرے والد کا نام فتح محمد ہے۔ تاریخ پیدائش ۱۲ جنوری ۱۸۹۵ء وہ حافظ قرآن تھے۔ اس نسبت سے لوگ "حافظ جی" کہہ کر بلاتے تھے۔ جائے پیدائش راؤ کھیڑی ضلع بجنور، اتر پردیش دادا کا نام بالے راؤ تھا۔ غالباً اقبال نام ہوگا جو بگڑ کر بالے ہوگیا یا شاید گھر کے لوگ پیار سے بالے کہتے ہوں گے۔ ان کا کپڑے کا کاروبار تھا۔ پوڑی گڑھوال میں کپڑے کی دکان تھی۔ ان کے انتقال کے وقت میرے والد بہت کم عمر تھے۔

میرے والد کے تین اور بھائی تھے۔ دو ان سے بڑے ایک چھوٹا۔ دو بہنیں تھیں بہنوں میں سے ایک کا نام حکیمن تھا۔ دوسری کا مجھے معلوم نہیں۔ حکیمن کی شادی ایک گاؤں ملک پور میں ہوئی تھی۔ ان کے شوہر کھیتی کرتے تھے۔ دوسری پھوپھی لاہور میں تھیں۔ ان کے شوہر اسکول ٹیچر تھے۔ ایک بار ان سے ملاقات ہوئی۔ پھوپھی سے کبھی نہیں ملا۔

والد کے بھائیوں میں سب سے بڑے کا نام مولا بخش تھا۔ ان سے چھوٹے کا نام بھولی بخش۔ سب سے چھوٹے کا نام محمد یامین تھا۔ دادا کے انتقال کے بعد دکان گھر زمین جو بھی تھوڑا بہت تھا۔ دونوں بڑے بھائیوں نے آپس میں بانٹ لیا۔ میرے والد گھر چھوڑ کر سہارنپور چلے گئے۔ اور کسی نیم خیراتی، مذہبی ادارے میں تعلیم حاصل کرکے مولوی ہوگئے اور اور امامت کا پیشہ اختیار کرلیا۔ کچھ مدت کے بعد اپنے چھوٹے بھائی یامین کو بھی اپنے پاس بلالیا۔ جو تعلیم خود حاصل کی تھی۔ وہی انھیں بھی دلوائی اور انھوں نے بھی وہی پیشہ اختیار کرلیا جو میرے والد کا تھا۔

میری والدہ کا نام سلیمن تھا۔ وہ اپنی بہن بھائیوں میں سب سے بڑی تھیں۔ ان سے چھوٹا ایک بھائی اور تین بہنیں تھیں۔ بھائی کا نام عبدالحمید تھا۔ بہنوں میں سے ایک کا نام جنتو تھا۔ دوسری کا حمیدن اور تیسری کا نام مجیدن تھا۔

میں اپنے بہن بھائیوں میں سب سے بڑا ہوں۔ مجھ سے چھوٹی چار بہنیں اور ایک بھائی ہے بہنوں کا نام اختری، فاطمہ، حشمت اور رحمت ہے اور بھائی کا نام محمد یعقوب۔ والد جب ہریانہ چھوڑ کر دلی آئے تو بڑے بھائیوں سے ملنے راؤ کھیڑی بھی گئے۔ اس تجدید ملاقات کا نتیجہ یہ نکلا کہ میرے بڑے تایا مولا بخش نے اپنے بڑے بیٹے بشیر کے لیے میری چھوٹی بہن اختری کا رشتہ مانگا۔ اس رشتہ کی ظاہری شکل تو یہ تھی کہ ٹوٹے ہوئے تعلقات جُڑ جائیں۔ اصل وجہ یہ تھی کہ بشیر کی شادی بہت پہلے ہو چکی تھی۔ اور گھر کے لوگوں نے مل کر پہلی بیوی کو دور کے کسی گاؤں میں بیچ دیا تھا۔ اس حرکت سے یہ خاندان بدنام ہو گیا تھا۔ اور بشیر کو آس پاس کے گاؤں اور برادری میں دوسری شادی کے لیے لڑکی نہیں مل رہی تھی۔ میرے والد کو یا تو اس بات کا علم نہیں تھا اور اگر تھا تو تایا نے اپنی اس حرکت کا کوئی جواز پیش کیا ہو گا یا اپنی غلطی کا اعتراف کیا ہو گا۔ مختصر یہ کہ اختری کی شادی بشیر سے ہو گئی۔ اس محبت کو مزید استوار کرنے کے لیے تایا نے اپنی زمین میں سے ایک ایک گھر کی جگہ میرے والد اور چچا کو بھی دے دی۔ اور ان دونوں نے وہاں مکان بنوا لیے۔ اس کے بعد اماں مستقل راؤ کھیڑی میں رہنے لگیں۔

اماں راؤ کھیڑی میں رہنے لگیں تو وہاں میرا آنا جانا بھی شروع ہو گیا۔ ان دنوں میں اسکول ہی میں تھا۔ والدہ کو میری شادی کی فکر لاحق ہو گئی تھی۔ اس بات پر میرے ان کے درمیان رسہ کشی ہو رہی تھی۔ وہ کہیں نہ کہیں میرے رشتہ کی بات چلاتی تھیں۔ میں کسی نہ کسی ذریعے سے لڑکی کے گھر کہلا بھیجتا تھا "شادی نہیں کروں گا"۔ جب یہ آنکھ مچولی لمبی ہو گئی تو میرے ایک خالو اور رشتہ کے ایک نانا نے آکر بہت ڈانٹا۔ کہنے لگے تم اسی طرح کرتے رہو گے تو تمہاری دوسری بہنوں کی شادی کہیں نہیں ہو گی۔ میں نے ان سے کوئی بحث نہیں کی اور واپس دلی آ گیا۔ ایف۔ اے۔ کے دوسرے سال میں داخلہ لینے کے بعد گھر آیا تو معلوم ہوا میری شادی طے کر دی گئی ہے۔

میں بہت سٹپٹایا۔ اماں سے کہا انھیں ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔ ابھی میری تعلیم پوری نہیں ہوئی۔ میں اس لڑکی کو کہاں سے کھلاؤں گا۔ کہاں رکھوں گا۔ انھوں نے میری اس

بات کو سنجیدگی سے نہیں لیا۔ ہنس کر کہنے لگیں۔ اس کی فکر مت کرو۔ وہ ہمارے پاس رہے گی۔ میں نے انھیں سمجھانے کی بہت کوشش کی زور دے کر کہا مجھے ہمیشہ گاؤں میں نہیں رہنا۔ وہ لڑکی جو میری بیوی بنے نہ صرف یہ کہ مجھے پسند ہو اس کا پڑھا لکھا ہونا بھی ضروری ہے۔ "تم پڑھا لینا" ان کا جواب تھا۔ اور میں ہی کہاں پڑھی ہوں۔ تمہارے ابا تو مولوی ہیں۔ مختصر یہ کہ کوئی منطق ان پر کارگر نہیں ہوئی۔ اسی اثنا میں ایک روز رات کو خالہ کے گھر سے واپس آرہا تھا کہ اندھیرے میں ٹھوکر کھا کر گرا۔ اور میرا بایاں ہاتھ ٹوٹ گیا۔ رات بھر درد میں مبتلا رہا۔ دن بھی اسی طرح گزر گیا۔ برابر کے قصبہ جلال آباد میں نتھو نام کا ایک ہڈی بٹھانے والا تھا۔ شام کو اس کے پاس گیا۔ اندھیرا ہو گیا تھا۔ اس نے اگلے روز دن میں آنے کو کہا۔ میں نے اصرار کیا۔ اس نے ہڈی بٹھا کر پلاسٹر چڑھا دیا۔

والد ابھی دلی ہی میں تھے اور آنے والے تھے میں ان سے ڈرتا بہت تھا۔ میں کہیں بیٹھا ہوں اور وہ آجائیں تو میں اٹھ کر چلا جاتا تھا۔ بچپن میں ان کے ظلم کی کوئی ایسی داستان نہیں جو میں بیان کرسکوں۔ سوا اس کے جب پڑھاتے تھے تو مارتے بہت تھے۔ جو میں بالکل پسند نہیں کرتا تھا۔ مگر اس کے خلاف احتجاج کبھی نہیں کیا تھا۔ شاید انھوں نے اسی طرح پڑھا ہو گا۔ ان کا استاد مارتا بہت ہو گا۔ ایک دفعہ کا واقعہ ہے میں پڑھ رہا تھا اور وہ پڑھا رہے تھے۔ یہ ان دنوں کی بات ہے جب ہم کمباسی میں رہتے تھے۔ میں بہت چھوٹا تھا۔ انھوں نے مجھے مارنے کے لیے مجھ پر ہاتھ اٹھایا تو میں پڑھنا چھوڑ اٹھ کر بھاگ گیا۔ انھوں نے میرا پیچھا کیا مجھے پکڑ لیا اور بہت مارا۔

مجھے یہ یاد نہیں انھوں نے بچپن میں کبھی مجھ پر اپنا پیار ظاہر کیا ہو سوا ایک مرتبہ کے۔ ان دنوں ہم گھر میں مٹی کے برتن استعمال کرتے تھے۔ پکانے کے لیے مٹی کی ہنڈیا کھانے کیلئے مٹی کی رکابی، پانی کے لیے مٹی کے گھڑے اور مٹی کے لوٹے۔ ایک بار میرے ہاتھ سے ایک لوٹا ٹوٹ گیا۔ میں اتنا خوفزدہ ہوا۔ ڈر کے مارے منہ لپیٹ کر لیٹ گیا۔ ابا گھر میں آئے تو میں دکھائی نہیں دیا۔ اماں سے پوچھا۔ انھوں نے بتایا ڈر کے مارے منہ لپیٹے پڑا ہے۔ انھوں نے آکر مجھے اٹھایا اور پیار کیا۔

اس خانہ بدوشانہ زندگی کے تحت جو ہم گزارتے رہے تھے اماں اکثر میکے چلی جاتی تھیں میں ابا کے پاس رہتا تھا مجھے وہ اس لیے جانے نہیں دیتے تھے میری پڑھائی کا حرج نہ ہو رہتا میں ضرور تھا ان کے پاس مگر ہمارے درمیان ہمیشہ ایک فاصلہ رہا جس کا نتیجہ یہ ہوا میں اپنے اندر سمٹ گیا۔ باغوں اور کھیتوں میں گھومتا رہتا تھا۔ پیڑ پودے ہریالی، تالاب، جھیلیں، بہتا ہوا پانی ان سب کو دیکھ کر مجھے بہت مسرت ہوتی تھی۔ مختصر یہ کہ وہ ڈر آج تک اپنی جگہ پر تھا۔ میں اب کالج میں پہنچ گیا تھا۔ وہ کبھی اب مجھ سے ویسا برتاؤ نہیں کرتے تھے۔ مگر میرے ان کے درمیان ایک غیریت تھی۔ گو مجھے اس کی توقع نہیں تھی۔ پھر بھی میں سوچتا تھا۔ ابا دلّی سے آئیں گے اور معلوم ہوگا کہ میرا ہاتھ ٹوٹ گیا تو شادی کی تاریخ بڑھ جائے مگر ایسا نہیں ہوا۔ ابا آئے اور یہ جاننے کے باوجود کہ میرا ہاتھ ٹوٹ گیا ہے شادی کی تیاری میں لگ گئے۔ میرے اندر شادی کے خلاف بغاوت سی پیدا ہوگئی تھی۔ مگر میں کچھ نہیں کر سکا۔ شادی کے دن ہاتھ کا پلاسٹر نکال دیا گیا مگر ہاتھ ابھی تک سوجا ہوا تھا اس پر پٹی باندھ دی گئی۔

جس گاؤں میں شادی ہوئی وہ راکھیڑی سے تھوڑے فاصلہ پر تھا۔ اس کا نام کھائی کھیڑی تھا۔ اس گاؤں میں جاٹوں اور مسلمانوں کی ملی جلی آبادی تھی۔ اور سب ایک دوسرے کے ایسے کاموں میں شامل ہوتے تھے۔ میں دولھا بن کر وہاں پہنچا تو حویلی میں مہمانوں اور لڑکیوں کی بھیڑ تھی۔ ایک تو شادی کی کوئی خوشی نہیں تھی، دوسرے ہاتھ میں تکلیف۔ میں ذہنی طور پر اتنا غیر حاضر رہا یاد ہی نہیں شادی میں کیا رسمیں ہوئیں کیا نہیں ہوئیں۔ بیوی کو لے کر گھر واپس پہنچا تو کسی پرانی رسم کے سبب اسے گود میں اٹھا کر اندر لے جانا تھا۔ وہ رسم بھی میری ایک تائی نے پوری کی جن کا قد چھ فٹ سے نکلتا ہوا تھا۔ ہندوستان کی شادیوں کا جائزہ لیا جائے تو شاید ہی اتنی بے مزہ بے رنگ شادی کوئی دوسری نکلے۔ جو میری تھی۔

باہر مہمانوں کی بھیڑ تھی میں آکر ان ہی میں بیٹھ گیا۔ رات کو کمرہ میں دیر سے گیا دیکھا وہ لڑکی جو میری بیوی بن کر آئی ہے۔ سو رہی ہے۔ اپنے ہاتھ کے سبب میں کسی طرح کی

پیش قدمی کے قابل ہی نہیں تھا۔ تھوڑی دیر بیٹھا رہا۔ پھر میں بھی سو گیا۔ صبح کو جب یہ بات میرے تایا کے لڑکوں کو معلوم ہوئی تو انھوں نے بہت چھیڑا۔ "تم بھی کیا ہو بابو جی" وہ سب مجھے بابو جی کہتے تھے:

"وہ سوئی نہیں تھی بہانہ کر رہی تھی۔ پہلی رات سو کھی گزار دی تم نے!"

اگلے روز رسم کے مطابق دلھن کو واپس میکے جانا تھا۔ سب نے کہا تم بھی جاؤ اور دلھن کو واپس لے کر آؤ۔ میں چلا گیا۔ سسرال میں آؤ بھگت ہوئی وہ اپنی جگہ پر مگر وہاں ایک لڑکی سے میری ملاقات ہوئی جو مجھے بہت اچھی لگی۔ اس کا نام فرحت تھا۔ بات بات پر کھلی پڑتی تھی۔ سسرال میں بیوی تو غائب ہو گئی جب تک وہاں رہا نظر نہیں آئی فرحت پیش پیش تھی معلوم ہوا۔ رشتہ میں سالی ہوتی ہے میری بیوی کا نام سلیمن تھا مگر چونکہ میری والدہ کا نام بھی سلیمن تھا۔ اس لیے میں اسے سلمہ کہتا تھا۔ میں نے فرحت سے کہا "سالی جی تمہاری بہن کہاں ہیں"؟

"تمہاری شادی میرے ساتھ ہونی چاہئے تھی" اس نے کہا اور زور زور سے ہنسنے لگی۔

جن حالات میں یہ شادی ہوئی تھی۔ وہ خوشگوار حالات نہیں تھے۔ پس منظر میں قیصر تھی۔ جو ہوا کے ایک خوشگوار جھونکے کی طرح آکر چلی گئی تھی اور پیش منظر میں ایک ایسی زندگی جو سراسر مبہم تھی ناپختہ حالات اور ایک ایسی بیوی جو کسی زاویے سے بھی نصف بہتر نہیں محسوس ہو رہی تھی جو بھی سسرال کی رسمیں تھیں ان سے نپٹ کر آکر لیٹ گیا آنکھ لگ گئی کسی نے اچانک آنکھوں کے سامنے لالٹین نچائی۔ میں اٹھ کر بیٹھ گیا فرحت تھی۔

ایسے دلوں میں کوئی سوتا ہے۔ تم دولھا ہو" وہ زور سے ہنسی۔

تم پیش پیش ہو یہاں آکر بیوی نے تو پوچھا ہی نہیں کس حال میں ہو" میں نے کہا۔

"ہم پوچھ رہے ہیں نا بیٹھ کے باتیں کر دو"

ہم برابر کے گھر میں چلے گئے۔ وہاں زمین پر پرال بچھی ہوئی تھی۔ اس پر بیٹھ گئے اور باتیں کرنے لگے۔

"میری شادی واقعی تم سے ہونی چاہیئے تھی" میں نے کہا۔
"اب تو گاڑی نکل گئی" وہ زور سے ہنسی۔
"بھول کو سدھارا نہیں جاسکتا" میں نے کہا۔
"کوئی سنے گا تو مار پڑے گی۔ تمہارے اوپر بھی میرے اوپر بھی" وہ پھر ہنسنے لگی۔
ہم کتنی دیر باتیں کرتے رہے وقت کا اندازہ نہیں ہوا۔ سویرا ہو رہا تھا پرندوں کے بولنے کی آوازیں آنے لگی تھیں۔
"تم مجھے بہت یاد آؤ گی" میں نے کہا۔
"اب سو جاؤ" اس نے مسکرا کر کہا اور اٹھ کر چلی گئی۔
اس کے جانے کے بعد میں ایک احساسِ زیاں میں مبتلا ہو گیا۔ ایک تکون سی بن گئی میرے ذہن میں۔ جس کے ایک سرے پر میں کھڑا تھا۔ دوسرے سرے پر قیصر تھی اور تیسرے پر فرحت تھی۔ بار بار کوئی مجھے اندر سے کچوکے دے رہا تھا۔ پوچھ رہا تھا۔ اسی بستی میں شادی ہونی تھی تو فرحت سے کیوں نہیں ہوئی؟
دو روز کے بعد میں سسرال سے واپس آگیا۔ سلمہ کو اس کے گھر والوں نے نہیں بھیجا واپس گھر آکر مجھ پر اضطراب سوار ہو گیا۔
اماں نے روکنا چاہا مگر میں نہیں رکا۔ فرحت مجھے بہت اچھی لگی تھی۔ اس سے دوبارہ ملنے کو جی چاہ رہا تھا۔ مگر سوا بازدید کے اس ملاقات کا اور کوئی مفہوم نہیں تھا۔ کالج بھی کھلنے والا تھا۔ میں اپنے ہاتھ کی طرف سے بھی پریشان تھا۔ شادی کا مقصد بھی ٹائیں ٹائیں فش ہو کے رہ گیا تھا۔ اماں کے اصرار کے باوجود میں دلّی واپس آگیا۔ میری دوسرے سال کی پڑھائی شروع ہو گئی تھی۔ داخلہ لیا اور پڑھنے میں مصروف ہو گیا۔ کچھ دن بعد اماں سلمہ کو لے کر دلّی آگئیں۔ میں اماں کا مقصد سمجھ رہا تھا مگر ایسا نہیں ہوا۔ حالانکہ اس میں سلمہ کا کوئی قصور نہیں تھا مگر افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے۔ مجھے اس کی طرف کوئی رغبت ہی نہیں ہوئی۔ اس کے مزاج میں ضد تھی۔ جو کام وہ نہیں کرنا چاہتی تھی نہیں کرتی تھی میرے اصرار کے باوجود اس نے پڑھنے سے انکار کر دیا۔ میں نے بھی اسے صرف مرد کی نظر سے

دیکھا۔ میرا شعور بھی اتنا بالغ نہیں تھا کہ شادی کے سلسلہ میں اپنی کوئی اخلاقی یا سماجی ذمہ داری محسوس کرتا۔ میری زندگی بھی صحیح معنوں میں شروع نہیں ہوئی تھی میں ہر اعتبار سے ناپختہ تھا۔ میں نے اماں سے کہا سلمہ کو واپس راؤکھیڑی لے جائیں۔ وہیں آجایا کروں گا۔ وہ لے گئیں واپس مگر راؤکھیڑی جانے کا مقصد فرحت سے ملنا تھا۔ ایک دن ملاقات ہوئی بھی۔ مگر اڑی اڑی سی۔ پھر مجھے معلوم ہوا اس کی شادی ہوگئی۔ مختصر یہ کہ کالج کا دوسرا سال اس طرح گزرا کہ میں دلی اور نجیب آباد کے درمیان کُھلا ہے کی نال کی طرح چکّر کاٹتا رہا۔ فرحت سے ملنے کی خواہش بار بار نجیب آباد لے کر آتی تھی۔ اور سلمہ سے رفاقت نہ ہونے کے سبب واپس چلا جاتا تھا۔ نتیجہ پڑھنا لکھنا خاک نہیں ہوا اور میں فیل ہوگیا۔

کالج میں جو مراعات ملی تھیں ختم ہوگئیں میں اپنے آپ کو پھر سے لاوارث سمجھنے لگا۔ اپنے حالات کا جائزہ لیا۔ محسوس ہوا مستقبل کے لیے میں نے جو پلان بنائے تھے۔ سب لپیٹ کر رکھ دیے تھے۔ پاؤں کے نیچے جیسے زمین ہی نہ رہی تھی۔ وہ لڑکا جسے اساتذہ ہونہار سمجھتے تھے نکما نکلا۔ میں سخت پریشان ہوا۔ مگر پریشانی تو مشکل کا حل نہیں تھی۔ میں نے سوچا بیوی، ماں، باپ، گھر بار سب کچھ بھول کر پڑھنے میں مصروف ہو جانا چاہیے۔ میں نے سب طرف سے آنکھ بند کرلی۔ ایک سال ایسے گزر گیا جیسے ایک دن یا ایک لمحہ۔ میں سیکنڈ ڈائر میں اچھے نمبروں سے پاس ہوگیا اور بی اے کے پہلے سال میں داخلہ لے لیا۔

گھر سے ایک سال کی دوری نے میرے اور سلمہ کے درمیان فاصلہ پیدا کر دیا پہلے ہی کوئی قربت پیدا نہیں ہوئی تھی۔ بی اے میں داخلہ کے بعد گھر گیا تو معلوم ہوا وہ اپنے میکے میں ہے۔ میں گیا تو وہ آگئی مگر آتے ہی واپس جانے پر اصرار کرنے لگی۔ اس کا یہ اصرار مجھے اچھا نہیں لگا۔ مگر کوئی ذہنی رابطہ نہ ہونے کے سبب میں نے روکنے پر اصرار نہیں کیا اور اسے واپس میکے بھیج دیا۔ یہ مخمصہ اگلے کئی برس پر پھیلا ہوا ہے صورتحال ایسی تھی کہ میں اس سے نکل بھی نہیں سکتا تھا اور رابطہ قائم رکھنا بھی مشکل تھا۔ میں

کم سے کم ایم اے کرنا چاہتا تھا۔ اس کے بعد ہی معلوم ہو پاتا میرا مستقبل کیا ہے اس لیے میں اپنی تعلیم کے ساتھ کوئی سمجھوتہ کرنے کو تیار نہیں تھا۔

موجودہ صورتحال کو برقرار اور خوشگوار رکھنے کے لیے ضروری تھا۔ والدہ اور بیوی کے ساتھ مستقل رابطہ اور تعلق قائم رکھتا وہ کام مسلسل خط وکتابت سے ہو سکتا تھا مگر والدہ بھی ناخواندہ تھیں۔ اور بیوی بھی۔ پہلے سے سلمہ اور اس کے خاندان کے لوگوں سے کوئی واقفیت یا پہچان نہیں تھی۔ مجھے معلوم ہی نہیں تھا۔ سلمہ کس مزاج اور کس انداز کی لڑکی ہے اس کی ماں کا انتقال ہو چکا تھا۔ باپ بمبئی میں کوئی کاروبار کرتا تھا۔ وہ سب سے بڑی تھی اور گھر کی دیکھ بھال اور انتظام اسی کے ہاتھ میں تھا۔ جس کے سبب اس کے مزاج میں خود مختاری پیدا ہوگئی تھی۔ میرے مالی حالات بھی ایسے نہیں تھے کہ بیوی کو ساتھ رکھ سکتا جسم کے لیے اپنے مستقبل کو قربان کر دینا بھی میرے پروگرام میں نہیں تھا۔ جسم میرے لیے زندگی میں ویسے بھی کبھی بہت اہم نہیں رہا۔ میں نے یہی بہتر سمجھا کہ موجودہ صورتحال کو اسی طرح رہنے دیا جائے اسے چھیڑا نہ جائے۔ اور چھٹیاں ختم ہونے کے بعد واپس دلی چلا گیا۔

باب ۸

بی اے میں داخلہ لینے کے بعد گھر سے میرا تعلق برائے نام سا رہ گیا۔ بارہ دری شیر افگن خان والا مکان چھوڑ کر میں پٹودی ہاؤس دریا گنج میں آگیا۔ دریا گنج میں بھی اینگلو عربک اسکول کی ایک شاخ تھی۔ اسکول کے اوپر کچھ کمرے تھے جو کرایہ پر ملتے تھے۔ ایک کمرہ خالی تھا میں نے وہ کرایہ پر لے لیا۔ اور وہاں منتقل ہو گیا۔ مؤیدالاسلام میں بشیر قریشی نام کا ایک لڑکا میرے ساتھ پڑھتا تھا میرے ساتھ ہی اس نے مؤیدالاسلام چھوڑا تھا۔ اسے میونسپلٹی میں نوکری مل گئی تھی۔ اتفاق سے وہ مجھے مل گیا۔ اسے بھی کمرے کی ضرورت تھی۔ اپنا سامان لے کر وہ میرے پاس ہی آگیا اور ہم دونوں ساتھ رہنے لگے۔ کمرہ کا کرایہ پانچ روپے مہینہ تھا۔ دونوں آدھا آدھا کر لیتے تھے۔

اس کمرے سے اینگلو عربک کالج اچھی خاصی دور تھا۔ پہلے ایڈورڈ پارک، پھر جامع مسجد اس کے بعد چاوڑی بازار، پھر قاضی کا حوض۔ اس کے بعد اینگلو عربک کالج آتا تھا۔ میں کمرے سے کالج پیدل آتا جاتا تھا۔

کالج کی زندگی کا آغاز اور اس کی تفصیل غیر اہم ہے۔ ایسی ہی تھی جیسی عام طلبا کی ہوتی ہے۔ مگر آہستہ آہستہ میں کالج کی سیاست اور اس کے ہنگاموں کا ایک اہم اور سرگرم رکن بن گیا۔ میں اس دور میں کالج کی یونین کا سکریٹری رہا۔ کالج میگزین کا ایڈیٹر رہا اور طلبا کے حق میں ایک بے باک اور آتش بیان مقرر رہا۔ لکھنؤ یونیورسٹی علی گڑھ یونیورسٹی، کانپور، آگرہ، لاہور، اور دلی کے مقامی کالجوں میں جتنے بھی اس نوعیت کے مقابلے ہوتے تھے، اپنے کالج کی طرف سے میں ان سب میں شریک ہوتا تھا ہر جگہ کا پہلا انعام گویا میرے لیے وقف تھا۔ اکثر جگہ سے ٹرافی بھی لایا تھا۔ میں دوسرے لڑکوں کی طرح تقریر لکھ کر اور رٹ کر نہیں لے جاتا تھا۔ فی البدیہہ بولتا تھا۔

اچھا بولنے والے کالج میں اور کئی لڑکے تھے۔ جیسے رضی الرحمٰن، تصور علی حیدر اور علی سردار جعفری مگر سردار جعفری کا میرا ساتھ کبھی نہیں ہوا۔ رضی الرحمٰن یا تصور علی حیدر ان دونوں میں سے کوئی ایک جاتا تھا۔ سردار ویسے بھی مجھ سے ایک سال آگے تھے۔ کالج میگزین میں ان کا ایک ڈرامہ چھپا تھا۔ "شیطان کے بچے" وہ غالباً ترجمہ تھا۔ اس سے میرا ان سے تعارف ہوا تھا۔ اس زمانے میں وہ نثر زیادہ لکھتے تھے شاید۔ ان کے افسانوں کا ایک مجموعہ "منزل" کے نام سے چھپا تھا۔ ان دنوں مجھے پڑھنے کا بہت شوق تھا۔ ادب اور تاریخ کے علاوہ دوسری زبانوں کے کلاسکی ادب اور شاعری کے ترجمے جو مل سکے تھے پڑھے تھے۔ دوسرے مذاہب کے بارے میں بھی کچھ نہ کچھ پڑھا تھا۔ تقریر کرتے وقت زور بیان دکھانے کے لیے حوالے غلط دے جاتا تھا۔ مگر سننے والوں کو اس کا احساس نہیں ہوتا تھا۔ زور بیان میں سب نکل جاتا تھا۔ اپنے زور بیان پر مجھے ضرورت سے زیادہ بھروسہ ہوگیا تھا۔ ایک بار آگرہ کے سینٹ جانز کالج میں پہلے کی جگہ مجھے دوسرا انعام ملا تو میں نے یہ کہہ کر واپس کر دیا "آپ نے غلط فیصلہ کیا ہے" اسی کالج میں میری پہچان ایسے دو لڑکوں سے ہوئی جن سے ابھی تک ملاقات بلکہ دوستانہ مراسم ہیں۔ ایک سید مظفر حسین برنی اور دوسرے مشتاق احمد یوسفی۔ برنی اقلیتی کمیشن کے صدر ہیں۔ اور دلی میں ہیں۔ مشتاق یوسفی کراچی میں ہیں۔ بہت سی کتابوں کے مصنف ہیں۔ اور ان کا شمار آج کے بڑے مزاح نگاروں میں ہے۔

کالج کے اس دور میں میری تخلیقی صلاحیتوں کو بھی مہمیز ملی۔

شاعری کیسے شروع کی وہ میں بتا چکا ہوں۔ جامع مسجد کے چوک میں اشفاق نام کے آدمی کو اپنی غزلیں گا گا کر بیچتے ہوئے دیکھ کر میں نے سوچا تھا ایسی شاعری تو میں بھی کر سکتا ہوں۔ اور شاعری کرنے لگا تھا۔ وہی سلسلہ ابتک جاری تھا۔ مگر وہ شاعری سطحی، جذباتی اور رومانی سی تھی۔ شاعری کے بارے میں نہ کسی سے مشورہ کیا تھا۔ نہ اصلاح لی تھی۔ ایسے ہی خود روسی چیز تھی۔ مگر کالج کے جلسوں میں سناتا تھا تو بڑی پسند کی جاتی تھی۔ جہاں جہاں تقریری مقابلے ہوتے تھے، خاص کر دلی میں، وہ تقسیم انعامات

کے بعد شاعری اور شعر خوانی پر ختم ہوتے تھے۔ ان دنوں میں نے اور نظموں کے علاوہ ایک نظم "کالج کی لاری" بھی کہی تھی۔ سن کر لڑکے لڑکیاں بڑا مزہ لیتے تھے۔ مگر ان نظموں میں سے اب کوئی میرے پاس نہیں۔ وہ تو ایک رو تھی جس میں وہ شاعری ہو رہی تھی۔ مگر جیسے جیسے وقت گزر رہا تھا۔ اس کی وقعت میری نظر میں کم ہوتی جاتی تھی۔

اس وقت دلّی میں جو شاعری ہو رہی تھی وہ بھی من گڑھت اور فرضی معلوم ہوتی تھی۔ بہت سے اساتذہ تھے۔ نواب سائل، پنڈت زتشی، استاد بیخود، امرچند ساحر، حیدر دہلوی، آغا شاعر قزلباش، غافل ہریانوی، وغیرہ۔ وہ شاعری سن کر شاعری اور زندگی میں ربط نہیں معلوم ہوتا تھا۔ کوئی خیال انگیز بات بھی نہیں ہوتی تھی۔ انسانی زندگی کا کوئی تجربہ یا تجزیہ بھی نہیں لگتا تھا۔ ان اساتذہ کے شاگردوں کو بھی دیکھتا تھا۔ کبھی کمپنی باغ میں کبھی ایڈورڈ پارک میں۔ ادھر سے تو میں روز گزرتا ہی تھا۔ ایک بار رک گیا۔ شاگردوں کی ایک ٹولی مشق سخن میں مصروف تھی۔ فی البدیہہ شاعری اور مصرع پر مصرع لگانے کی ذہنی کسرت ہو رہی تھی۔ میں اس مشقِ سخن کی اہمیت اور افادیت پر غور کرنے لگا۔ مگر کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔

ان دنوں میں افسانے بھی لکھا کرتا تھا۔ کوئی کہانی سوجھتی تھی تو رات بھر بیٹھا لکھتا رہتا تھا اور صبح ہوتے ہوتے ختم کر دیتا تھا۔ ان دنوں بہت سے اچھے ادبی رسالے چھپتے تھے۔ لاہور سے ادب لطیف، ہمایوں اور ادبی دنیا۔ دلّی سے ساقی، میرے اکثر افسانے ساقی میں شائع ہوتے تھے۔ سب سے پہلا افسانہ روزنامہ "وطن" کے سنڈے ایڈیشن میں چھپا تھا۔ افسانے کا عنوان "جھلی والا" تھا۔ "رقاصہ" کے عنوان سے ایک طویل نظم بھی کہی تھی۔ وہ بھی "ساقی" میں چھپی تھی۔ مگر شاعری یا نثر جو بھی اس وقت لکھا تھا۔ اب اس میں سے کچھ بھی میرے پاس نہیں۔ اب کبھی کبھی کچھ نظموں کا خیال آتا ہے۔ سوچتا ہوں ان پر نظر ثانی کی جاتی تو شاید ٹھیک ہو جاتیں مگر شاید تو شاید ہی ہے۔

ان دنوں ایک ناشر نے افسانوں کا مجموعہ شائع کرنے کا ارادہ ظاہر کیا تھا مگر تساہل یا لاپرواہی جو بھی کہیئے میں ترتیب نہ دے سکا انھیں مسودے کی شکل میں۔ اور وہ

خیال بھی ہوا میں اڑ گیا۔

کالج میں داخلہ لینے کے بعد اور میرے حالات معلوم ہونے کے بعد واکر صاحب نے مجھے دو اساتذہ سے خاص طور پر ملوا دیا تھا۔ ایک کا نام مرزا محمود بیگ تھا۔ دوسرے کا آفتاب احمد مختار۔ محمود بیگ صاحب فلسفہ پڑھاتے تھے۔ اور مختار صاحب تاریخ۔ یہ دو کا سلسلہ میرے ساتھ شروع سے ہے۔ مؤیدالاسلام میں عبدالصمد اور عبدالواحد تھے۔ فتحپوری اسکول میں غوث محمد اور صوفی صغیر حسن اور عربک کالج میں محمود بیگ۔ اور آفتاب احمد مختار۔ واکر صاحب نے ملوایا کیا، مجھے ان کی نگرانی میں دے دیا تھا۔ مجھے کوئی ذہنی یا جذباتی مسئلہ پیش آتا تھا۔ میں بیگ صاحب سے مشورہ کرتا تھا۔ وہ بہت اچھے آدمی تھے۔ ان کی بہن جوانی میں بیوہ ہو گئی تھیں۔ بیگ صاحب نے ان کی اور ان کے بچوں کی پرورش کے خیال سے شادی نہیں کی اور زندگی بھر کنوارے رہے۔ میں نے جب فلمیں لکھنے کا پیشہ اختیار کر لیا تھا اور بمبئی آگیا تھا۔ اس وقت بھی مرزا صاحب ایک دو بار میرے پاس آئے تھے۔ انتقال سے کچھ پہلے بھی میں ان سے ملا تھا۔

آفتاب احمد مختار کا بھی انتقال ہو گیا۔ تقسیم ملک کے بعد وہ کراچی چلے گئے تھے۔ ان کی شفقت اور ہنستا ہوا چہرہ مجھے ابھی تک یاد ہے اور کالج کی زندگی کا وہ حصہ بھی جب انھوں نے میرے "نگراں فرشتے" کا کردار ادا کیا۔ میں اپنے مالی اور نجی حالات کی تفصیل بتا چکا ہوں۔ مجھ پر ایک دور ایسا بھی آیا کہ میں جینے سے بددل ہو گیا۔ کہیں کوئی روشنی دکھائی ہی نہیں دیتی تھی۔ سخت احساس محرومی کا شکار تھا۔ ان دنوں میں نے اپنے اندر کئی تبدیلیاں پیدا کر لیں۔ جن میں کچھ ایسی باتیں بھی تھیں جنھیں اس وقت خرابیاں کہا جا سکتا تھا۔ مثلاً شراب نوشی شروع کر دی اور اس درجہ کہ دن میں بھی پینے لگا۔ یہاں تک کہ پی کر کلاس میں آجاتا تھا۔ آفتاب صاحب کو کچھ اس کا اندازہ ہو گیا تھا شاید۔ وہ جب مجھے اس حالت میں دیکھتے تو کلاس چھوڑ دیتے تھے اور ساتھ لیکر اپنے کمرے میں چلے جاتے تھے۔ چائے پلاتے تھے، بسکٹ کھلاتے تھے۔ ادھر ادھر کی باتیں کرتے تھے، مگر کبھی یہ نہیں کہا۔ پی کر کیوں آئے ہو۔ ایسی باتیں کرتے تھے جس سے مجھے

احساس ہو۔ غلط کیا ہے اور صحیح کیا ہے۔

ایک بار میری طرف کئی مہینے کی فیس واجب ہوگئی۔ انھیں پتہ چلا تو مجھے کمرہ پر بلایا۔ کچھ دیر اپنے انداز میں باتیں کیں۔ پھر پوچھا۔ کلکتہ اور آگرہ کے بارے میں کچھ جانتے ہو؟ میں نے کہا بہت نہیں۔ پھر ایک گائیڈ بک دی جس میں کلکتہ اور آگرہ کی تاریخی عمارتوں اور خاص خاص جگہوں کا ذکر تھا۔ کہا اسے یہیں بیٹھ کر پڑھو جتنی دیر میں پڑھتا رہا وہ اپنا کچھ کام کرتے رہے۔ میں پڑھ چکا تو پوچھا کلکتہ اور آگرہ پر دو چھوٹے چھوٹے ڈرامے لکھ سکتے ہو، کوئی بیس پچیس منٹ کے جنھیں ریڈیو پر پڑھیں تو دونوں شہروں کی سیر ہوجائے میں نے کہا لکھ سکتا ہوں۔ انھوں نے مجھے کاغذوں کا پلندہ اور قلم دیا۔ کہا لکھو اور جب تک لکھ نہیں لوگے چھٹی نہیں ملے گی۔ میں بھی یہیں ہوں۔ یہ کہہ کر انھوں نے باہر جاکر دروازہ بند کر دیا۔ میں بہت سٹپٹایا۔ وعدہ کیا کل لکھ لاؤں گا۔ مگر انھوں نے دروازہ نہیں کھولا۔ باہر سے آواز آئی "کام پورا کرلوگے دروازہ کھل جائے گا"

یہ بات اب کہانی سی معلوم ہوتی ہے۔ برس گزر جاتے ہیں تب کہیں جاکر ایک نظم ہوتی ہے۔ فلم کے مکالمے لکھنے بیٹھتا ہوں تو بات نہیں سوجھتی مگر اس وقت دماغ نے ایسا ساتھ دیا۔ میں نے ایک ہی نشست میں دونوں ڈرامے لکھ دیے۔ دلی ریڈیو نے مختار صاحب سے ان دونوں شہروں پر لکھنے کی فرمائش کی تھی۔ انھوں نے وہ دونوں ڈرامے ریڈیو اسٹیشن کو بھجوا دیے۔ اور ان سے جو روپیہ ملا میری فیس ادا کر دی۔

کالج میں آکر میرے دوستوں کا حلقہ بہت بڑھ گیا تھا۔ میرے بہت سے ہم جماعت تھے جن کا تعلق دلی کے پرانے خاندانوں سے تھا۔ جیسے مظفر شکوہ، مظفر حسین، سعد راشد الخیری شاہد العفور وغیرہ۔

مظفر شکوہ کا شمار شہزادوں میں ہوتا تھا۔ وہ بہادر شاہ ظفر کے خاندان سے تھے۔ سوئی والان میں رہتے تھے۔ مظفر شکوہ شعر بھی کہتے تھے۔ میرا ان کے یہاں بہت آنا جانا تھا۔ مظفر حسین کا خاندان بھی دلی کا پرانا خاندان تھا۔ ان کا ہوٹل کا کاروبار تھا۔ شملہ میں بھی ان کا کاروبار تھا اور کناٹ پلیس پر "حسین بخش اینڈ کمپنی" کے نام سے ایک بہت بڑا شوروم

تھا۔ مظفر حسین دونوں ٹانگوں سے معذور تھا۔ بیساکھیوں کے سہارے چلتا تھا۔ مگر بہت ذہین اور لطیفہ گو تھا۔ میں جن دنوں بارہ دری میں رہتا تھا۔ مظفر کے یہاں اکثر جانا ہوتا تھا۔ سعد راشد الخیری کے دادا دلّی کے مشہور اہلِ قلم تھے۔ مصورِ غم کے نام سے جانے جاتے تھے۔ عورتوں کے مسائل پر انھوں نے بہت لکھا تھا۔ چیلوں کے کوچے میں رہتے تھے۔ سعد کے چچا صادق الخیری اس وقت کے معروف افسانہ نگار تھے۔ شاہد الغفور سعد کے چچا زاد بھائی تھے۔ میں ان کے چھوٹے بھائی چھٹّن اور سعد کی بہن رازقہ کو پڑھاتا بھی تھا۔ ان کے علاوہ اور کئی لڑکے تھے۔ جن سے میرا بہت ملنا جلنا تھا۔ جیسے امداد الطاف اکبر مرزا، مقبول حسین، سلیم الدین، سلیم اللہ، عبدالحیٔ، اقبال اور دبیر۔ تقسیم ملک کے بعد یہ سب لاہور، کراچی اور اسلام آباد جاکر آباد ہوگئے۔ کچھ حیات ہیں، کچھ اللہ کو پیارے ہوگئے۔ مظفر شکوہ نیویارک میں ہیں۔ میں دو تین بار امریکہ اور کینیڈا گیا تو ان سے ملاقات ہوئی تھی۔ مظفر حسین کا ابھی پچھلے دنوں کراچی میں انتقال ہوگیا۔ وہ بہت دن دلّی ریڈیو اور پاکستان ریڈیو پر نیوز ریڈر اور اناؤنسر بھی رہے۔

جب میں کالج میگزین کا ایڈیٹر تھا تو مجھے ایسے لڑکوں کی تلاش ہوئی جنھیں لکھنے لکھانے کا شوق ہو پہلے سال میں جو لڑکے آئے ان میں کئی ایسے تھے جو باصلاحیت بھی تھے۔ اور لکھنے کا شوق بھی تھا جیسے جمیل الدین عالی، رضی الرحمٰن، ارشد مختار حسن عسکری بشیر بٹ، نعیم، عمر، مولود احمد، خالد شمس الحسن اور ظہیر ان سب سے میری بہت قربت رہی۔ خاص طور پر جمیل الدین عالی، رضی الرحمٰن اور خالد شمس الحسن سے۔ اب عالی پاکستان کے مقبول شاعر اور ادیب ہیں۔ رضی الرحمٰن تعلیم کے محکمہ میں سکریٹری ہیں۔ انھوں نے مولوی کریم الدین پر بھی کچھ کام کیا تھا۔ اور خالد شمس الحسن نیشنل بینک میں ڈپٹی ڈائریکٹر تھے۔ جب میں دلّی چھوڑ گیا تھا، کبھی واپس آتا تھا تو رضی الرحمٰن کے پاس ٹھہرتا تھا اب کراچی جاتا ہوں تو کبھی جمیل الدین عالی کے پاس ٹھہرتا ہوں کبھی خالد شمس الحسن کے۔ اکثر خالد کے یہاں ٹھہرتا ہوں۔

دلّی میں پٹودی ہاؤس میں جہاں میں رہتا تھا اس سے ملا ہوا گھر خالد کا تھا۔ ان کے

والد شمس الحسن مسلم لیگ سے وابستہ تھے۔ اشتہار و تشہیر کا محکمہ ان کے پاس تھا اس گھر سے میرا ایسا رابطہ تھا میں کسی وقت بھی آ ؤں کرے پر ان کی والدہ فوراً لڑکا بھیجتی تھیں اور اوپر بلاتی تھیں۔ میں نے کھانا کھایا یا نہیں۔ نہ کھایا ہو تو میں کہہ دیتا تھا نہیں کھایا۔ اور وہ فوراً کھانا بھجواتی تھیں۔ خالد پچھلے دنوں بمبئی آئے تھے۔ تو میرے ہی پاس قیام کیا تھا۔ عمر اسلام آباد میں ہے۔ میں اس کے گھر گیا تھا۔ اظہر کا انتقال ہو گیا۔ وہ ڈی آئی جی تھا۔ بشیر بٹ کراچی کی مشہور ایڈورٹائزنگ " مین ہٹن" کا مالک ہے۔ جب میں کراچی جاتا ہوں۔ سب دوست ملتے ہیں اور گئے گزرے زمانے کی باتیں کرتے ہیں۔ خاص طور پر وہ زمانہ جب ہم نے کالج میں بہت کامیاب ہڑتال کی تھی تفصیل کہیں آگے بیان کروں گا۔

اپنا تقریری مقابلوں میں حصہ لینے کا ذکر میں کر چکا ہوں۔ ایک شام ایسے ہی ایک مقابلہ میں حصہ لے کر میں کالج واپس جا رہا تھا۔ وہاں بھی ایک اجتماع تھا جس میں مجھے بولنا تھا۔ ان دنوں میرے پاس ایک سائیکل تھی۔ جس کی خوبی یہ تھی چاہے جتنا زور لگا کر چلائیں اس کی رفتار میں کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ میں پورا زور لگا کر جلدی کالج پہنچنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اچانک پیچھے سے آواز آئی "سنئے! سنئے" میں نے پلٹ کر دیکھا تو میرے پیچھے ایک تانگا آ رہا تھا۔ اس میں تین لڑکیاں تھیں۔ میں سائیکل سے اتر گیا۔ انھوں نے بھی تانگا روک لیا۔ وہ بھی اسی جلسہ سے واپس آ رہی تھیں میں نے جس میں ابھی شرکت کی تھی۔ انھوں نے مجھے بتایا وہ اکثر ایسے جلسوں میں جاتی ہیں۔ انھوں نے مجھے بہت بار سنا ہے بولتے ہوئے بھی اور نظمیں سناتے ہوئے بھی۔ ان میں سے ایک کا نام کور تھا۔ دوسری کا نام نرملا، اور تیسری کا نام شفق۔ نرملا دلی کی تھی، کور امرتسر کی، اور شفق پشاور کی رہنے والی تھی۔ تینوں لیڈی ہارڈنگ میڈیکل کالج میں پڑھتی تھیں۔ انھوں نے تعریف کی میں بہت اچھا بولتا ہوں اور اچھی شاعری کرتا ہوں۔ اس تعارف اور تعریف کے بعد میں نے رخصت چاہی۔ کہا مجھے ابھی اپنے کالج کے جلسہ میں بولنا ہے معذرت چاہتا ہوں۔ جلسہ کا نام سن کر وہ تینوں میرے ساتھ کالج آ گئیں۔ جلسہ کے بعد جب رخصت

ہونے لگیں۔ شفقی نے کسی شعری مجموعہ کا ذکر کیا۔ غالباً ساغر نظامی کے مجموعے کا۔ میں نے جواب دیا۔ آپ کو چاہیے تو میں لا دوں گا۔ اس نے مجھے اپنے کمرہ کا نمبر بتایا۔ وہ ہاسٹل میں رہتی تھی۔ میں نے وہ مجموعہ فراہم کیا اور اگلے روز جاکر شفقی کو دے دیا۔ اس کے بعد ہماری ملاقات اکثر ہونے لگی۔

میری شام اکثر کناٹ پلیس میں گزرتی تھی۔ کبھی مظفر حسین کے ساتھ۔ ان کا شوروم وہیں تھا۔ کبھی کافی ہاؤس میں۔ اب شام کی مصروفیت میں شفقی سے ملنا بھی شامل ہو گیا۔ میں ہاسٹل جاتا تھا۔ چپراسی سے کہتا تھا۔ وہ اندر جاکر اطلاع کر دیتا تھا اور وہ آجاتی تھی۔ لاؤنج میں کرسیاں پڑی ہوئی تھیں۔ ہم ایک کونے میں بیٹھ جاتے تھے۔ اور مختلف موضوعات پر باتیں ہوتی تھیں۔ ادب، شاعری، کالج کی سیاست اور جلسے، دلّی کی باتیں۔ اسے اپنے موضوع کے علاوہ شعر و ادب سے بھی دلچسپی تھی۔

شفقی قبول صورت لڑکی تھی۔ اس کے رویّہ میں وہ دبا دبا پن یا کھنچاؤ نہیں تھا۔ جو عام طور پر درمیانے طبقہ کی لڑکیوں میں ہوتا ہے جو بات کرتی ہیں تو معلوم ہوتا ہے سر پر کوئی بوجھ رکھا ہے۔ بس نیچا سے منڈیا ہلائے۔ شفقی آرام سے باتیں کرتی تھی۔ ہم دوست ہو گئے۔ بے تکلفی سے باتیں کرتے تھے۔ وہ مجھے اچھی بھی لگتی تھی۔ آنکھوں میں تھوڑا سا نیلا پن تھا۔ مسکراتی تھی تو بہت بھلی لگتی تھی۔

"آپ ایک دن بہت اچھے شاعر بنیں گے" اس نے ایک دن کہا۔

"اب نہیں ہوں" میں نے پوچھا۔

وہ ہنسنے لگی۔

"شاعر تو ہیں مگر آپ بولتے بہت اچھا ہیں۔ کیا بنیں گے آگے چل کر؟"

"پہلے سیاست میں جانے کا خیال تھا۔ اب سوچتا ہوں وکیل بنوں۔"

"جھوٹ سچ تو اس میں بھی بہت بولنا پڑتا ہے۔"

"پھر آپ بتائیں کیا کروں۔ ڈاکٹری تو پڑھ نہیں رہا"

وہ ہنسنے لگی۔ میں بھی ہنسنے لگا۔ عورتوں سے باتیں کرتے وقت میرے ذہن میں

جنس نہیں آتی ایک ذہنی آسودگی کا احساس ہوتا ہے۔ میرا ہمیشہ سے خیال ہے۔ عورت زندگی میں توازن پیدا کرتی ہے۔

شفقی سے یہ شام کی ملاقات ایک دستور سا بن گئی۔ مگر مجھے آہستہ آہستہ یہ احساس ہونے لگا جیسے اس کے اندر تبدیلی آرہی ہے۔ کور اور نرملا ہوسٹل میں نہیں رہتی تھیں مگر کور سے اس کی بہت دوستی تھی کئی بار اس نے کور کا ذکر ایسے کیا جیسے کور نے میرے بارے میں اس سے کچھ کہا ہو۔ کور سے بیچ میں ایک دو بار وہیں ملاقات ہوئی تھی۔ اس کی باتوں سے اندازہ ہوا تھا۔ جیسے اسے اپنی سخن فہمی پر بڑا ناز ہے۔ کور نے شفقی سے میرے بارے میں کیا کہا ہے۔ وہ تو نہیں معلوم مگر میں نے خود ہی فرض کر لیا وہ اسے میرے خلاف بھڑکاتی ہے۔ مجھے کور پر غصہ آنے لگا۔ میں نے سوچا کور کو اپنی سخن فہمی پر ناز ہے اسے بتانا چاہیے وہ کتنی سخن فہم ہے۔ مجھے یقین تھا کہیں نہ کہیں کسی نہ کسی کالج کے جلسہ میں اس سے ضرور ملاقات ہوگی۔ میں نے ایک نظم کہی جس میں ردیف قافیہ، آہنگ سب کچھ تھا۔ مگر معنی نہیں تھے۔ صرف لفاظی کی گئی تھی۔ اب پوری نظم تو یاد نہیں کچھ سطریں ذہن میں ہیں۔ یوں تھیں ؎

تھرتھرائی لو، مد و جزر گذرگاہ خیال
پاسبانِ عقل، بنیادِ تمدن، کینہ دار

ہمہ بر دوش ایوانِ شبستاں یم بہ یم
سرفروزاں کوہ معنی سے گریزاں ہرزہ کار

اتفاق سے انھیں دنوں دلی کے لا کالج میں ایک تقریری مقابلہ تھا۔ میں کالج کی طرف سے گیا۔ میں نے دیکھا کور اور شفقی آگے کی صف میں ہیں۔ تقسیم انعامات کے بعد مقابلہ کا اختتام شاعری پر ہوا۔ میں نے وہی بے معنی نظم پڑھ دی جو پچھلے دنوں کہی تھی۔ معنی کو بھول کر سننے والے الفاظ کے آہنگ میں کھو گئے اور خوب واہ واکی کور نے بھی داد دی۔ نظم پڑھنے کے بعد میں نے بگڑ کر سامعین سے کہا۔ آپ شاعری واعری کچھ نہیں سمجھتے۔ یہ بے معنی نظم ہے۔ اشارہ کور کی طرف تھا۔ سب پر سناٹا چھا گیا میں ہال

سے باہر نکل آیا اور اپنے طور پر خوش تھا میں نے کور سے بدلہ لے لیا۔ اگلے روز شفق سے ملنے گیا تو وہ ہنس کر کہنے لگی۔" آپ نے خوب مذاق کیا ہے کل کالج والوں کے ساتھ"۔

" وہ نظم کور کے لیے تھی" میں نے کہا۔

" کیوں کیا بگاڑا ہے اس نے آپ کا"؟

" میرے خلاف آپ سے الٹی سیدھی باتیں کرتی رہتی ہے" وہ چپ ہو گئی۔

ایک دو روز بعد لمبی چھٹیاں شروع ہو رہی تھیں شفق پشاور جا رہی تھی۔ میں نے کہا واپس آئیں گی تو ملوں گا۔ اور میں" خدا حافظ" کہہ کر چلا آیا۔ چھٹیاں ختم ہوئیں میں نے ہوسٹل میں فون کیا۔ شفق فون پر آئی میں نے پوچھا سب خیریت ہے۔ کب آئیں؟"

" آپ سے مطلب" اس نے رکھائی سے جواب دیا۔ مجھے اس کا لہجہ اچھا نہیں لگا۔ فون بند کر دیا اور پھر اس سے ملنے نہیں گیا۔

ایک زمانہ گزر گیا۔ میں اِدھر اُدھر وقت گزارتا ہوا جب علی گڑھ یونیورسٹی کی کی طرف سے ہندو کالج کے ایک مقابلے میں شرکت کرنے کے لیے آیا۔ میراجی میرے ساتھ تھے۔ مقابلے کے بعد باہر نکلا تو دیکھا سامنے شفق کھڑی ہے۔ میں رک گیا۔ وہ پوچھنے لگے یہ لڑکی تمہارے لیے کھڑی ہے۔ میں نے کہا ہاں مگر میں اس سے ملوں گا نہیں۔ اور مڑ کر میں دوسری طرف سے باہر نکل آیا۔ آج اس بات کو زمانہ گزر گیا مگر مجھے ابھی تک ملال ہے۔ میں نے ایسا کیوں کیا۔ اب تو وہ کہیں ڈاکٹر ہو گی۔ یہ واقعہ یاد آتا ہو گا تو معلوم نہیں کیا ردِعمل ہوتا ہو گا اس کے اوپر۔

مجھ سے ایسی حرکتیں بہت سرزد ہوئی ہیں۔ جو کبھی کبھی سوال بن کر میرے سامنے آتی ہیں مگر میرے پاس ان کا کوئی جواب نہیں ہوتا۔ البتہ ان کا جذباتی یا نفسیاتی خمیازہ برسوں بھگتنا پڑتا ہے۔ مگر پھر سب ایک ریلے میں بہہ جاتا ہے اور زندگی اپنے معمول پر آ جاتی ہے۔

گرمیوں کی چھٹیاں آئیں تو دوستوں میں سے کسی نے کہا پہاڑ پر چلیں۔ میں نے

کہا ضرور جاؤ "خدا حافظ" یہ مشورہ نذیر کا تھا۔ اس نے کہا تم بھی چلو گے اور وضاحت کی پیدل چلیں گے۔ دلی سے دہرہ دون گاڑی میں جائیں اور دہرہ دون سے مسوری اور مسوری سے شملہ تک پیدل۔ بات اچھی لگی اور پروگرام بننے لگا۔

روپیہ کا تو زیادہ خرچ نہیں تھا کون کون جائے گا یہ جاننا ضروری تھا۔ ایسے لڑکوں کا ساتھ ہونا چاہیے جو ہمت نہ ہاریں۔ لمبا سفر تھا ٹیم تیار ہونے لگی شمشاد، سلیم اللہ، سلیم علوی، نذیر، اس کا تو مشورہ ہی تھا۔ مقبول، اور تین لڑکے اور تیار ہوئے جن کا نام اس وقت میرے ذہن میں نہیں۔ طے یہ ہوا کہ دہرہ دون یا مسوری سے دو پہاڑی ملازم لیے جائیں جو سامان بھی اٹھا سکیں اور راستہ بھی اچھی طرح جانتے ہوں۔ رات کو کسی ڈاک بنگلہ میں ٹھہریں۔ سویرے ہی نکل کھڑے ہوں اور کسی چشمے کے کنارے رک کر ناشتہ بنائیں اور کھائیں پھر چل پڑیں اور دوپہر ہوتے ہوتے پھر کسی چشمے کے کنارے رکیں۔ کھانا بنائیں اور کھائیں اور پھر روانہ ہو جائیں اور شام تک سفر کر کے جو ڈاک بنگلہ ملے وہاں رک جائیں اور پھر اگلے روز صبح سویرے نکل کھڑے ہوں۔

چھٹیاں شروع ہوتے ہی پلان پر عمل شروع ہو گیا۔ حسب ارادہ دلی سے دہرہ دون ریل میں گئے۔ ان دنوں ایم این رائے دہرہ دون میں مقیم تھے۔ سلیم علوی سوشلسٹ پارٹی سے متعلق تھا۔ اس نے ایم۔ این۔ رائے سے ملنے کی خواہش ظاہر کی۔ میں اور وہ دونوں ساتھ گئے اور ایم۔ این۔ رائے سے ملے۔

کیا باتیں کیں ان سے وہ تو یاد نہیں مگر مل کر خوشی بہت ہوئی۔ بہت خوش مزاج تھے ان سے باتیں کر کے شگفتگی کا احساس ہوتا تھا۔ ان سے رخصت ہو کر واپس آئے اور مسوری کے لیے روانہ ہو گئے۔ مسوری میں ایک پہچان کا لڑکا تھا۔ نام یاد نہیں آ رہا۔ اس نے دو پہاڑی ملازموں کا بندوبست کر دیا۔ اور شملہ کے لیے روانہ ہو گئے۔ مسوری سے شملہ کتنے فاصلہ پر تھا وہ تو ذہن میں نہیں مگر ہم بائیس روز میں شملہ پہنچے۔

مسوری سے نکل کر پہلا ڈاک بنگلہ "کھاٹو اچو کی" تھا۔ جہاں ہم رات کو ٹھہرے کھانا کھا کر باہر نکلا تو اپنے آپ کو "دھند میں لپٹے" اونچے اونچے پہاڑوں میں گھرا پا کر

بڑی مسرت سی ہوئی۔ چاروں طرف وسیع جنگل چیڑ اور دیودار کے اونچے اونچے پیڑ اور جنگل کی خوشبو سے بھری ہوئی فضا کی جو کیفیت اس وقت تھی اسے بیان کرنا مشکل ہے۔

چوکی کے باہر ایک میدان تھا پیڑوں سے گھرا ہوا جہاں ایک بھیڑوں کا گلہ رکا ہوا تھا۔ وہ تماشا پھر کبھی دیکھنے کو نہیں ملا۔ بھیڑیں میدان میں بیٹھی ہوئی تھیں اور ایک بھاری بھرکم کتا بھونک بھونک کر ان کے گرد چکر کاٹ رہا تھا۔ دوسرے لفظوں میں رکھوالی کر رہا تھا۔ بھیڑوں کے گلے کی اور گلے کا مالک الاؤ جلائے ہوئے بیٹھا چلم پی رہا تھا۔ اور دو تین چرواہے تھے جو سو رہے تھے۔

جو چلم پی رہا تھا اچھا خوش رنگ، لمبا تڑنگا آدمی تھا۔ میں اس کے پاس چلا گیا۔ اور باتیں کرنے لگا۔ ساری باتیں تو یاد نہیں۔ کچھ چرواہوں کی زندگی ہی سے متعلق تھیں جانے کیا بات نکلی جس پر میں نے کہا۔ "ہمارے یہاں تو ایک آدمی کئی کئی شادیاں کر لیتا ہے" وہ ہنسنے لگا پھر بولا "ہمارے یہاں لڑکا اکیلا ہے تو لڑکی ہی نہیں ملتی"

"مطلب"

کئی بھائی ہوں تو جلدی شادی ہو جاتی ہے"

"کئی بھائی ایک لڑکی سے؟"

"ہاں کوئی کھانا لاتا ہے کوئی کپڑا لاتا ہے اور وہ بیوہ کبھی نہیں ہوتی۔ ایک بھائی مر جائے تو دوسرا ہوتا ہے"

اگلے دن ہم صبح سویرے اٹھ کر چلنے کے لیے باہر نکلے تو دیکھا میدان سونا پڑا ہے۔ گلہ اور گلہ بان جا چکے ہیں۔ رات کی جلی ہوئی لکڑیوں کی راکھ پڑی ہے۔

ہمارا سفر شروع ہو گیا۔ بہت اچھے اچھے خوبصورت مناظر راستے میں دیکھنے کو ملے۔ ایک جگہ رسیوں کے پل پر سے گزرنا پڑا۔ ایک جگہ ڈاک بنگلہ میں ٹھہرے تو باہر کا منظر بہت دلفریب تھا۔ تین اونچی اونچی مخروطی چٹانیں اونچے اونچے پہاڑوں سے گھری ہوئی جیسے کسی نے دانستہ بنائی ہیں، اور گنگا ہر چٹان کے گرد چکر کاٹ کر بہتی جا رہی تھی۔ ایک جگہ میدان میں حد نظر تک بنفشہ کے پھول کھلے ہوئے تھے۔

بائیس دن کچا پکا کھانا کھاتے اور صبح سے شام تک چلتے چلتے حلیہ بگڑ گیا تھا۔

میں نے مسوری سے نکلتے ہی ڈائری لکھنی شروع کی تھی۔ جس میں یہ درج تھا کتنی کتنی دور پر کہاں کہاں چشمے ہیں۔ کتنی کتنی دور پر ڈاک بنگلے ہیں اور کہاں کیا مل سکتا ہے۔ ایک ڈاک بنگلہ میں پہنچے تو جنگل سے شیر کے دہاڑنے کی آواز آتی رہتی تھی۔ ہم ڈر کے مارے سب دروازے کھڑکیاں بند کر کے سوئے۔

شملہ پہنچتے پہنچتے نڈھال ہو گئے۔ میری طبیعت خراب ہو گئی۔ جوں توں کر کے واپس دلّی پہنچے۔ کئی دن لیٹا رہا۔ بجائے دوا علاج کرنے کے آرام کیا اور بائیس روز تک جو پہاڑ کے مناظر دیکھے انھیں تصوّر میں لا کر دیکھتا رہا۔ اور خدا خدا کر کے ٹھیک ہوا۔ واپس آ کر کسی سے ملنے کی توفیق نہیں ہوئی تھی۔ نیاریوں میں چچا کے یہاں گیا۔ ان کی خیریت جاننے کے بعد سعد راشد الخیری کے یہاں گیا۔ شام ہو گئی تھی۔ اس نے کباب کھانے کا پروگرام بنایا۔ جامع مسجد کی سیڑھیوں پر ایک کبابی بیٹھتا تھا جو سیخ کباب گھی میں بگھار کر دیتا تھا۔ خیری روٹی کے ساتھ وہ کھائے اور کمرے پر آ کر سو گیا۔ ایک دو روز بعد کالج کھل گئے اور کالج میگزین ترتیب دینے میں مصروف ہو گیا۔

میراجی سے میری پہلی ملاقات ایک خط کے ذریعہ ہوئی تھی۔ یہ میرے کالج کا آخری سال تھا۔ ایک روز میں فیروز شاہ کے کوٹلہ میں ننگے پاؤں گھاس پر ٹہل رہا تھا۔ اچانک میرے ذہن میں ایک نظم آئی جس کا پہلا مصرع تھا۔

یہ نیم خواب گھاس پر اداس اداس نقشِ پا

یہ وجود عدم کا مسئلہ مجھے ہمیشہ انگیخت کرتا رہا ہے۔ میں نے اس نظم کو "نقشِ پا" عنوان دیا۔ کوٹلہ کے کھنڈر اس کے محرک تھے۔ دلّی سے ساقی میں تو میری نظمیں چھپتی ہی رہتی تھیں۔ لاہور سے ادبی دنیا نکلتا تھا۔ مولانا صلاح الدین نثر کا حصّہ ترتیب دیتے تھے۔ اور میراجی نظم کا حصّہ۔ میں نے وہ نظم ادبی دنیا کو بھیج دی۔ میراجی کو ایک نظم میں پہلے بھی بھیج چکا تھا جو انھوں نے یہ لکھ کر واپس کر دی تھی۔ "اس نظم پر نظرِ ثانی کیجیے" بلند بانگ سی نظم تھی "فرار" عنوان تھا۔ نظم میں ایک مصرع بار بار دہرایا جاتا تھا جو یوں تھا۔

سچ بتا کیا زندگی سے سہاگ کر آیا ہے تو

اس نظم نے میری کالج کی زندگی میں بھی بہت ہنگامہ پیدا کیا تھا جس کی تفصیل آگے بیان کروں گا۔ میراجی نے "نقش پا" بہت سے تعریفی جملوں کے ساتھ ادبی دنیا میں شائع کر دی اور اس دن سے میرے ان کے درمیان ایک ذہنی رابطہ قائم ہو گیا۔ جوان کے آخری وقت تک باقی رہا۔

کالج کی ان مصروفیتوں اور ادبی کاوشوں کے درمیان بیوی بالکل ذہن سے نکل گئی۔ خط و کتابت ہوتی رہتی تو رابطہ رہتا مگر بیوی بھی جاہل تھی اور ماں بھی ناخواندہ۔ رابطہ رہتا بھی تو کیسے مگر گھر کی خبریں ضرور ملتی رہتی تھیں۔ چچا ابھی تک نیاریوں کے محلے میں رہتے تھے۔ جو عربک کالج سے بہت قریب تھا۔ وقت ملتا تو وہاں چلا جاتا تھا۔ ایک مرتبہ گیا تو معلوم ہوا بیوی تھوڑی سرکش ہو گئی ہے۔ اماں سے پوچھے بغیر ادھر اُدھر چلی جاتی ہے۔ اماں منع کرتی ہیں تو زبان چلاتی ہے۔ پھر پتہ چلا ہمارے یہاں ظہور نے بہت آنا جانا شروع کر دیا ہے اور سلمہ سے بہت باتیں کرتا ہے۔

ظہور احمد میرے دوسرے تایا بھولی بخش کا بڑا لڑکا تھا۔ اس کی پہلی بیوی مر چکی تھی دوسری بیوی کو طلاق دینے کی فکر میں تھا۔ ظہور تایا زاد بھائی تھا اسے گھر میں آنے سے روکتا بھی کون میں ظہور کے چال چلن سے واقف تھا۔ میں نے دلی میں اس کے رنگ دیکھے تھے۔ ایک زمانہ میں وہ چچا کے پاس دلی میں بھی رہا ہے۔ کتابت سیکھتا تھا وہاں ایک گھڑی ساز کی بیوی سے اس کا معاشقہ تھا اس کے بارے میں یہ سب جانتے ہوئے بھی میں گھر نہیں گیا۔ پچھلی بار جب گیا تھا سلمہ کا رویہ دیکھ کر میں بہت بد دل ہوا تھا۔ اس کا بار بار میکے جانے پر اصرار کرنا بھی مجھے اچھا نہیں لگا تھا۔ اب ظہور سے اتنا میل ملاپ میرے اس کے درمیان ویسے بھی کوئی قدر مشترک نہیں تھی۔ میں نے سوچا شاید اسی میں کوئی بہتری کی صورت نکل آئے۔ حالانکہ اس سے کنارہ کر لینے کا سوال ابھی پیدا نہیں ہوا تھا۔ مگر میں نے سوچا طلاق دے کر میں الزام اپنے سر کیوں لوں۔ وہ خود اپنے واسطے دوسرا راستہ چن لے یہ زیادہ بہتر ہے۔ میری تو مارے باندھے کی شادی تھی۔ ظہور اس کے لیے ٹھیک تھا۔ میں دانستہ بے تعلق ہو گیا۔ لکھنے پڑھنے اور کالج کی زندگی کو مقدم

سمجھتا تھا اسی میں لگا رہا۔

ان دنوں عربک کالج مسلم سیاست کا مرکز تھا۔ آئے دن لیگ کے جلسے ہوتے رہتے تھے۔ پہلے ڈاکٹر ذاکر حسین انتظامیہ کے صدر تھے۔ مجھے ان سے نیاز حاصل تھا۔ جب جامعہ ملیہ قرول باغ میں تھا۔ میں اس زمانے سے وہاں جاتا تھا۔ کالج میں جب میں تعلیم بالغاں کے مرکز میں کام کر رہا تھا ان دنوں بھی ڈاکٹر صاحب سے ملاقات ہوتی تھی۔ جب وہ ہندوستان کی جمہوریہ کے صدر ہو کر دلّی چلے گئے تھے، تب بھی ایک بار ایک جلسہ میں ملاقات ہوئی تھی۔ انھوں نے نظم سنانے کی فرمائش کی تھی اور میں نے "ایک لڑکا" سنائی تھی۔ ان کے بعد کالج انتظامیہ نواب زادہ لیاقت علی خاں کے تحت آگئی تھی۔ مجھے نواب زادہ سے بھی نیاز حاصل تھا۔ اسٹوڈینٹس فیڈریشن چھوڑ دینے کے بعد میں مسلم اسٹوڈینٹس فیڈریشن میں شامل ہو گیا تھا بلکہ اس کا بانی ہی میں تھا۔ نواب زادہ لیاقت علی خاں صدر تھے۔ جب مسلم اسٹوڈینٹس فیڈریشن کے جلسے ہوتے تھے۔ ان میں کبھی کبھی محمد علی جناح بھی آتے تھے۔ ناگپور میں جو فیڈریشن کا اجتماع ہوا تھا۔ میں بھی اس میں شامل تھا۔ وہاں انگریزوں کے خلاف ایک دھواں دھار تقریر کی تھی۔ جناح صاحب صدر تھے۔ انھوں نے میری تقریر کو ایک شاعر کا زورِ بیان کہہ کر اڑا دیا تھا۔ میں ان کے ساتھ جالندھر والے جلسہ میں بھی تھا۔

نواب زادہ سے تو مسلم اسٹوڈینٹس فیڈریشن میں اکثر ملاقات ہوتی تھی۔ ایک روز مجھ سے کہا پاکستان بن جائے تو مجھ سے ملنا تم۔

"میں تو تقسیم کے حق ہی میں نہیں" میں نے ان سے کہا۔ وہ سن کر مسکرانے لگے۔ نواب زادہ اکثر مسکرا کر جواب دیتے تھے۔ اونچی آواز میں ہنستے ہوئے کبھی نہیں دیکھا تھا میں نے انھیں۔

مسلم اسٹوڈینٹس فیڈریشن کے عہدے داروں میں بہت سے لڑکے لڑکیاں تھیں۔ ان میں ایک مس عارف بھی تھیں۔ وہ مجھے بہت اچھی لگتی تھیں۔ دریا گنج میں لڑکیوں کا بھی ایک عربک اسکول تھا۔ وہ وہاں پڑھاتی تھیں۔ فیڈریشن میں میرے ساتھ ساتھ

حبیبہ مہندی اور حمیدہ نام کی دو لڑکیاں تھیں۔ انھوں نے شرارتاً عارف کے لیے میری پسندیدگی کو لیلیٰ مجنوں کا قصہ بنا دیا۔ جالندھر میں جو فیڈریشن کا اجتماع ہوا تھا، عارف اس میں ساتھ تھیں۔ دونوں مہندی بہنوں نے ہم دونوں کو چھیڑ چھاڑ کر خوب لطف لیا۔ وہ کچھ ایسے کھلنڈرے پن کا دور تھا کہ میں نے عارف پر ایک نظم کہہ دی اور کالج میگزین میں بھی چھپوا دی۔ خوب ہنگامہ ہوا کناٹ پیلیس شام کی سیرگاہ بھی تھی۔ لڑکے عارف کو وہاں دیکھتے تھے تو میرا نام لے کر کہتے تھے ڈھونڈو وہ بھی یہیں کہیں ہوگا۔ نظم جو عارف پر کہی تھی اس میں ہر بند کے بعد یہ مصرع آتا تھا۔

ع خدا جانے مجھے اس وقت تم کیوں یاد آتے ہو

لڑکے لڑکیاں عارف کو دیکھ کر یہ مصرع ضرور دہراتے تھے۔ اپنی حماقت کا ذکر کرتے ہوئے جانے کیوں مجھے یہ احساس پریشان کرنے لگا۔ عارف سے میری شادی ہوگئی تو ٹھیک نہیں ہوگا۔ اور میں اس سے کترانے لگا۔ جبکہ شادی کا کوئی سوال ہی نہیں تھا۔ وہ اسکول سے نکلتی تھی تو میں باہر کھڑا رہتا تھا۔ مگر اب میں نے جانا ہی چھوڑ دیا۔ مگر ایک شام کی بات ہے میرا اس سے ملنے کو بڑا جی چاہا۔ اتفاق سے امداد الطاف آگیا۔ میں نے اس سے کہا۔ اس نے کہا ابھی چلو اور ہم عارف کے گھر میر درد روڈ پہنچ گئے۔ اس کی والدہ بہت محبت سے ملیں۔ عارف بھی بڑی یگانگت سے ملی۔ بہت دیر باتیں کرتی رہی پھر بنگلہ کے دروازہ تک چھوڑنے آئی اور کہنے لگی اب تم ضرور آیا کرنا۔

"نہیں" میں نے کہا۔

"کیوں"، اس نے سادگی سے پوچھا۔

"میری مرضی"

"آج کیوں آئے"

"میری مرضی"

وہ ہنسنے لگی۔ میں واپس آگیا۔ اس زمانے میں خاص طور پر لڑکیوں کی طرف میرا رویہ بڑا احمقانہ سا ہوتا تھا۔ ۱۹۴۷ء میں جب میری شادی ہوئی تو سلطانہ کی بڑی بہن نے

عارف کو بھی بلالیا۔ وہ دونوں دوست تھیں۔ عارف آئی اور جاتے وقت کہا تم نے ٹھیک فیصلہ کیا ہے۔ یہ لڑکی تمھیں خوش رکھے گی۔ اس کے بعد ملک کا بٹوارہ ہوگیا۔ وہ لاہور چلی گئی۔ زمانے بعد امداد الطاف سے ملاقات ہوئی۔ اس نے بتایا عارف کا انتقال ہوگیا۔ آخر زمانے میں اس کی ذہنی حالت ٹھیک نہیں رہی تھی۔ مجھے واقعی بہت رنج ہوا

معلوم نہیں پوری انتظامیہ کمیٹی کا فیصلہ تھا یا نواب زادہ لیاقت علی خاں کا اپنا مگر ایسا ہوا کہ البرٹ واکر کو کالج سے برطرف کر دیا گیا اور ان کی جگہ فاروقی نام کے ایک صاحب کو پرنسپل بنا دیا گیا۔ فاروقی زیادہ تر لندن میں رہتے تھے اور وہیں تعلیم پائی تھی۔ مگر بہت زیادہ صلاحیتوں کے مالک نہیں تھے۔ اس کے برعکس البرٹ واکر بہت اچھے منتظم بھی تھے۔ ان کی وجہ سے کالج کا ایک وقار بھی تھا۔ اور لڑکے ان سے خوش بھی تھے۔ مگر قومی سطح پر انگریزوں کے خلاف ہنگامے ہو رہے تھے۔ ہوم رول اور ہندوستان چھوڑد کے نعرے عام تھے۔ کالج خود مسلم سیاست کا مرکز بنا ہوا تھا۔ آئے دن لیگ کا کوئی نہ کوئی اجتماع ہوتا رہتا تھا۔ کسی نے البرٹ واکر کو واپس بلانے کی مانگ نہیں کی۔ فاروقی صاحب اپنی کوتاہیوں کے سبب کالج پر اپنا سکہ نہیں جما سکے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ کالج ابتری کا شکار ہوگیا اور بدنظمی پھیل گئی۔ اس صورتحال سے فائدہ اٹھا کر اشتیاق قریشی نام کے ایک پروفیسر نے اپنا قبضہ جمانا چاہا اور کالج کی سیاست پر چھا جانا چاہا۔ اتفاق ایسا ہوا کہ اچانک ان کا میرا ٹکراؤ ہوگیا۔

کالج کی زندگی میں اپنی مقبولیت کا ذکر میں کر چکا ہوں۔ یونین کے انتخابات کا زمانہ آگیا۔ اشتیاق حسین قریشی، اسلم بٹ نام کے ایک لڑکے کو سکریٹری بنانا چاہتے تھے۔ انھوں نے مجھ سے کہا کہ مدد کردوں۔ میں اسلم کو اس کا اہل نہیں سمجھتا تھا۔ میں نے ان کی بات نہیں مانی اور جس لڑکے کو اہل سمجھتا تھا اس کے لیے کام کیا۔ نتیجہ یہ ہوا اسلم ہار گیا۔ اور میرا نمائندہ جیت گیا۔ قریشی صاحب نے اس بات کو بنائے مخاصمت بنالیا۔ اور جا بجا میری مخالفت کرنے لگے۔ اسی زمانے میں دو تین واقعات اور ایسے ہوئے کہ لڑکے پرنسپل فاروقی اور اشتیاق حسین قریشی کے خلاف ہو گئے۔ انگریزی

کی کلاس پرنسپل فاروقی لیتے تھے۔ ایک روز کلاس میں نہیں آئے۔ لڑکوں نے ایک گھنٹہ انتظار کیا پھر کلاس سے چلے گئے۔ فاروقی صاحب ایک گھنٹہ بعد آئے اور بجائے اپنی غلطی کا اعتراف کرنے کے لڑکوں پر بگڑ گئے اور ایک روپیہ فی لڑکا جرمانہ کر دیا۔

قریشی صاحب کیمسٹری پڑھاتے تھے واجد بٹ نام کا ایک لڑکا کلاس سے اکثر غیر حاضر رہتا تھا۔ ایک روز وہ اس پر بگڑے اور پوچھا غیر حاضر کیوں رہتا ہے۔

"مجھے آپ کی کلاس میں مزہ نہیں آتا" اس نے جواب دیا۔

قریشی صاحب نے اس جواب پر اسے معطل کر دیا۔ اس کے باپ نے آکر بہت منت وخوشامد کی۔ رویا گڑگڑایا مگر قریشی صاحب نے اپنا فیصلہ نہیں بدلا۔

"تمہاری زندگی خراب ہوتی ہے تو ہو میں کیا کروں" ان کا جواب تھا۔

یونین کے سالانہ جلسے میں تقریری مقابلے ہوتے تھے۔ ہندوستان کے ہر کالج سے لڑکے آتے تھے۔ انھیں دنوں یونین کا سالانہ جلسہ ہوا۔ پروفیسر قریشی جلسہ کے صدر تھے۔ حسب دستور تقسیم انعامات کے بعد مجھ سے نظم کی فرمائش کی گئی اور میں نے "فرار" پڑھی جس کا ایک مصرع ٹیپ کے طور پر دہرایا جاتا ہے ؎

سچ بتا کیا زندگی سے بھاگ کر آیا ہے تو

اسی نظم کا ایک مصرع یہ تھا ؎

جس طرح اک فاحشہ عورت کو شوہر کا خیال

قریشی صاحب نے مجھے روک دیا۔

"یہ نظم فحش ہے۔ بند کرو"

میں نے وضاحت کرنا چاہی مگر وہ نہ مانے۔ میں ہال سے باہر چلا گیا۔ ہال میں بہت کالج کے لڑکے لڑکیاں تھیں۔ سب نے کہا نظم فحش نہیں وہ سننا چاہتے ہیں۔ مگر قریشی صاحب اڑ گئے۔ اور جلسہ میں بہت بدمزگی ہوئی۔ جلسہ ختم ہونے سے پہلے لڑکے نکل نکل کر باہر آگئے۔ اور کالج میں ہڑتال کرنے کا پلان بنانے لگے۔ کالج کی موجودہ صورتحال سے میں بھی مطمئن نہیں تھا۔ مجھے واکر صاحب کے جانے کا بہت رنج تھا۔ لڑکوں کو اکٹھا

کر کے میں نے ایک قرار داد بنائی جو کچھ اس طرح تھی۔

۱۔ پرنسپل فاروقی اپنی غلطی کا اعتراف کریں اور لڑکوں پر جو جرمانہ لگایا ہے اسے معاف کر دیں۔

۲۔ واحد بٹ کا تعطل ختم کیا جائے اور اسے واپس کالج میں داخلہ دیا جائے۔

۳۔ اشتیاق قریشی اپنی غلطی کا اعتراف کریں اور اختر الایمان سے معافی مانگیں۔

اس قرار داد پر اتفاق رائے کے بعد کالج میں اگلے روز سے ہڑتال شروع ہوگئی ہڑتال شروع کرنے سے پہلے لڑکوں نے عہد کیا وہ میرا ساتھ نہیں چھوڑیں گے۔ دوسرے یہ کہ سارے فیصلے میرے مشورے سے ہوں گے۔ کسی لڑکے کو کوئی مسئلہ پیش آئے گا وہ سب کے ساتھ مل کر اسے حل کرے گا۔ اکیلا کوئی کچھ نہیں کرے گا۔

ہم نے ہڑتال کے آغاز میں انتظامیہ کمیٹی اور کالج میں بدعنوانیوں کے خلاف جلوس نکالے اور نعرے لگائے مگر اس دوران اس بات کا احساس بھی ہوا جن کے خلاف یہ مظاہرہ ہو رہا ہے وہ لڑکوں میں پھوٹ نہ ڈالیں۔ سب نے مل کر اپنے کو تین حلقوں میں بانٹ لیا ایک حلقہ خفیہ پولیس کا کام کرتا تھا۔ مخالف پارٹی کا ہمدرد بن کر اس میں گھومتا تھا اور ہڑتال کو توڑنے کے لیے وہ کیا کیا ترکیبیں سوچ رہے ہیں ان کی خبر رکھتا تھا۔ کالج میں صبح سویرے میٹنگ ہوتی تھی اور سب کو ہوشیار کر دیا جاتا تھا۔ دوسرا حلقہ سامنے والوں کے خلاف پروپیگنڈہ کرتا تھا کوئی خاص بات ہوتی تھی تو راتوں رات پوسٹر لکھے جاتے تھے۔ اور کالج کی دیواروں پر چپکا دیے جاتے تھے۔ اس پوسٹر کو "بھوگل گزٹ" کا نام دیا ہوا تھا۔ سالانہ امتحان بھی قریب آ رہے تھے۔ جلوس بند کر دیے تھے اور وہ لڑکے جو اچھے طالب علم تھے ان سے کہا گیا تھا کہ کمزور لڑکوں کو پڑھائیں اور کالج کے لان میں باقاعدہ کلاس ہوتی تھی۔ اس احتیاط کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ ہڑتال نہیں توڑ سکے مگر انتظامیہ کمیٹی نے کوئی توجہ نہیں دی نہ نواب زادہ لیاقت علی خاں نے لڑکوں کو بلا کر پوچھا کہ وہ کیا کر رہے ہیں۔ ہم نے سوچا مخالف اساتذہ اور انتظامیہ کمیٹی کے خلاف کوئی سخت قدم اٹھانا چاہیے طے یہ پایا

کرستیہ گرہ کی جاتے۔ میں نے لڑکوں سے کہا استادوں کے کمروں کے آگے صف بنا کر لیٹ جائیں۔ انھیں باہر جانے کا موقع نہ دیں۔ پریشان ہوں گے تو سمجھوتے کی بات کریں گے۔ لڑکوں نے ایسا ہی کیا۔ صف بنا کر استادوں کے کمروں کے آگے لیٹ گئے یہ ایک طرح سے لڑکوں کی ہمت کا امتحان بھی تھا۔ ننگے فرش پر دھوپ میں لیٹے ہوئے تھے مگر انھوں نے ہمت نہیں ہاری لیٹے رہے۔ جب آدھا دن گزر گیا اور پیشاب پاخانہ کے لیے بھی باہر نہیں نکل سکے تو اساتذہ تنگ آ گئے۔ عبد الصمد نام کے ایک انگریزی کے پروفیسر تھے ان سے پیشاب برداشت نہیں ہو سکا اور لڑکوں کو روندتے ہوئے باہر نکل آئے ان کی اس حرکت کو دوسرے استادوں نے پسند نہیں کیا جو استاد لڑکوں کے حق میں تھے۔ وہ بگڑ گئے اور نواب زادہ کو فون کیا۔ انھوں نے مجھے بلانے کے لیے آدمی بھیجا مگر میں نہیں گیا اور کہلوایا وہ خود آکر لڑکوں سے بات کریں۔ نواب زادہ آئے میں نے انھیں سب تفصیل سے بتایا۔ انھوں نے لڑکوں کی سب شرطیں مان لیں۔ لڑکوں کا جرمانہ بھی معاف ہو گیا اور واحد بٹ کو پھر سے داخلہ بھی مل گیا مگر میں نے اپنی شرط کہ قریشی صاحب مجھ سے معافی مانگیں واپس لے لی اور ہڑتال ختم ہو گئی۔

میں عربک کالج ہی رہ کر فلسفہ اور تاریخ میں ایم۔ اے کرنا چاہتا تھا۔ بی۔ اے کا امتحان ختم ہونے کے بعد جب کالج گیا معلوم ہوا فاروقی صاحب برطرف ہو گئے مگر میرے خلاف بہت کچھ لکھ کر گئے ہیں۔ مجھے رنج ہوا اور کالج کو ہمیشہ کے لیے خیرباد کہہ دیا۔

باب ۹

دلی کے ادبی حلقوں سے میں کوئی خاص واقف نہیں تھا۔ میرے علم ہیں کوئی قابل ذکر ادبی حلقہ تھا بھی نہیں۔ شاعری چونکہ محض ایک تفنن طبع کا ذریعہ تھی اس لیے اس سے وہ سنجیدگی وابستہ ہی نہیں تھی، جس سے تخلیقی کام کا بڑا گہرا رابطہ ہے۔ ویسے بھی دلی میں آنے کے فوراً بعد کے چار سال تو مؤیدالاسلام کی چار دیواری میں گزر گئے۔ فتحپوری اسکول کے دو سال محنت، مشقت اور بھاگ دوڑ میں نکل گئے جب کالج میں پہنچا تو مطلع تھوڑا صاف ہوا۔ میرا دوستوں کا حلقہ بڑھا اور دلی کے ایسے قدیم خاندانوں کے لڑکوں سے رابطہ ہوا جن کے گھروں میں علم اور ادب کا چرچا تھا۔

دلی کے معروف اساتذہ جن کے نام کانوں میں پڑے تھے۔ وہ گنتی کے تھے نواب سائل، استاد بیخود، پنڈت امرچند ساحر، آغا شاعر قزلباش، استاد حیدر دہلوی بہزاد لکھنوی، پنڈت زتشی اور غافل ہریانوی۔ اسی طرح کے اور بھی کچھ نام تھے جو اس وقت میرے ذہن میں نہیں۔ ان اساتذہ سے میرا کوئی تعارف نہیں تھا البتہ ان کے شاگردوں کو اکثر دیکھتا تھا کچھ سے تعارف بھی تھا۔ کالج کی زندگی کے آغاز میں جب دریا گنج میں اٹھ آیا تھا روز ایڈورڈ پارک سے گزر کر جانا ہوتا تھا۔ وہاں ان اساتذہ کے شاگردوں کو اکثر دیکھتا تھا ایک بار رک کر سنتا۔ فی البدیہہ شعر گوئی کا مقابلہ ہو رہا تھا۔ مجھے مشاعروں میں بھی جانے کا شوق نہیں تھا ورنہ اکثر کا کلام سن لیا ہوتا۔ جو چھپتے تھے۔ ان کو تو تھوڑا بہت پڑھا ہی تھا۔ غافل ہریانوی کے ایک شاگرد نے ایک مرتبہ ان کا شعر سنایا: ؎

پہنچے جو رات خواب میں ان کے مکان پر
سوئے زمیں پر آنکھ کھلی آسمان پر

وہ پرواز تخیل کی داد چاہتے تھے۔ میری زبان سے جل جلالہٗ نکلا۔

ایک بار رات کو چاندنی چوک سے گزر رہا تھا۔ گھنٹا گھر کے قریب پہنچا تو دیکھا ٹاؤن ہال کے باہر لوگوں کا ٹھٹھ لگا ہوا ہے اور کچھ لوگ ایک شخص کو سہارا دیکر گاڑی سے اتار رہے ہیں۔ اس شخص کے سر اور ڈاڑھی کے بال نمایاں تھے۔ وہ نشہ میں دھت تھا۔ بعد میں پتہ چلا وہ جگر تھے۔ ان دنوں وہ بہت پیتے تھے۔ بعد میں چھوڑ دی تھی۔ جگر صاحب سے میری ملاقات اس وقت ہوئی جب میں ایم اے کے لیے علی گڑھ یونیورسٹی گیا۔ وہ اکثر رشید احمد صدیقی کے پاس آتے تھے اور ان کے ساتھ نشست رہتی تھی۔ رشید صاحب کے یہاں اکثر بزرگ لکھنے والے اور قلمکار آتے رہتے تھے۔ اور رشید صاحب مجھے اور ادب سے دلچسپی رکھنے والے لڑکوں کو بلوالیتے تھے۔ مولانا حسرت موہانی سے بھی وہیں ملا تھا۔

نواب سائل کے تلامذہ میں میرے ایک دوست نہال سیوہاروی تھے۔ ایک بار بہت اصرار کیا چلو تمھیں استاد سے ملائیں۔ سائل صاحب ان دنوں چلنے پھرنے سے معذور ہو گئے تھے۔ رکشا میں بیٹھے رہتے تھے۔ جہاں جانا ہوتا ملازم لے جاتا تھا۔ اکثر شام کو جامع مسجد کی چوک میں مولوی سمیع اللہ کی دکان کے سامنے رکشا کھڑی کر دی جاتی تھی۔ جسے ان سے ملنا ہوتا تھا۔ جاکر مل لیتا تھا۔

مولوی صاحب سے مجھے بھی نیاز حاصل تھا۔ بڑے مزے کے آدمی تھے۔ ان کی کتابوں کی دکان تھی۔ دوستوں سے ملنے کا ٹھکانہ بھی تھا۔ کبھی کبھی میں بھی ادھر چلا جاتا تھا۔ ایک روز وہاں نہال سیوہاروی مل گئے اور مجھے سائل صاحب سے ملوانے لے گئے۔ اور تعارف کرانے کے بعد مجھ سے کچھ سنانے کے لیے کہا جو اس وقت یاد تھا میں نے پڑھ دیا۔ جب تک پڑھتا رہا سائل صاحب چپ بیٹھے سنتے رہے میں سنا چکا تو میری طرف دیکھ کر مسکرائے اور کہا

"میاں اچھا کہتے ہو مگر ہمارے ڈھب کا نہیں کہتے"

انھوں نے جس طرح کہا مجھے اچھا لگا خاص طور پر "ڈھب" اس "ڈھب" نے کئی بار

بڑا ہنگامہ کھڑا کیا۔ ایک بار سنسکرت ہائی اسکول میں ایک ادبی نشست ہوئی۔ میں بھی اس میں شامل ہوا۔ کچھ بزرگ لکھنے والے بھی تھے۔ پنڈت امیر چند ساحر، خواجہ حسن نظامی اور امن صاحب۔ اور بھی شاعر تھے جن کے نام اس وقت ذہن میں نہیں۔ میں نے ایک نظم پڑھی۔ عنوان اس وقت ٹھیک سے یاد نہیں۔ شاید "موت" تھی۔ نظم سن کر امیر چند ساحر بگڑ گئے۔

"یہ لونڈے معلوم نہیں کیا شاعری کرتے ہیں۔ ورڈز ورتھ اور ٹینی سن پڑھ پڑھ کے شاعری کرنے لگتے ہیں۔"

ساحر صاحب کی ٹیگور سے لمبی ڈاڑھی تھی اور قد شاید ٹیگور سے نکلتا ہوا۔ ویسے بھی سن رسیدہ تھے۔ ان میں سنجیدگی کی توقع تھی۔ میں احتراماً نہیں بولا مگر خواجہ حسن نظامی الجھ گئے۔ میری طرف سے۔

"کیا حرج ہے لڑکے اسی طرح سیکھتے ہیں بڑے لکھنے والوں سے تو استفادہ کرنا ہی چاہیے۔ اسی طرح تو نئے خیالات اور رجحانات ادب میں آتے ہیں۔"

دو بزرگوں کی جرح دلچسپ تھی مگر میں وہاں سے نکل آیا۔ ایک بار شاہد احمد دہلوی سے ملنے ان کے گھر گیا۔ صبح کا وقت تھا۔ وہ ریاض کر رہے تھے۔ وہ چتلی قبر پہ رہتے تھے میں بغیر ملے ہی پلٹ آیا۔ شاہد احمد بہت اچھا گاتے تھے۔ فن موسیقی باقاعدہ سیکھا تھا۔ اور فنون لطیفہ سے بھی دلچسپی تھی۔ اسٹیج پر ڈراموں میں کام بھی کرتے تھے۔ لکھتے بھی تھے۔ مولوی نذیر احمد کے خاندان سے تھے۔

پلٹتے وقت بالکل خالی الذہن تھا۔ جامع مسجد کے چوک میں پہنچا تو خیال آیا استاد بیخود سے ملا جائے۔ حالانکہ ان کا یا ان کی شاعری کا دلدادہ نہیں تھا۔ مگر وہ بھی نواب سائل کے پیر بھائی تھے۔ سائل سے ملے تو بیخود سے کیوں نہیں؟ وہ وہیں پاس ہی کی گلی میں رہتے تھے۔ اندر ڈیوڑھی میں گھسا تو گالیوں کی آواز آ رہی تھی۔ مغلظات بک رہا تھا کوئی۔ اندر جانے کی ہمت نہیں ہوئی۔ بعد میں کسی نے بتایا کہ بیخود غصہ میں ہوں تو گالیاں بہت بکتے ہیں۔

بہت پیدل چلنا میری عادت میں شامل ہے۔ ان دنوں تو بس چلتا ہی رہتا تھا۔ لمبی لمبی سیریں کرتا تھا۔ راتوں کے سناٹے میں دلی کی سنسان سڑکوں پر گھومتا رہتا تھا۔ رات

گئے جامع مسجد کے چوک میں جاکر کباب روٹی کھاتا تھا۔ سڑک کے کنارے کبابیوں کی دکانیں تھیں۔ انھیں میں ایک پشاوری کباب بنانے والا تھا۔ وہاں خاص طور پر جاتا تھا۔ ان دنوں مجھے دوستوں سے گپ لڑانے کا بڑا چسکا تھا۔ ہر دو قدم کے بعد کوئی نہ کوئی مل جاتا تھا۔ اور میرے کمرے کا وہ راستہ جو منٹوں میں طے ہونا چاہیے تھا گھنٹوں میں طے ہوتا تھا۔ جو دوست یا واقف کار راستے میں ملے اس سے تھوڑی دیر رُک کر بات کرنا ضروری تھا۔ ایک بار معلوم ہوا۔ دلّی میں ایک ادبی حلقہ بھی ہے جہاں شاعر اور ادیب اپنی اپنی تخلیقات پڑھتے ہیں۔ یہ نشست ہفتہ میں ایک بار خواجہ شفیع کے مکان پر ہوتی ہے۔

اس نشست کا علم بالکل اتفاقی طور پر ہوا۔ تفصیل اس کی یوں ہے۔ خواجہ شفیع کے والد خواجہ عبدالمجید ضرورت مند اور مستحق طالب علموں کو سات روپے مہینہ کا ایک وظیفہ دیتے تھے۔ میں نے سوچا میں ضرورت مند بھی ہوں اور مستحق بھی۔ مجھے یہ وظیفہ مل سکتا ہے اور میں خواجہ عبدالمجید سے ملنے چلا گیا۔ جامع مسجد سے چتلی قبر کی طرف جائیں تو الٹے ہاتھ کو ایک گلی پڑتی ہے وہ جگہ غالباً کلاں محل کہلاتی ہے۔ میں اس وظیفہ کے لیے ان سے ملنے گیا۔ وہ وظیفہ تو مجھے نہیں ملا مگر یہ خبر ضرور ملی کہ وہ ادبی نشست اسی مکان میں ہوتی ہے اور میں اس میں شریک ہونے لگا۔

خواجہ شفیع کی نشست میں بزرگ لکھنے والوں میں سے میں نے کبھی کسی کو وہاں نہیں دیکھا۔ زیادہ تر لکھنے والے نئے اور غیر معروف تھے جیسے مختشب جارچوی، صابر دہلوی، بسمل شاہجہانپوری اور فیض جھنجھانوی۔ فیض جھنجھانوی خواجہ شفیع کے بہت پسندیدہ شاعر تھے۔ یوں اور شعرا بھی آتے تھے مگر ان میں سے کسی کا نقش یا نام میرے ذہن میں نہیں۔

خواجہ شفیع بڑے شکیل اور نرم گفتار آدمی تھے۔ ایک خاص انداز میں داد دیتے تھے جس میں دلّی کی مرتی ہوئی تہذیب اور اس کا سارا جھوٹ شامل ہوتا تھا۔ خواجہ صاحب شاعرانہ انداز کی نثر لکھتے تھے اور بڑے مزے میں پڑھتے تھے۔ میں نے جو نظمیں ان دنوں کہی تھیں وہی سناتا تھا۔ "موت" پڑھی تو صابر دہلوی نے داد دی۔

"کیا پڑھتے ہو رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔"

"اور کیا کھڑا ہوتا ہے ؟" میں نے پوچھا۔
خواجہ صاحب گردن جھکا کر مسکرانے لگے۔

جس زاویۂ نگاہ سے میں شاعری کو دیکھتا تھا یا دیکھنا چاہتا تھا اس وقت تک دلّی لکھنؤ میں اس کا کوئی رواج نہیں تھا۔ دلّی کے وہ اساتذہ جن کے نام میں نے کہیں پیچھے لیے ان کے اپنے اپنے حلقے تھے۔ اور ان کی شاعری کا سارا زور وہیں ختم ہو جاتا تھا میں جب اپنی نظمیں پڑھتا تھا تو سننے والوں کی آنکھوں میں اس پر اعتبار اور اس کا وقار کم اور استفسار زیادہ نظر آتا تھا۔

ادب کے اس حلقہ میں سب سے اہم نام میرے خیال میں شاہد احمد دہلوی کا ہے وہ ماہنامہ ساقی نکالتے تھے اور نئے لکھنے والوں کی بہت ہمت افزائی کرتے تھے۔ نئے خیالات اور نئی تحریروں کو فروغ دینے میں ان کا بڑا ہاتھ تھا۔ ادیبوں کی مشکلات میں ان کے بہت کام آتے تھے۔ جب مجھے اپنا پہلا مجموعہ چھاپنے کا خیال آیا اور ان سے ذکر کیا تو انھوں نے پیشگی پیسے دے دیے ۴۳ء میں "گرداب" کے نام سے چھاپا بھی مکتبہ ساقی ہی نے۔ انھیں ہر طرح کے فن سے دلچسپی تھی۔ اور بڑے مزے کی بات کرتے تھے۔ ایک بار میں ان سے ملنے دفتر گیا۔ دفتر کھاری باؤلی میں تھا۔ کمرہ میں داخل ہوا تو دیکھا ان کا منہ دیوار کی طرف ہے شیروانی اتار کر دیوار پر لٹکا رہے ہیں اور دبی آواز میں کسی کو برا بھلا کہہ رہے ہیں۔ پلٹے تو دیکھا میں کھڑا ہوں۔ بڑے زور سے ہنسے۔

"کیا ہوا شاہد بھائی" میں نے پوچھا۔
"یہ مادر پدر آزاد زرندر ستیارتھی ....."
"کیا کیا اس نے؟"

"آتا ہے تو جانے کا نام ہی نہیں لیتا بیس لگا کے بیٹھ جاتا ہے آج صبح بھی آگیا۔ میں نے جان چھڑانے کے لیے کہہ دیا۔ پھر کبھی آئیے میں اسی وقت مہرولی جا رہا ہوں۔ کہنے لگا میں نے بھی مہرولی نہیں دیکھی۔ قطب کی لاٹھ کا بڑا نام سنا ہے۔ میں جھوٹ بول کے پھنس گیا اور اس گرمی میں بارہ بارہ چوبیس کوس کی دوڑ ہو گئی۔"

پھر قہقہہ مار کر ہنسے۔ تقسیم ملک کے بعد کراچی چلے گئے تھے۔ میں ان سے ملنے وہاں گیا تھا۔ اور ان کے حالات جان کر بہت تکلیف ہوئی تھی۔

ان دنوں اجمیری دروازے سے باہر کا علاقہ بیرونِ شہر میں شمار ہوتا تھا۔ اس میں عربک کالج بھی شامل تھا۔ ایک وقت آیا میونسپلٹی نے اپنے کسی فیصلہ کے تحت یا شہر والوں کی مانگ پر طوائفوں کو علاقہ بدر کر دیا۔ ان دنوں وہ جامع مسجد کے عقبی بازار میں آباد تھیں جسے چاوڑی بازار کہتے تھے یہ بازار جامع مسجد سے لے کر قاضی کے حوض اور اس کے برابر سرکی والان سے لے کر فتحپوری مسجد تک پھیلا ہوا تھا۔ سرکی والان ہیجڑوں کا بازار تھا۔ وہ بھی طوائفوں کی طرح پیشہ کرتے تھے جنھیں امرد پرستی سے دلچسپی تھی۔ ان کے پاس جاتے تھے۔ باقی عورتوں کا بازار تھا۔ فتحپوری کے آس پاس بہت سے حمام بنے ہوئے تھے وہ بھی ایک طرح سے عورتوں کے اڈے ہی تھے۔

عربک کالج کے سامنے سے جو سڑک نیاریوں کے محلے اور پھر اسٹیشن تک جاتی تھی۔ اس کا نام گیرسٹن بسٹن (جی.بی) روڈ تھا۔ ہیجڑوں کا کیا ہوا وہ مجھے نہیں معلوم مگر طوائفوں کو چاوڑی بازار اور دوسرے علاقوں سے نکال کر جی بی روڈ پر بسا دیا گیا اور اب چاوڑی بازار کی جگہ جی بی روڈ جنس کی خرید و فروخت کا بازار بن گیا۔ میں نے کہیں ذکر بھی کیا ہے کہ میں کالج کے تعلیم بالغاں کے مرکز میں بھی کام کرتا تھا۔ جس کی جماعتیں عربک کالج میں ہوتی تھیں۔ ایک شام میں جب کالج سے نکلا تو بسمل شاہجہاں پوری مل گئے مجھے دیکھ کر مسکرائے اور کہا

"اچھا تو آپ بھی یہاں آتے ہیں"؟

"ہاں" میں نے جواب دیا۔ جب میں نے ہاں کہا میرے ذہن میں تعلیم بالغاں کا مرکز تھا۔ اور ان کے ذہن میں بازار حسن۔ ہم مشرب سے مل کر ہر شخص بہت خوش ہوتا ہے۔ کہنے لگے آیئے آپ کو ایک جگہ لے چلیں۔ میں سمجھ گیا تھا چوک کہاں ہوئی ہے مگر میں نے کوئی ہیر پھیر یا کوئی وضاحت نہیں کی اور ان کے ساتھ چلا گیا۔ وہ مجھے ایک مکان میں لے گئے۔ یہ ان کی محبوبہ کا گھر تھا۔ اچھی دیدہ زیب نستعلیق سی عورت تھی۔ بسمل نے

میرے تعارف کے بعد کچھ سنانے کی فرمائش کی اور اس نے ایک غزل اقبال کی اور ایک اور کسی کی غزل سنائی ہوسکتا ہے بسمل کی ہو۔ کچھ دیر بیٹھ کر میں نے اجازت چاہی۔ نکل رہے تھے کہ سامنے کے مکان میں ایک چھوٹے سے قد کی خوش شکل لڑکی دکھائی دی بسمل نے بتایا کہ اس کا نام لکشمی ہے۔ الموڑے کی رہنے والی ہے۔ شعر بھی کہتی ہیں۔ بہت سے شاعر اس کے یہاں آتے ہیں۔ وغیرہ وغیرہ۔ مجھے اچھی لگی تھی۔ ایک دو روز کے بعد میں اس کے یہاں گیا۔ اس نے دو تین غزلیں سنائیں۔ جن میں فن موسیقی کی کوئی جھلک نہیں تھی تھوڑی سی مشق کے بعد کوئی بھی اس طرح اور ویسا گا سکتا ہے۔ دراصل یہ بنج میونسپل کارپوریشن کی لگائی ہوئی تھی۔ کیوں؟ مجھے نہیں معلوم مگر جی بی روڈ پر بسنے والی عورتوں پر یہ پابندی لگادی تھی کہ وہ گا بجا سکتی ہیں پیشہ نہیں کر سکتیں۔ اس بات میں کتنی صداقت تھی وہ بھی نہیں کہہ سکتا۔ ایسا میں نے سنا تھا۔ اس بات میں کتنی صداقت تھی یا نہیں وہ اپنی جگہ پر مگر ایسا کرنے سے لڑکیوں میں فن کار اور محض پیشہ ور کا فرق پیدا ہو جاتا تھا۔ اس فرق سے ان کی فیس میں بھی کمی بیشی آجاتی تھی۔

مختصر یہ کہ پیشہ وہاں ہوتا تھا مگر گانے کی آڑ میں۔ میں نے غزلوں کے بعد مطلب کی بات کی۔ مگر اس رات وہ خالی نہیں تھی اس نے ایک دوسری لڑکی سے ملوایا۔ کہا یہ اس کی بہن ہے ابھی الموڑے سے آئی ہے۔ راجکماری نام ہے۔

اس کے بعد دو تین بار میں لکشمی کے یہاں گیا مگر اس سے ہمارا معاملہ نہیں ہوسکا۔ ایک بار میں نے اصرار کیا تو اس نے جواب دیا آپ بہن سے متعلق ہیں آپ سے قریب ہونا مجھے اچھا نہیں لگتا۔ جگادھری کی طوائفوں کا چلن مجھے معلوم تھا۔ وہ ڈیرہ دار کہلاتی تھیں اور ایک وقت میں کسی ایک آدمی کی پابند ہو کے رہتی تھیں۔ مگر لکشمی کی قبیل کی عورتیں بھی کسی رسم و رواج کی پابند ہیں۔ یہ مجھے معلوم نہیں تھا۔ اس رسمی جواب کے بعد میں وہاں نہیں گیا۔

بسمل تنہا فرد نہیں تھے جو اس کوچے میں جاتے آتے تھے۔ اور بھی کئی شاعروں کے نام میرے ذہن میں ہیں جیسے نخشب اور شاعر دہلوی۔ صابر دہلوی کی اور نخشب کی جوڑی تھی۔ دونوں اکھٹے جاتے تھے۔ انوری اور اختری نام کی دو طوائفیں تھیں۔ انوری

بہت اچھی گانے والی تھی۔ بڑی شستہ اور مہذب انداز میں بات کرتی تھی۔ نخشب کی اس سے آشنائی تھی۔ نخشب ایک بار مجھے بھی اس سے ملوانے لے گیا تھا۔ شاید دق کے عارضہ میں انتقال ہوا اس کا۔ صابر کی چھوٹی بہن اختری سے یاد اللہ تھی۔

عربک کالج سے رابطہ ختم ہو جانے کے بعد میں بالکل کٹی پتنگ ہو گیا۔ بی۔اے تو کر لیا تھا مگر ایم اے؟ وہ کیسے ہوگا؟ پہلے تو خیال تھا عربک کالج کا سہارا لے کر آگے بڑھوں گا وہاں دو ایسے ہمدرد اساتذہ تھے جو صائب مشورہ دے سکتے تھے مگر کالج کی ہڑتال جس طرح اختتام کو پہنچی اس نے میرے راستے ہی بند کر دیے تھے۔ کب تک اس تعطل کی کھونٹی میں لٹکتا۔ سوچا کوئی ملازمت کر لوں کچھ ذہنی سکون تو ملے گا۔

ایک لڑکا سجاد میرے ساتھ کالج میں تھا۔ اس کے والد سپلائی کے محکمہ میں کسی اچھی جگہ پر تھے میں ان کے پاس گیا۔ پہلے تو انھوں نے مجھے سمجھایا یہ میرے کرنے کا کام نہیں مگر میں نے بہت اصرار کیا تو انھوں نے مجھے وہاں کلرک کی حیثیت سے رکھ لیا۔ مشکل سے مہینہ بھر کام کیا ہوگا کہ میرا جی اچاٹ ہو گیا۔ میرے ساتھ دفتر میں ایک اور صاحب تھے۔ وہ فلسفہ میں ایم اے تھے۔ مجھے ان پر بڑا غصہ آتا تھا ڈگری برباد کر رہا تھا۔ میں سوچا تھا۔ دراصل یہ غصہ مجھے اپنے اوپر تھا مگر ایک روز ان پر برس پڑا۔ انھوں نے بڑی نرمی سے مجھے بتانا چاہا کہ میں ان کی مجبوریوں سے واقف نہیں۔ ان کی ضرورتوں کو نہیں سمجھتا۔ اگلے روز میں دفتر کے لیے نکل رہا تھا۔ دروازہ کھولا تو دیکھا سامنے ساغر نظامی کھڑے ہیں۔ میرے ان کے مراسم نہیں تھے مگر میں انھیں جانتا تھا۔

"آپ اچانک؟ خیریت" میں نے پوچھا۔

بیٹھو تو بات کرتے ہیں"

انھوں نے مجھے "ساقی" میں پڑھا تھا۔ نظمیں بھی اور افسانے بھی۔ وہ متاثر ہوتے تھے۔ انھوں نے کہا ہم مل کر کام کریں تو بہت کچھ کر سکتے ہیں۔ میں تو کچھ کرنے کے لیے بے چین ہی تھا۔ ان کی باتیں سنتا رہا۔ وہ میرٹھ سے ماہنامہ "ایشیا" نکالتے تھے۔ مجھے اس میں کام کرنے کی دعوت دی۔ رہنا کھانا ان کے ساتھ ساتھ ۲۵ روپیہ

ماہانہ ملے گا۔ میں آمادہ ہوگیا اور سپلائی کی ملازمت چھوڑ کر ان کے ساتھ میرٹھ چلا گیا۔ نخشب کے علاوہ میرٹھ میں میرے اور بھی دو دوست تھے۔ مقصود زاہدی اور مسعود زاہدی۔ بڑھان دروازہ پران کا مکان تھا۔ میرٹھ گیا تو ان سے بھی ملا۔ ان کے مکان میں اوپر کا کمرہ خالی تھا۔ انھوں نے اصرار کیا میں وہاں رہوں۔ ساغر کی جگہ میں نے ان کے مکان کو ترجیح دی اور وہاں رہنے لگا۔ میرٹھ کالج میں جیلانی صاحب فارسی شعبہ کے صدر تھے۔ کالج کے تقریری مقابلوں کے سلسلہ میں میرٹھ کالج بھی آنا ہوا تھا۔ میں جیلانی صاحب سے واقف تھا۔ باتوں باتوں میں یہ رائے ہوئی "ایشیا" میں کام کرنے کے ساتھ ساتھ فارسی میں ایم اے بھی کرلوں اور میں نے میرٹھ کالج میں داخلہ لے لیا۔ کچھ دن بعد ساغر حیدرآباد چلے گئے۔ "ایشیا" کی ساری ذمہ داری میرے اوپر آگئی جوں توں کر کے پرچہ ترتیب دیتا رہا۔ مواد کم پڑتا تھا تو دوسری زبانوں کے افسانے ترجمہ کر کے کبھی خود لکھ کر صفحات پورے کر دیتا تھا۔ ساغر اب آتے ہیں نہ جب۔ میں میرٹھ سے بیزار ہوگیا۔ جیسے ہی ساغر واپس آئے میں خدا حافظ کہہ کر اور فارسی ایم اے بیچ میں چھوڑ کر دلی واپس آگیا۔ دلی واپس آنے کا بڑا سبب ایک نئی ملاقات بھی تھی۔

جن دنوں میں فتحپوری اسکول میں تھا۔ گھر سے اسکول اور اسکول سے گھر آتے جاتے ایک صاحبزادے کو دیکھتا تھا۔ گورا چٹا رنگ دراز قامت، شیروانی کے بٹن گلے تک بند۔ نظر نیچی کر کے چلتے تھے۔ ان کا مکان اسکول سے بہت قریب تھا۔ نام محمد علی منصوری تھا۔ بیرسٹر آصف علی کے عزیزوں میں تھے۔ میں قریب ہی چابک سواروں کی گلی میں رہتا تھا۔ اکثر اسکول کے راستہ میں مٹ بھیڑ ہوتی تھی۔ مگر تعارف کبھی نہیں ہوا تھا۔ اسکول ختم کرنے کے بعد میں اینگلو عربک کالج میں آگیا۔ کچھ مدت بعد وہ بھی اسی کالج میں آگئے۔ ان کے والد حامد علی منصوری عربک کالج کی پولی ٹیکنک کے پرنسپل تھے۔ ایک روز دریا گنج میں کوچہ دکنی رائے سے گزر رہا تھا۔ سامنے کے مکان سے وہ نکل آئے۔ انھوں نے سلام کیا میں نے جواب دے دیا۔ اور پوچھا یہاں کیسے آپ تو فتحپوری پہ رہتے تھے؟ انھوں نے بتایا وہ جگہ چھوڑ دی اب سامنے کے

مکان میں آ گئے ہیں اور اندر گھر میں بلایا۔ میں چلا گیا۔ انھوں نے اپنی والدہ اور گھر کے دوسرے افراد سے ملوایا۔ بڑی بہن کا نام امجدی بیگم تھا۔ دوسری کا صفیہ اور تیسری کا نام فرخندہ اور اس سے چھوٹی کا نام سلطانہ تھا۔ وہ سبھائی کی طرح کھلتے ہوئے رنگ اور دل آویز ناک نقشے کی لڑکی تھی۔ باتوں سے معلوم ہوا پڑھنے لکھنے کا بھی شوق ہے۔ میرا نام بھی سنا تھا۔ کالج میں جو ہنگامے ہوتے تھے محمد علی گھر آکر وہ ساری روداد سناتے تھے۔ جس میں میرا ذکر خاص طور پر ہوتا تھا۔ سب نے اصرار کیا میں آیا کروں اور اس گھر میں میرا آنا شروع ہو گیا۔ گھر کی فضا میں قدامت پرست مسلمانوں جیسا کٹر پن نہیں تھا مگر ایسا کھلا پن بھی نہیں تھا جو اکھڑے ایک سلجھا ہوا امتزاج تھا جدید اور قدیم کا۔ وقت کے ساتھ ساتھ اس گھر سے میرا ذہنی رابطہ بڑھ گیا۔ سلطانہ مجھ سے بہت چھوٹی تھی مگر جن لفظوں میں اپنی پسندیدگی کا اظہار کر سکتا تھا میں نے کیا مگر ایسا محسوس ہوتا تھا یہ بیل منڈھے نہیں چڑھے گی۔ پسندیدگی اپنی جگہ پر اور ضروریاتِ زندگی اپنی جگہ پر۔ جتنی لڑکیوں سے تھوڑی بہت قربت ہوئی تھی۔ بیوی کا تصور ذہن میں نہیں آیا تھا۔ سلطانہ سے مسلسل ملاقاتوں کے بعد آیا مگر ساتھ ہی یہ خیال بھی آیا کہ گھر کے بزرگوں کے سامنے ایسی تجویز حماقت ہوگی۔ بات بھی کھوئی التجا کرنے والا معاملہ ہو جائے گا۔

اس کی کئی وجوہ تھیں ایک تو یہ کہ میں ادھ کچا تھا۔ کوئی مستقل نہیں مناسب ٹھور ٹھکانہ نہیں۔ دوسرے یہ کہ برسرِ روزگار نہیں۔ تیسرے یہ کہ شادی شدہ ہوں۔ سلطانہ کے مزاج اور گھر کے طور طریقوں کو دیکھتے ہوئے وہ مجھے مثالی بیوی نظر آتی تھی اس سے ملنے پر کوئی پابندی بھی نہیں تھی مگر ہر چیز کے مادی امکانات بھی تو ہوتے ہیں۔ وہ غیر حاضر تھے۔ اس گھر سے میرا رابطہ برابر قائم رہا۔ مگر حرفِ مدعا زبان پر لانے کے لیے بہتر وقت کا انتظار کرنے لگا۔

سعد راشد الخیری محمد علی کے گھر کے قریب ہی چیلوں کے کوچے میں رہتے تھے۔ وہ میرے ہم جماعت رہے تھے۔ ان کے یہاں بھی میرا آنا جانا تھا۔ ان کے دادا

راشد الخیری دلّی کی مشہور شخصیتوں میں تھے۔ عورتوں کے مسائل پر انھوں نے بہت لکھا تھا۔ مصورِ غم کے نام سے جانے جاتے تھے۔ خواتین کے لیے کئی پرچے نکال رکھے تھے جن میں "بنات" اور "عصمت" بہت مشہور تھے۔ بہت سی کتابوں کے مصنف تھے جو زیادہ تر عورتوں سے متعلق تھیں۔ سعد کے چچا صادق الخیری دلّی کے معروف لکھنے والوں میں تھے۔ ان کے افسانے اکثر ساقی میں چھپا کرتے تھے۔ ایک روز جو میں سعد سے ملنے گیا تو دیکھا صادق الخیری کے پاس ایک چھوٹے سے قد کے صاحب بیٹھے ہیں۔ گندمی رنگ ہے آنکھوں پر چشمہ ہے۔ انھوں نے ملوایا... کرشن چندر۔

میں نے کرشن چندر کے افسانے مختلف رسالوں میں پڑھے تھے۔ ان دنوں وہ ابھرتے ہوئے افسانہ نگار تھے۔ دلّی ریڈیو پر ملازم ہو کر آئے تھے۔ یہ پطرس بخاری کا زمانہ تھا۔ وہ ریڈیو کے افسرِ اعلیٰ تھے۔ ان کے چھوٹے بھائی زیڈ اے بخاری بھی ریڈیو سے متعلق تھے۔ ان دونوں کا اس محکمہ پر اتنا اثر تھا کہ برٹش براڈ کاسٹنگ کارپوریشن کی جگہ لوگ اسے بخاری برادرس کارپوریشن کہا کرتے تھے۔ ان کے زمانے میں سبھی اچھے لکھنے والے ریڈیو پر آگئے تھے۔ خاص طور پر پنجاب کے لکھنے والے ان میں گورنمنٹ کالج لاہور کے لڑکوں کو ترجیح دی جاتی تھی۔

سعادت حسن منٹو، راجندر سنگھ بیدی، کرشن چندر، وشوامتر عادل، اپندر ناتھ اشک ن۔م۔ راشد ان کے علاوہ اور چھوٹے بڑے لکھنے والے تھے۔ جو یکے بعد دیگرے آرہے تھے۔ کرشن چندر سے ملاقات کے بعد میرا بھی ریڈیو پر آنا جانا شروع ہو گیا۔ کچھ دن بعد اسٹاف آرٹسٹ کی حیثیت سے مجھے بھی ریڈیو پر ملازمت مل گئی۔ کچھ دن بعد میراجی بھی دلّی آگئے۔ ان سے میری پہلی ملاقات ن۔م۔ راشد کے مکان پر ہوئی۔ راشد بہت خاموش طبیعت کے آدمی تھے۔ برسوں تک خاکسار تحریک سے متعلق رہنے کے سبب ان میں ایک طرح کا رکھاپن آگیا تھا۔ راشد، کرشن چندر، اپندر ناتھ اشک سب آس پاس ہی رہتے تھے۔ یہ جگہ تیس ہزاری کہلاتی تھی۔ ان لوگوں سے باقاعدہ ملنا جلنا ہوا تو ادبی تبادلۂ خیال بھی ہونے لگا۔ کرشن چندر نے مجھے سنا تو مشورہ دیا تم شاعری زیادہ

چھپوایا کرو۔ اپنی افسانہ نویسی سے میں خود بھی مطمئن نہیں تھا۔ سامنے بیدی، منٹو، کرشن چندر، عصمت، حسن عسکری اور قرۃ العین تھے۔ یہ زمانہ ادب اور شاعری کا بڑا ثمر بار زمانہ تھا مگر دلّی کے لکھنے والوں پر ان رجحانات اور تخلیقات کا کوئی اثر نہ تھا۔ بلکہ معاندانہ رویہ تھا۔

۵ پھر کوئی آیا دلِ زار نہیں کوئی نہیں
راہ رو ہوگا کہیں اور چلا جائے گا (تنہائی)

خواجہ شفیع کی محفل میں ایک شام ایک صاحب نے پوری نظم اپنے نام سے پڑھ دی۔ میں ان کی صورت بڑے غور سے دیکھتا رہا۔ وہ اس محفل میں شریک ہونے والوں کے مزاج کی شاعری نہیں تھی کسی نے شاید اس وقت تک وہ نظم سنی بھی نہیں تھی۔ سب خاموش رہے میں نے بہت داد دی اور ان سے کہا بالکل ایسی ہی ایک نظم فیض نے بھی کہی ہے۔ وہ صاحب سمجھ گئے اور فوراً محفل سے اٹھ کر چلے گئے۔ ایسا ہی ایک واقعہ فارسی کے شاعر انوری سے بھی متعلق ہے مگر وہاں کلام کے ساتھ شاعر بھی چوری ہوگیا تھا۔ انوری کی ہجو گوئی سے لوگ خائف ہوگئے تھے۔ ان کے مخالفین کو اچھا موقع ہاتھ آیا تھا۔ خود اپنے دشمنوں کی ہجو لکھ کر بے چارے انوری کے نام سے پڑھ دیتے تھے۔ اور اس کا خمیازہ بھگتنا انوری کو پڑتا تھا۔ ایک مرتبہ انوری کسی ایسی جگہ سے گزرا جہاں ایک شاعر انوری کے نام سے کسی کی ہجو پڑھ رہے تھے۔ انوری نے ان صاحب سے پوچھا یہ کس کا کلام ہے۔

"انوری کا" انھوں نے جواب دیا۔

"آپ کون ہیں" انوری نے پوچھا۔

"انوری" ان صاحب نے جواب دیا۔ انوری نے کہا

"شعر چرانے والے تو بہت دیکھے تھے۔ شاعر چرانے والا آج دیکھا ہے۔

کبھی دلّی اور لکھنؤ ادب اور ثقافت کا بڑا مرکز تھے۔ اب لاہور ہوگیا تھا۔ یوں علی گڑھ کی بھی بڑی اہمیت تھی۔ ایک کے بعد ایک کئی نسلوں نے ادب اور شاعری

پر اپنا اثر چھوڑا تھا مگر اس میں اجتہاد نہیں تھا۔ بڑے اداروں میں انجمن ترقی اردو تھی۔ اس کوٹھی میں جہاں انجمن کا دفتر تھا وہاں کسی زمانے میں ڈاکٹر انصاری رہا کرتے تھے مگر یہ ادارہ بھی مردہ پرست کہلاتا تھا۔ نئے رجحانات کی طرف توجہ دینا تو دور کی بات انہیں قابلِ اعتنا بھی نہیں سمجھا۔ میں کبھی انجمن کے دفتر میں جاتا تھا۔ مجھے مولوی عبدالحق اور دتاتریہ کیفی دونوں سے نیاز حاصل تھا مگر میں جاتا تھا ملنے شاہد لطیف سے۔ انجمن جو اردو لغت تیار کر رہی تھی۔ شاہد لطیف بھی اس پہ کام کر رہے تھے۔ شاہد لطیف افسانہ نگار بھی تھے۔ ان کے افسانے ساقی میں چھپا کرتے مگر وہ مشہور ہوئے عصمت چغتائی سے شادی کرنے کے بعد شہرت کیا دھماکہ تھا ایک۔ عصمت حسن عسکری اور منٹو کا شمار بڑے لکھنے والوں میں بھی تھا اور بدنام لکھنے والوں میں بھی۔ منٹو کی کالی شلوار اور خوشیا وغیرہ۔ حسن عسکری کا پھسلن اور عصمت چغتائی کا لحاف اور دوزخی بہت اچھے تخلیق پارے بھی تھے اور عام روش سے ہٹے ہوئے۔ اس وقت اس طرح کی تخلیقات کو نیا ادب کا نام دیا گیا مگر بعد میں یہ نام ترقی پسندی نے لے لیا۔ بعد کی ساری اشتراکی زاویہ سے لکھی ہوئی تخلیقات ترقی پسندوں کے نام سے موسوم ہوئیں۔

ان دنوں خاص طور پر پنجاب کے لکھنے والے اور قلمکار دلی آ گئے تھے۔ کوئی فوج کے کسی شعبہ سے جڑا ہوا تھا کوئی ریڈیو سے متعلق تھا۔ چراغ حسن حسرت، حفیظ جالندھری، فیض فوج سے متعلق تھے۔ کوئی کرنل تھا۔ کوئی برگیڈیر اور ن م راشد، میراجی، راجہ مہدی علی خاں، شاعروں میں اور منٹو، اپندر ناتھ، کرشن چندر ادیبوں میں۔ فیض، سیر در روڈ پر رہا کرتے تھے۔ حمیدہ عارف کے پڑوس میں۔ کبھی کبھی میں ان سے ملنے جایا کرتا تھا۔

انھیں دنوں راشد نے ریڈیو سے ایک مشاعرہ کیا جس میں جوش، احسان دانش اور اختر شیرانی بھی تھے اور میراجی، فیض اور راشد بھی میں نے بھی اس مشاعرہ میں شرکت کی تھی اور اپنی نظم "پگڈنڈی" پڑھی جو نام میں نے گنوائے ہیں ان کے علاوہ اور

بھی شاعر تھے۔ شاید روش صدیقی بھی مگر اب میں بالکل یقین کے ساتھ نہیں کہہ سکتا اور کون کون تھا۔ اس مشاعرہ کے بعد میرا شمار بھی لوگ ابھرتے ہوئے شاعروں میں کرنے لگے تھے۔ کرشن چندر "نئے زاویے" کے نام سے کچھ نمبر نکالتے تھے۔ ان مجموعوں میں میری نظم بھی تھی۔

میراجی دلی آئے تو ان سے روز ہی ملاقات ہونے لگی۔ جامع مسجد کی چوک سے چاندنی چوک آئیں تو سامنے کونے پر ایک سنیما تھا۔ اس جگہ کو پتھر والا کنواں کہتے تھے سنیما سے ملا ہوا ریستوران تھا۔ اسپلینڈ اینڈ بار۔ وہاں ڈرافٹ بیر بہت اچھی ملتی تھی۔ چھ آنے گلاس بلکہ مگ۔ ہم لوگ شام کو یہیں ملتے تھے۔ کبھی کبھی ان کے ساتھ ایس کے پریم، محمد حسین اور راجکمار بھی ہوتے۔ یہ تینوں آل انڈیا ریڈیو پر ڈرامے میں کام کرتے تھے۔ محمد حسین بہت اچھا فن کار تھا۔ میراجی کی ریڈیو پر بہت پذیرائی نہیں ہوئی۔ شاید ن م راشد ان سے خوش نہیں تھے۔ اس خفگی کا تعلق اس زمانے سے تھا جب میراجی ادبی دنیا میں کام کرتے تھے۔ اور نظم کا حصہ ترتیب دیتے تھے۔ نثر کا حصہ مولانا صلاح الدین کے سپرد تھا۔ میرے پاس راشد کا ایک خط تھا جو میں نے سردار جعفری کو دیا تھا۔ جو انھوں نے واپس نہیں کیا۔ وہ خط میراجی کے نام تھا۔ اور بہت شکایت آمیز تھا۔ سردار نے وہ خط گفتگو میں چھاپا بھی تھا۔ میراجی پینے کے بعد کبھی کبھی بے قابو ہو جاتے تھے۔ اس درجہ کہ انھیں تانگہ میں بٹھانا مشکل ہو جاتا تھا۔ جیسے ہی تانگہ چلنے لگتا تھا۔ کود کر نیچے اتر آتے تھے۔ روز رات کو انھیں واپس بھیجنا ایک بڑا مسئلہ تھا۔ وہ کشن گنج میں اپنی بہن کے پاس رہا کرتے تھے۔ ایک دو بار میں ان کے یہاں گیا تھا۔ ریڈیو کے اسٹاف میں نظامی نام کے ایک افسر تھے وہ میراجی کا بہت خیال رکھتے تھے۔ اور انھیں پروگرام دیتے رہتے تھے۔

جب شاہد احمد دہلوی نے میرا پہلا نظموں کا مجموعہ چھاپنے کا ارادہ ظاہر کیا تو میں نے مجموعہ ترتیب دے کر ن م۔ راشد کو دکھایا۔ تقریباً ڈیڑھ سو کے قریب نظمیں تھیں انھوں نے کچھ نظمیں نکال دیں۔ اس کے بعد میں نے راشد کی منتخب کی ہوئی نظمیں میراجی کو

دکھائیں۔ کچھ انھوں نے نکال دیں۔ سو ڈیڑھ سو نظموں میں تیئس بچیں۔ ”گرداب“ کے نام سے ۱۹۴۲ء میں پہلی کتاب چھپی۔ جو نظمیں مجموعہ میں شامل نہیں ہوئی تھیں وہ ایک دوست نے لیں ان سے کوئی صاحبزادی لے گئیں جن کے بارے میں سنا تقسیم ملک کے بعد گھر پہ حملہ کرنے والے فسادیوں سے لڑتی ہوئی ماری گئیں میں بھی دلّی میں نہیں تھا۔ ریڈیو سے قطع تعلق ہونے کے بعد علی گڑھ مسلم یونیورسٹی ایم اے کرنے چلا گیا۔ وہاں سے حیدرآباد اور حیدرآباد سے بمبئی ہوتا ہوا پونا اور شالیمار فلم کمپنی سے متعلق ہو گیا۔

ریڈیو پر میرے کاموں میں گیت وغیرہ لکھنے کے علاوہ ترجمہ کا کام بھی تھا ریڈیو کا ایک معلوماتی پرچہ ”پسند“ چھپتا تھا۔ اس میں ریڈیو پر ہونے والے پروگراموں کی تفصیل ہوتی تھی۔ اسی کا اردو ترجمہ ”آواز“ کے نام سے چھپتا تھا۔ ایک بار ترجمہ کرتے وقت مجھ سے ایک نام چھوٹ گیا۔ پرچہ اسی غلطی کے ساتھ چھپ گیا۔ اڈوانی اسٹیشن ڈائریکٹر تھے۔ انھوں نے مجھے بلایا اور کہا اس غلطی کے لیے تم پر تیس روپے جرمانہ کیا جاتا ہے۔ میں نے کہا تیس نہیں پندرہ۔

”پندرہ کیوں“ انھوں نے پوچھا۔

میں نے کہا۔ ”ن۔م۔ راشد اس شعبہ کے صدر ہیں۔ انھوں نے کیوں نظر انداز کیا۔ ترجمہ انھیں پڑھنا چاہیے تھا۔ آدھی ذمہ داری ان کی ہے“۔ میں نے یہ بات ایسے ہی مذاق میں کہی تھی مگر راشد نے اس بات کا بُرا مانا۔ اگلے روز جو میں دفتر پہنچا دیکھا میری میز پر ایک نوٹس رکھا ہے لکھا تھا۔ ”تمھیں فوری طور پر برطرف کیا جاتا ہے“ مجھے وہ نوٹس پڑھ کر رنج ہوا مگر میں نے اپنے آپ کو یہ کہہ کر تسلی دی اس ملازمت میں تمہارا کوئی مستقبل نہیں تھا۔ مستقبل تو انھیں لوگوں کا روشن ہوتا ہے جن کے پاس بڑے وسیلے ہوں یا بڑی ذہنی استعداد اور ڈگریاں ہوں۔ محض بی اے پاس آدمی کا کیا مستقبل حفیظ جالندھری ان دنوں دلّی ہی میں تھے۔ میں نے اور تو کسی سے نہیں کہا۔ ان سے کام کے بارے میں ذکر کیا۔ مگر انھیں میرے ساتھ خلوص کی کوئی وجہ نہیں تھی۔ بات

رفع دفع ہو گئی۔ دراصل اس صورت حال میں قصور میرا اپنا بھی تھا۔ میں کرنا کیا چاہتا ہوں اس کا کوئی واضح تصور میرے ذہن میں نہیں تھا۔ انھیں دنوں لاہور میں حلقۂ ارباب ذوق کا جلسہ نکل آیا۔ میراجی کی خواہش تھی اس میں شرکت کروں اور میں چلا گیا۔ الطاف گوہر کے یہاں ٹھہرا۔ الطاف گوہر سے میری پرانی پہچان تھی۔ کالج اور یونیورسٹیوں کے سالانہ تقریری مقابلوں میں لاہور سے آیا کرتے تھے میں اینگلو عربک کالج اور بعد میں علی گڑھ یونیورسٹی سے جایا کرتا تھا۔ دلی، علی گڑھ، لکھنؤ، میرٹھ، کانپور۔۔۔۔ بہت سی جگہ ملاقات ہوئی تھی۔ لاہور گیا تو بزرگوں میں صوفی غلام مصطفٰے تبسم سے ملا اور نئے لکھنے والوں میں یوسف ظفر، قیوم نظر، احمد ندیم قاسمی، ضیا جالندھری، حمید نسیم، اور بہت سے لکھنے والوں سے ملاقات ہوئی۔ حمید نسیم کو بھی میں پہلے سے جانتا تھا۔ وہ بھی لاہور سے تقریری مقابلوں میں آیا کرتے تھے۔

حلقۂ ارباب ذوق کے روح رواں اور بانی میراجی تھے۔ بہت سے لوگوں کا خیال تھا۔ ارباب ذوق کا حلقہ ترقی پسند مصنفین کے حلقہ کی ضد تھا مگر ایسا نہیں تھا۔ بنیادی فرق زاویۂ نگاہ کا تھا۔ ترقی پسند حلقہ کی نظر میں وہ تحریریں معتبر نہیں تھیں یا اہمیت نہیں رکھتی تھیں جو اشتراکی زاویہ کے تحت نہ لکھی گئی ہوں یا ان پر اشتراکی زاویہ حاوی نہ ہو۔ ادبی زاویہ نگاہ سے ان کی قدر و قیمت چاہے کچھ ہو چاہے نہ ہو۔ وہ کتنا اشتراکی تھا اور کتنی نعرہ بازی تھی میں اس بارے میں کچھ نہیں کہنا چاہتا۔ حلقۂ ارباب ذوق کی نظر میں وہ تحریریں اچھی تھیں جو ادبی اعتبار سے معیار پر پوری اتریں۔ زاویہ نگاہ چاہے جو بھی ہو۔ اس حلقہ کے لکھنے والوں کا خیال تھا۔ اگر تخلیق ادبی معیار پر پوری اترتی ہے تو وہ منفی اور انسان دشمن نہیں ہوگی۔ اور مثبت چیز ہر اعتبار سے ترقی پسند ہوتی ہے۔ میں نے پچھلے صفحوں میں کہیں ذکر کیا ہے کہ ترقی پسندی خود اپنی شکلیں بدلتی رہی ہے۔ آغاز میں ترقی پسندی کا اطلاق ان تحریروں پر ہوتا تھا جن میں کھوکھلا پن ہو اور جو انسانی زندگی کے ان گوشوں کو بے نقاب کرے جن پر لکھنا عیب میں شمار کیا جاتا ہے۔

لاہور سے واپس آکر چچا کے یہاں نیاریوں کے محلہ میں گیا تو گھر سے آنے والی خبروں میں اتنی تبدیلی پائی کہ ظہور اب ہمارے یہاں بہت نہیں آتا بلکہ سلمہ وہاں جانے لگی ہے اور اس کی ماں اور بہنوں کے یہاں گھنٹوں بیٹھتی ہے مگر میں گھر نہیں گیا۔ ایم۔ اے کے لیے علی گڑھ یونیورسٹی چلا گیا۔

جب داخلہ کے لیے علی گڑھ پہنچا دیر تو ہو گئی تھی مگر داخلہ مل گیا اچھے ہوسٹل میں جگہ نہیں ملی۔ ہوسٹل سے کافی فاصلہ پر ایک اینکسی تھی اس میں جگہ ملی۔ ایم۔ اے کے ساتھ میں نے سوچا قانون بھی پڑھ لوں اور میں نے قانون کی جماعت میں بھی داخلہ لے لیا۔ یہ جماعتیں شام کو ہوتی تھیں۔ علی گڑھ میں داخلہ کے آس پاس کا زمانہ بارشوں کا ہوتا ہے۔ میں بھیگتا ہوا جاتا اور آتا تھا۔ چھتری رکھنے سے الجھن ہوتی تھی چھتری لگا کر پڑھنے جاؤ تو ایسا لگتا ہے۔ کلرکی کرنے کسی دفتر میں جا رہے ہیں۔ کچھ دن تو میں قانون پڑھنے لگا مگر یہ گاڑی کھنچی نہیں۔ قانون چھوڑ دیا۔ سب سے بڑا سبب وہ راستہ تھا جو طے کر کے جانا پڑتا تھا۔ راستہ میں اتنی لمبی لمبی گھاس ہوتی تھی اس میں پاؤں رکھتے ڈر لگتا تھا۔ ڈر سانپ کا تھا۔

سانپ میرے لیے ہمیشہ ایک "فوبیا" بنا رہا ہے۔ شاید اس کا سبب میری ماں کا خواب ہو۔ انھوں نے ایک دفعہ مجھے بتایا، میرے پیدا ہونے سے پہلے انھوں نے ایک خواب دیکھا تھا۔ خواب یہ تھا کہ وہ اپنی گود میں ایک سانپ کھلا رہی ہیں۔ میں وہ خواب سن کر بہت انگیخت ہوا تھا۔ سانپ سے میری کہیں نہ کہیں مٹ بھیڑ ہوتی ہی رہی تھی۔ ہم جب سگھ مدرسہ میں تھے اماں ایک بار ہڑبڑا کر اٹھیں۔ اپنے سینے پر کچھ چلتا ہوا محسوس ہوا۔ انھوں نے ہاتھ مار کر ہٹا دیا۔ لالٹین جلا کر دیکھا ایک سنپولیہ تھا۔ ہم ایک بار وہیں سگھ مدرسہ میں چولہے کے پاس بیٹھے تھے۔ دیوار سے ایک دم ایک بڑا سا سانپ نکلا اور تیزی سے میری ران پر سے رینگتا ہوا نکل گیا۔ سگھ بستی میں جب ہم تھے میں اکثر ننگے پاؤں گھومتا تھا۔ ایک روز ایک کھیت میں ایک گڑھے میں پاؤں پھسل گیا۔ اس میں ایک سانپ تھا۔ میں جب چچا کے یہاں دلی میں تھا۔

اوپر مسجد کے کمرے میں جانے کہاں سے ایک سانپ آگیا اور میرے سر اوپر سے نکل گیا۔ اپنی شادی کے دو دن بعد جب میں اپنی سسرال گیا وہاں لڑکیاں چیختی ہوئی گھر سے باہر بھاگیں اندر دو سانپ لڑ رہے تھے۔ گھر میں ایک نیزہ تھا۔ میں نے ایک سانپ کو مار دیا دوسرا بھاگ گیا۔ میں نے رات کو مچھلی پکڑنے کے کانٹے میں ایک مینڈک پکڑ کر پھنسا دیا۔ صبح اٹھے تو دیکھا دوسرا سانپ کانٹے میں پھنسا ہوا تھا۔ دیہات کے گھروں میں ایسا ہوتا ہے چوہے پکڑنے کے لیے سانپ گھر میں گھس آتے ہیں۔ میری والدہ بڑی توہم پرست تھیں۔ آسیب اور جنوں پر انھیں بڑا یقین تھا۔ وہ کہتی تھیں انھوں نے جنوں سے باتیں بھی کی ہیں۔ وہ بڑی دلیر تھیں۔ اور نازک سے نازک صورتحال میں بھی نہیں گھبراتی تھیں۔ انھوں نے ایک دفعہ مجھ سے کہا سانپ کے اوپر میرا سایہ پڑ جائے گا تو وہ اندھا ہو جائے گا۔ میں پہلوٹھی کا لڑکا ہوں۔ میں نے شعوری طور پر کوشش کی کہ سمجھوں یہ سانپ کیا ہے اور کس چیز کا اعلامیہ ہے۔ خواب کی تعبیر بتانے والے کے نزدیک سانپ درازیٔ عمر کی علامت ہے۔ کہتے ہیں سانپ کی عمر بہت لمبی ہوتی ہے اور کچھ کے نزدیک جنس کا اعلامیہ ہے۔ جن دنوں میں پونا میں تھا یہ سانپ مجھ پر حاوی ہو گیا تھا۔ ایک روز میں اتنا عاجز آگیا سامنے مہاراشٹر کلب کے لان میں بہت لمبی لمبی گھاس کھڑی تھی۔ اس میں ننگے پاؤں گھس گیا۔ اور بہت دیر تک گھومتا رہا اور دل میں سانپ سے مخاطب ہوتا رہا۔ کاٹنا ہے تو کاٹ۔

ایک مرتبہ وہیں لان کے پاس ایک شیر سے بھی ملاقات ہوئی۔ ایک شام میں گھر سے باہر نکلا تو دیکھا سڑک کے کنارے ایک لمبا تڑنگا آدمی پڑا ہے۔ وہ سائیکل سے گر گیا تھا اور سڑک پر لگے ہوئے پتھر سے ٹکرا کر اس کا سر پھٹ گیا تھا اور بری طرح لہولہان تھا۔ میں قریب گیا اور پوچھا "کون ہو تم"

"میں واگ رہے" اس نے مراٹھی میں جواب دیا۔

میں نے دیکھا وہ نشہ میں دھت ہے۔ اٹھ بھی نہیں سکتا۔ کچھ اسٹوڈیو کے لڑکے میرے پاس آتے ہوئے تھے میں نے ان سے کہہ کر اسے سرکاری اسپتال بھجوا دیا۔ اور سائیکل اٹھا کر

گھر میں رکھ لی کچھ دنوں بعد اس کے رشتہ دار وہ سائیکل لینے آئے۔

"وہ شیر کیسا ہے؟" میں نے پوچھا۔

وہ ہنسنے لگے اور سائیکل لے کر چلے گئے۔

ذکر علی گڑھ یونیورسٹی کا ہو رہا تھا اور میں اپنی جھونک میں کئی سال آگے نکل گیا۔ کچھ دن بعد مجھے ماریسن کورٹ میں جگہ مل گئی اور میں اینکسی چھوڑ کر ماریسن کورٹ میں آگیا۔ آغاز میں اس ہوسٹل کو غالباً کچی بارک کہا کرتے تھے۔ یہ بہت پرانا ہوسٹل تھا باقی جیسے ایس ایس عثمانیہ، آفتاب ہال وغیرہ اس کے بعد کے تھے۔ علی گڑھ میں پذیرائی کا سبب رشید احمد صدیقی تھے۔ وہ میرے بڑے مہربان تھے۔ ان سے پہلی ملاقات یونیورسٹی کے سالانہ تقریری مقابلہ کے وقت ہوئی میں عربک کالج سے، جو بعد میں دلی کالج کے نام سے جانا گیا، اس مقابلہ میں حصہ لینے گیا تھا۔ جتنے اس طرح کے تقریری مقابلے ہوتے ہیں۔ اس میں عام جلسے بھی شامل ہیں۔ ان کی نفسیات یہ ہے کہ بولنے والے کو ایک ایسا آہنگ اور فضا پیدا کرنی پڑتی ہے کہ سننے والے کا دھیان ادھر نہ جائے۔ ایک طرح کی بے معنی لفاظی جلسوں کی جان ہوتی ہے۔ اس یونیورسٹی کے جلسے کا موضوع اقبال کا شعر تھا۔ شعر کیا تھا اب میرے ذہن سے نکل گیا ہے۔ علی گڑھ کے جلسوں کا ماحول بڑا صبر آزما اور حوصلہ شکن ہوتا ہے۔ لڑکے ایسے ایسے جملے کستے ہیں بولنے والا حواس باختہ ہو جاتا ہے۔ علی گڑھ میں پڑھنے والے لڑکوں میں ویسے بھی ایک ایسی تیزی ہوتی ہے جو دوسری یونیورسٹیوں کے لڑکوں میں نہیں ہوتی رشید احمد صدیقی کہا کرتے تھے جب میں کسی ذہین لڑکے سے ملتا ہوں اور پوچھتا ہوں کبھی علی گڑھ میں رہے ہو۔ وہ کہتا ہے "نہیں" تو میں کہتا ہوں ہائے کیسی کمی رہ گئی۔ مختصر یہ کہ جب میرے بولنے کی باری آئی تو میں نے اقبال کے وسیلہ سے بے مطلب ہی فلسفیوں کے نام گنوانے شروع کر دیے۔ میرا ایک مضمون فلسفہ بھی تھا۔ جیسے ہی لڑکے خاموش ہوئے میں نے مائکروفون ہٹا کر بولنا شروع کر دیا۔ اس واقعے کو میں اپنی طالبعلمی کے زمانے کا ایک کارنمایاں شمار کرتا ہوں۔ ایسا سناٹا کہ پن بھی گر جائے تو آواز آئے۔

رشید صاحب جج تھے۔ انھوں نے مجھے پہلا انعام دیا۔ میں ٹرافی بھی لایا کالج کیلیے۔

علی گڑھ یونیورسٹی میں داخلہ لینے گیا تو بھی پہلے ان ہی سے ملا۔ جب میں علی گڑھ گیا ہوں "گرداب" چھپ چکی تھی۔ ۱۹۴۲ء میں ادارۂ ساقی نے چھاپی تھی۔ "گرداب" کی نظموں کو سب نے پسند کیا تھا۔ ریڈیو سے نکلنے والے پرچے "آواز" میں فراق نے اس پر تبصرہ کیا تھا۔

"ایسا معلوم ہوتا ہے شاعر ناگ پھنی نگل گیا ہے"۔

یہ فراق کا ردعمل تھا۔ اس شاعری کے متعلق "گرداب" کے حقوق میں نے شاہد احمد دہلوی کو دے دیے تھے ڈیڑھ سو روپیہ میں۔ اردو کے شعبہ میں اساتذہ میں رشید صاحب کے علاوہ آل احمد سرور تھے۔ ظہیر صاحب تھے اور ابواللیث صدیقی۔ رشید صاحب تنقید پڑھاتے تھے۔ ان کی باتیں اور جملے اکثر لطیفہ بن جاتے تھے۔

"رشید صاحب صحیح تنقید کیا ہے" ایک بار میں نے پوچھا۔

"حضرت دو اور دو کتنے ہوتے ہیں؟"

"چار" میں نے جواب دیا۔

"کوئی پانچ کہہ دے تو کہیے قریب قریب ٹھیک ہے"

ان کا جواب تھا۔ ایک بار میں نے ایک اور موقع پر پوچھا۔

"تنقید کرتے وقت کس بات کا خیال رکھنا چاہیے۔

"شرافت کا" ان کا جواب تھا۔

سرور صاحب کے لکچر میں مزہ آتا تھا مگر ظہیر صاحب بہت سوجھ بوجھ کے استاد نہیں تھے۔ ان کے بارے میں لڑکوں نے ایک لطیفہ مشہور کر رکھا تھا۔ اس لطیفہ یا واقعہ میں صداقت کتنی تھی وہ میں نہیں کہہ سکتا واقعہ نقل کر دیتا ہوں۔ مشہور تھا کہ انھوں نے اپنی پی ایچ ڈی کے لیے جو مقالہ یا تھیسس لکھا تھا وہ بکری کھا گئی تھی۔ مقالہ کہاں رکھا تھا اور بکری کیسے آگئی تھی اس کی کوئی تفصیل نہیں تھی مگر وہ پی ایچ ڈی نہیں کر سکے تھے۔ اب کلاس میں کبھی کبھی یہ ہوتا تھا کوئی لڑکا شرارتاً بکری کی آواز

نکالتا تھا۔ ظہیر صاحب پوچھتے یہ بکری کہاں سے آگئی اور کوئی لڑکا جواب دیتا تھا
" سر یہ وہ بکری ہے جو تھیسس کھا گئی تھی"۔

کبھی کبھی یہ جواب لڑکے "یک زبان" ہو کر دیتے تھے۔ سوجھ بوجھ کا لفظ میں نے ان کے لیے اس لیے استعمال کیا کہ ایک بار انھوں نے مجھ سے پوچھا "رنگِ افق پر جھومتا" کیا ہوتا ہے۔ اس جملے کا پس منظر میری نظم "پگڈنڈی" تھی اس کا ایک مصرع ہے۔

ع جیسے یوں ہی بڑھتے بڑھتے رنگ افق پر جا جھومیگی

میں نے جواب دیا "کبھی فرصت سے بیٹھیں گے تو عرض کروں گا"۔ مگر ابواللیث صدیقی صاحب کے ساتھ جو واقعہ پیش آیا اس کی وجہ میں کبھی نہیں سمجھ پایا۔ اس میں میرا جواب تو ٹھیک تھا۔ مگر ان کے سوال کا کوئی سر پیر نہیں تھا۔ وہ استاد تھے میں طالب علم میری ہدایت کے لیے کچھ کہتے تو سمجھ میں آنے والی بات تھی مگر مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے ان کا رویہ معاندانہ ہے۔ مجھ سے مخاطب ہو کر بولے:

"کیا تمھاری شاعری کو کلاسیکی شاعری کہا جا سکتا ہے"؟

انھوں نے میری شاعری کے بارے میں کبھی کوئی بات نہیں کی تھی۔ نہ ان کے میرے درمیان اس موضوع پر کوئی تبادلۂ خیال ہوا تھا۔ میں نے ایک طالب علم کی طرح ان سے کہا ـــــ

" ابواللیث صاحب میرے جواب سے پہلے کیا یہ جان لینا ضروری نہیں کہ کلاسیکی شاعری کیا ہوتی ہے اور اس کی تعریف کیا ہے؟"

" جیسے فاؤسٹ" انھوں نے جواب دیا۔

"تعریف نہیں یہ تو مثال ہے" میں نے جواب دیا۔

انھوں نے برجستہ کہا، "میرا مطلب ہے ... جیسے ڈیوائن کامیڈی'

"یہ دوسری مثال ہے تعریف پھر نہیں ہوئی" میں نے کہا۔

اس مرتبہ انھوں نے دونوں ہاتھوں کی پہلی انگلیوں کو ملا کر ہوا میں نصف دائرہ بنایا۔ یہ کہتے ہوئے۔

"کلاسیکی شاعری سے میری مراد ہے"

"یہ نصف دائرہ ہے میں نے کہا تعریف پھر نہیں ہوئی"

اس مرتبہ انھوں نے جواب میں اپنی ان ہی انگلیوں سے خلا میں پورا دائرہ بنا دیا۔ میں بھی اڑا رہا۔

"یہ پورا دائرہ ہے۔ تعریف بتائیے کیا ہے؟"

انھوں نے جواب میں اپنی کاپیاں اٹھائیں اور کلاس چھوڑ کر چلے گئے۔ اس کے بعد سے آج تک ان سے ملاقات نہیں ہوئی۔ پچھلی بار جب کراچی گیا تھا۔ ڈاکٹر جمیل اختر نے مجھے یونیورسٹی میں مدعو کیا تھا۔ لیث صاحب آجکل وہاں پڑھاتے ہیں۔ سوچا تھا وہ مل گئے تو پوچھوں گا، اب تو کلاسیکی شاعری کی تعریف بتا دیجیے۔ مگر وہ اس روز یونیورسٹی آئے نہیں تھے۔

رشید صاحب کو اس واقعہ کا علم ہوا تو انھوں نے مجھ سے کہا "آپ کی حاضری لگ جایا کرے گی پڑھائی کمرہ پر کیجیے۔ کتابیں لائبریری سے لے لیا کیجیے"۔ رشید صاحب مجھ پر بہت مہربان تھے۔ کئی بار اشارتاً کہہ چکے تھے۔ ایم۔ اے کر لینے کے بعد مجھے وہ یونیورسٹی ہی میں لے لیں گے اور اپنے مستقبل کی طرف سے میں ایک حد تک بے فکر ہو گیا تھا کہ اچانک ایک واقعہ ایسا ہوا کہ میں بد دل ہو گیا۔ بیگم راس مسعود علی گڑھ آئی ہوئی تھیں اور نواب چھتاری کے یہاں قیام تھا۔ ایک روز رشید صاحب نے کہا بیگم راس مسعود ملنا چاہتی ہیں جاؤ مل آؤ۔ میں چلا گیا۔ بیگم صاحبہ بہت دیر تک باتیں کرتی رہیں میں ایک بار پہلے بھی ان سے علی گڑھ ہی میں مل چکا تھا۔ چلتے وقت انھوں نے مجھے پچاس روپے دیے۔ مجھے یقین تھا رشید صاحب نے میرے بارے میں ان سے کچھ کہا ہوگا۔ انھوں نے خوش نیتی سے کہا ہوگا مگر اس واقعہ کے بعد میں علی گڑھ سے بد دل ہو گیا۔ یہ واقعہ تو صرف محرک تھا۔ بد دلی کا سبب میرے حالات تھے۔

سلطانہ سے ملنے کے لیے ہر تھوڑے تھوڑے دن بعد دلّی تو جاتا ہی تھا مگر اس میں مالی حالات کو بھی دخل تھا اور شاہد صاحب اس مشکل میں کام آتے تھے۔

اس کے علاوہ میں کچھ ایسا بھی سوچنے لگا تھا کہ درس و تدریس کا پیشہ تحقیقی کام کرنے والوں کے لیے ٹھیک ہے تخلیقی کام کرنے والوں کے لیے بندش ہو جاتی ہے۔ وہی سبق پڑھاتے پڑھاتے اور ایک ہی بات کو ہر جماعت کے ساتھ ساتھ دہراتے دہراتے ذہن محصور ہو کر رہ جاتا ہے۔

علی گڑھ کی زندگی ویسے کچھ بری نہیں تھی۔ دوپہر کا کھانا ہم کئی دوست مل کر کھاتے۔ ذکی میرے ایک ہم جماعت تھے۔ کانپور کے رہنے والے۔ وہ مشتاق یوسفی آغا، ایک بلوچستان کا لڑکا اور ایک دو اور ـــــ ہم سب اپنا اپنا کھانا عثمانیہ میں منگا لیتے تھے۔ اور مل جل کر کھا لیتے تھے۔ ساتھ تھوڑی گپ بھی ہو جاتی تھی۔ شام کا کھانا اطہر پرویز اور صدیقہ بیگم کے ساتھ کھاتا تھا۔ میں اکثر شام کو وہیں چلا جاتا تھا۔ اس وقت وہ عثمانی کے نام سے جانے جاتے تھے۔ میرے آنے کے بعد اپنے کو اطہر پرویز لکھنے لگے تھے۔ موریس کورٹ میں میرے ساتھ سلیگوڑی کے ایک صاحب رہتے تھے۔ بہت مزیدار آدمی تھے۔ چائے کا بہت شوق تھا مگر ان کے پاس کچھ نہیں تھا۔ اکثر آکر پوچھتے تھے:

"پارٹنر چائے پیو گے"؟

میں آمادگی ظاہر کرتا تھا تو پھر جاتے تھے اور کہیں سے کوئلہ کہیں سے دودھ شکر اور کہیں سے انگیٹھی اور چائے کی پتی لے کر آتے تھے۔ اور چائے بنا کر خود بھی مزے سے پیتے تھے۔ اور پلاتے تھے۔ اس چائے میں جو مزہ ہوتا تھا وہ آج کی چائے میں نہیں ہوتا۔ انھیں دنوں ایک بار مجھے روپے کی سخت ضرورت ہوئی۔ دوستوں سے مانگنا میں بالکل اچھا نہیں سمجھتا تھا۔ بہت دیر سوچتا رہا کیا کروں۔ پھر ایک ترکیب سمجھ میں آگئی۔ جتنی ٹرافیاں اور کپ مجھے انعام میں ملے تھے۔ سب اکٹھا کر کے لے گیا اور ایک صراف کی دکان پر لے جا کر بیچ دیے ابھی پیسے لے ہی رہا تھا کہ پیچھے سے میرے ایک ہم جماعت بڑھ کر آگے آئے اور وہ سارے انعامات صراف سے لے لیے۔ ان کا نام نبی حیدر تھا بگڑ کر کہنے لگے یہ کیا کر رہے ہو۔ جلد کیا چاہیے میں دونگا۔

جانے کیسے انھیں پتہ چل گیا تھا میں چیزیں لے کر صرافے میں گیا ہوں۔ ایک دوست میرے مستنظر زیدی تھے۔ وہ بھی میرے ساتھ ہی پڑھتے تھے۔ پڑھتے کم تھے شکار میں زیادہ رہتے تھے۔ احمد عباس کے خاندان سے تھے۔ ان کی بہن صابرہ، ساجدہ اور زاہدہ زیدی بھی علی گڑھ ہی میں تھیں۔ مستنظر تو اب حیات نہیں مگر ان کی ساری بہنوں سے آج بھی ویسے ہی مراسم ہیں۔ صابرہ بھی اللہ کو پیاری ہوگئیں۔ ساجدہ اور زاہدہ علی گڑھ میں ہیں۔

ایم۔ اے کا پہلا سال پورا کرتے کرتے ۴۴ء آگیا۔ نتیجہ آیا تو معلوم ہوا میرے نمبر بہت آئے ہیں۔ اوّل آیا ہوں۔ بڑا سکون ہوا۔ انھیں دنوں حیدرآباد میں ایک ادبی کانفرنس منعقد ہو رہی تھی اور آل احمد سرور کے ساتھ اور بھی کچھ اساتذہ جا رہے تھے۔ سرور صاحب نے کہا لڑکوں کی طرف سے تم چلو اور اس میں شرکت کے لیے حیدرآباد چلا گیا۔

باب (۱۰)

۱۹۴۵ء کی حیدرآباد اردو کانفرنس بہت بڑے پیمانے پر ہوئی. اس پر ترقی پسندوں کا غلبہ تھا۔ غالباً اس کے محرک ہی وہ تھے. کانفرنس میں کیا کیا قرار دادیں پاس ہوئیں اور ان پر کتنا عمل ہوا اس کا ذکر میں یہاں نہیں کرنا چاہتا. وہ سب اس وقت میرے حافظہ میں بھی نہیں صرف ایک تجویز کا ذکر کرنا چاہتا ہوں اور وہ حلقۂ ارباب ذوق کے خلاف تھی. حلقہ کے بانی اور روحِ رواں میراجی تھے۔

اس وقت کے لکھنے والوں کے دو بڑے گروہ بن گئے تھے یا بنا دیے گئے تھے. ایک حلقہ ارباب ذوق سے متعلق تھا اور دوسرا ترقی پسند کہلاتا تھا. ترقی پسند لکھنے والے اشتراکی تحریک سے جڑے ہوئے تھے ان میں کتنے واقعی اشتراکی تصوّر حیات کے قائل تھے اور کتنوں نے محض وہ لبادہ اوڑھ لیا تھا میں اس بحث میں بھی نہیں پڑنا چاہتا صرف ان کے بنیادی فرق کی طرف اشارہ کرنا چاہتا ہوں۔ ترقی پسندی کے ذیل میں وہ تحریریں آتی تھیں جو اشتراکی زاویہ سے لکھی گئی ہوں یا کم سے کم اشتراکی نعرہ ضرور ہو۔ اس گروہ کے لوگ یا لکھنے والے عوام کے واقعی کتنے فلاح چاہنے والے تھے۔ اس بارے میں بھی کچھ نہیں کہوں گا. حلقۂ ارباب ذوق کے پاس ایسا کوئی نعرہ نہیں تھا۔ ان کا کہنا صرف اتنا تھا کہ ہر ادبی تخلیق کو پہلے ادبی ہونا چاہیے۔ یا اچھے ادب کے ذیل میں آتی ہو۔ اس میں کوئی نعرہ ہے یا نہیں، وہ ثانوی بات ہے۔ اپنے اسی رویّہ کے تحت ترقی پسندوں نے حلقہ سے متعلق لکھنے والوں کو کبھی قابل اعتنا نہیں سمجھا بلکہ اس ۱۹۴۵ء کی کانفرنس کو بھی رجعت پسند اور زوال پرست کہا۔ اس کے برعکس حلقۂ ارباب ذوق نے کبھی ایسا نہیں کیا۔ اردو شاعری کے انتخاب کا وہ ہر سال ایک مجموعہ شائع کرتے تھے اس میں

جوش کی نظمیں بھی انتخاب ہوتی تھیں اور رشاد عارفی کی بھی۔ اس میں کبھی غلطی سے بھی ترقی پسند اور غیر ترقی پسند کی تخصیص نہیں برتی گئی۔

ترقی پسندوں کے اس رویّہ کا سبب غالباً وہ خوف تھا جس کا شکار وہ برسوں تک رہے اور تھوڑے بہت آج بھی ہیں۔ وہ ادب میں اپنی اجارہ داری چاہتے تھے ان کی مہر تصدیق کے بغیر کسی تخلیق کو قبول عام حاصل نہ ہو۔ مگر ایسا نہیں ہو سکا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جتنے اچھے اور معتبر لکھنے والے تھے وہ ترقی پسند حلقہ سے باہر ہو گئے دوسرے اور تیسرے درجہ کے لکھنے والے ترقی پسندی کے نعرے سے جڑے رہے اور انجام کاران کا زور بھی ختم ہو گیا اور ترقی پسند تحریک کا وقار بھی۔

دوسری وجہ وقار اور اعتبار ختم ہونے کی یہ بھی تھی کہ وہ ادیب جو خود کو ترقی پسند کہتے تھے انھوں نے ادب میں دیانت داری سے کام نہیں لیا۔ اور اشتراکی محاذ کو اپنی ذات کی توسیع اور اپنی شہرت کے لیے استعمال کیا اور تیسری بڑی وجہ اس تحریک کے بے جان ہونے کی یہ تھی کہ جہاں ترقی پسندوں نے بڑے لکھنے والوں کو نظر انداز کیا تھا وہاں اپنی تعداد بڑھانے کے لیے ان کو بھی سراہنا شروع کر دیا تھا جو نثر میں اچھی صحافت کے معیار پر بھی نہیں آتے تھے۔ اور شاعری میں "موزوں گو" سے زیادہ انھیں اور کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا۔ ادبیت میں ادبیت کم تھی روس کی عمارتوں اور روس کی لیڈروں کی مدح خوانی زیادہ۔ روس کے ادیبوں اور شاعروں کے علاوہ روسی باہر کے لکھنے والوں کو قابل اعتنا نہیں سمجھتے تھے۔ صرف اپنا آلہ کار بناتے تھے۔ اپنے شاعروں کو سنوارتے تھے۔ باہر سے آنے والوں کو صرف ووڈکا پلاتے تھے اور خوب مہمان نوازی کرتے تھے۔

۱۹۶۷ء میں جو افریقی ایشیائی ادیبوں کی کانفرنس بیروت میں ہوئی تھی۔ اس میں ملک راج آنند، امرت رائے بچن، اور سجاد ظہیر کے ساتھ میں بھی تھا وہاں روسی مندوبین دوسروں کے ساتھ برابر کا سلوک نہیں کرتے تھے۔ وہ کرسیاں جو انھوں نے اپنے لیے وقف کر لی تھیں۔ ان پر کسی اور کو نہیں بیٹھنے دیتے تھے۔

کوئی بیٹھ جائے تو اٹھا دیتے تھے۔ وہاں تو شاعری بھی نہیں سنی گئی۔ افتو شینکو کے علاوہ اور کسی نے نہیں پڑھا یا پڑھوایا گیا۔ اس کی نظمیں عربی اور انگریزی میں ترجمہ کر کے بانٹ دی جاتی تھیں پھر وہ انھیں اپنی زبان یعنی روسی میں سناتا تھا مجھے اپنے ساتھیوں کا رویہ بھی وہاں قابل ستائش نہیں لگا۔

اس کانفرنس کا بڑا مقصد یہ تھا کہ فلسطینیوں کی حمایت میں کچھ کہا جائے۔ اس لیے ہمیں بیروت دکھانے کے بعد دمشق لے جایا گیا۔ اور ان فلسطینی مہاجروں کے کیمپ دکھائے جو ملک بدری کی زندگی گزار رہے تھے۔ اس کے علاوہ جلسہ کی کارروائی میں یہ بھی شامل تھا کہ ہر ملک سے آنے والے نمائندے اپنے اپنے ملک کے ادب کی ایک رپورٹ پیش کریں جس سے اندازہ ہو سکے اس کا ادبی رجحان کیا ہے اس کا سارا بوجھ ملک راج اور سجاد ظہیر نے امرت رائے بچن پر رکھ دیا۔ نتیجہ یہ ہوا نہ ہمارے ملک کے ادب کا بھرپور جائزہ لیا گیا اور نہ فلسطینیوں اور عربوں کی حمایت میں کچھ کہا گیا۔ جتنے ملکوں کے نمائندے آئے تھے وہ ہندوستان کی طرف سے مایوس بھی ہوئے اور بدظن بھی۔ خاص طور پر فلسطین اور عرب ممالک کے لوگ۔

ہم وہاں فی نیشیا ہوٹل میں ٹھہرے ہوئے تھے۔ اندازہ تو سب ہی کو ہو گیا تھا کہ کانفرنس میں ہندوستان والوں کے رویہ کو نہیں سراہا گیا۔ واپس ہوٹل میں آکر سب اکٹھے ہوئے اور جائزہ لینے لگے کہ ہم نے کہاں غلطی کی اور کیا غلطی کی سب کچھ نہ کچھ کہتے رہے۔ بنے بھائی نے مجھ سے پوچھا تم کیوں چپ ہو کچھ بولو۔ میں نے کہا بنے بھائی ملک کی نمائندگی کے وقت نظریہ کا خیال رکھا جائے گا تو یہی ہوگا نہ ملک کا بھلا ہوگا نہ نظریہ کا۔

"کیا مطلب ہے تمھارا؟"

میں نے کہا بچن تو خیر ہندی کے آدمی ہیں اردو کے تمام موجودہ رجحانات سے واقف نہ ہوتا کوئی ایسی بات نہیں مگر آپ تو اردو کے آدمی ہیں مگر اشتراکی ادیبوں شاعروں کے علاوہ آپ کسی کا ذکر کرنا پسند نہیں کرتے۔ ایسا نہیں کہ آپ

منٹو، بیدی، راشد، میراجی وغیرہ سے واقف نہیں مگر جب ان کا نام لینے یا نہ لینے کو آپ اصول بنالیں گے تو ادب کی نمائندگی کیسے کریں گے؟ جن ادیبوں کا ذکر آپ کرتے ہیں وہ واجبی ہیں۔ ہندوستان کی پوری تصویریں آپ کے ذہن میں صاف نہیں تو آپ پیش کیا کریں گے؟ میری باتیں سن کر کوئی خوش نہیں ہوا۔ بیروت کے شیوخ کے یہاں دعوتیں بھی کھا چکے تھے۔ دمشق کی تاریخی عمارتیں بھی دیکھ چکے تھے۔ دو تین دن بعد ہم سب ماسکو چلے گئے۔

ماسکو میں بھی وہی رویہ روا رکھا گیا۔ ہم نے مختلف دعوتوں میں شرابیں پیں۔ روسی لکھنے والوں کو ستا اور خالی وقت میں کٹھ پتلی کا تماشا دیکھا۔ ملک راج اور سجاد ظہیر کے اپنے دوست تھے وہ ان کے ساتھ مصروف ہوگئے۔ میں نے ایک ایسی گائیڈ کے ساتھ جو اردو بولتی تھی وہاں کی قابل ذکر جگہیں دیکھیں۔ ماسکو یونیورسٹی گیا۔ وہاں کچھ پہچان کے لڑکے مل گئے ان سے باتیں کیں۔ ایک شام علی یاور جنگ مل گئے ان کے ساتھ گپ رہی۔ وہ ہندوستان کی باتیں کرتے رہے وہاں کے عجائب گھر اور قدیم و جدید مصوروں کی تصویریں دیکھیں۔ بالشویک تھیٹر بھی دیکھا کون سا ڈرامہ تھا اس وقت ذہن میں نہیں۔ ماسکو سے نپٹ کر لینن گراڈ چلا گیا۔ وہاں کے عجائب گھر دیکھے جہاں لینن کام کرتے تھے۔ اور رہتے تھے وہ جگہ دیکھی۔ کچھ اسٹیج شو اور تھیٹر دیکھے اور ماسکو واپس آکر لندن چلا گیا۔

لندن میں محمد علی منصوری تھے۔ انھوں نے ایک جرمن لڑکی ارما سے شادی کرلی تھی اور وہیں مقیم ہوگئے تھے۔ لندن میں کچھ کالج کے ساتھی بھی مل گئے۔ تھوڑا وقت ان کے ساتھ گزارا۔ لندن میوزم اور لائبریری گیا۔ تھیٹر کے ٹکٹ نہیں مل سکے۔ ایک اچھی فلم چل رہی تھی۔ وہ دیکھی اور پیرس چلا گیا۔ وہاں اس وقت پہچان کا کوئی آدمی نہیں تھا۔ لندن ہی سے ایک ہوٹل کا پتہ لے کر کمرہ طے کرلیا تھا۔ سیدھا وہیں گیا۔ شہر کی سیر کی۔ تاریخی عمارتیں اور کچھ شاہی محلات جو شہر سے باہر تھے وہاں گیا۔ لوور دیکھنے میں تقریباً پورا دن لگا دیا۔ اس کے بعد پیرس سے قاہرہ چلا گیا۔ قاہرہ میں کلیم اللہ تھے۔

وہ بیروت بھی آئے تھے۔ پارٹی کے ممبر تھے۔ ان سے بیروت ہی میں طے ہوگیا تھا۔ پتہ لے لیا تھا۔ ان کے پاس ٹھہرا۔ ان کے گھر کے قریب ہی ایک تھیٹر تھا۔ وہاں ایک یونانی رقاصہ کا ناچ دیکھا۔ پیرس کے ایک نائٹ کلب میں بھی گیا تھا۔ دو تین دن کلیم اللہ کے پاس رہ کر نئے پرانے مصر کی سیر کی۔ اہرام دیکھے سفنکس کے پاس کھڑے ہو کر تصویر کھنچوائی اور ہندوستان واپس آگیا۔

ذکر تھا ۴۴ء کی حیدرآباد کانفرنس اور میرے ردِعمل کا مگر اسی رو میں آپ کو میں نے بیروت ۶۷ء میں ہونے والی کانفرنس کا ردعمل بھی بتا دیا اور لندن پیرس اور قاہرہ بھی گھما لایا۔ دکھایا کچھ خاص نہیں مگر ۶۷ء کی کانفرنس کا ذکر کہیں تو کرنا تھا اس رو میں یہ ہو گیا۔ کچھ بُرا نہیں ہوا۔ حیدرآباد کانفرنس کے بعد میں فوراً وطن نہیں گیا بمبئی آگیا۔ بمبئی میں مدھوسودن تھے۔ ان کا پتہ میرے پاس تھا۔ ان سے ملا۔ وہ بھی فلموں سے متعلق تھے۔ ان ہی دنوں کئی لکھنے والے فلموں میں آ گئے تھے۔ شاہد لطیف بمبئی ٹاکیز میں تھے کرشن چندر اور جوش صاحب شالیمار پکچرس سے وابستہ تھے۔ میری دونوں سے رسم و راہ تھی۔ دو روز کے لیے پونا چلا گیا۔ وہاں میرے دوست نسیم الظفر کے والد ملک حبیب احمد بھی تھے۔ وہ بھی شالیمار ہی میں منیجر تھے۔ میں پونا میں ان کے پاس ٹھہرا۔ ان کے ذریعہ شالیمار کے مالک ڈبلیو۔ زیڈ۔ احمد سے ملاقات ہوئی۔ احمد بہت سلجھے ہوئے اور پڑھے لکھے آدمی تھے۔ میری کتاب "گرداب" ان کی نظر سے گزری تھی۔ شالیمار گیا تو جوش اور کرشن چندر سے بھی ملا۔ باتوں باتوں میں احمد صاحب نے پوچھا میں کیا کر رہا ہوں میں نے بتا دیا۔ انھوں نے مجھے شالیمار میں کام کرنے کی دعوت دی اور ڈیڑھ سو روپے مشاہرہ کی پیش کش کی۔ یہ کوئی بہت اچھی پیشکش نہیں تھی مگر علیگڑھ سے علی گڑھ کیا، اپنے حالات ہی سے تنگ آگیا تھا۔ احمد صاحب نے مزید کہا انھیں میرا کام پسند آیا تو تنخواہ بڑھا دیں گے اور میں شالیمار پکچرس میں کام کرنے کے لیے تیار ہو گیا۔ اور شالیمار کے قلمکار شعبہ سے متعلق ہو گیا۔ میں نے اس کے بعد والدہ کو لکھ دیا کہ میں علی گڑھ سے پونا آگیا ہوں۔ کچھ دن بعد ان کا ایک خط ملا جس میں انھوں نے

سلمہ کی بہت شکایت لکھی تھی۔ میں نے سوچا میرا فاصلہ تو گھر سے بڑھتا ہی جا رہا ہے۔ شالیمار سے کچھ دن کی چھٹی لے کر دلی آیا۔ اماں کو خط لکھ کر دلی بلایا۔ جس روز دلی آئیں میں راؤ کھیڑی چلا گیا۔ صورت حال یہ تھی کہ سلمہ سے شکایتیں ہونے کے باوجود کوئی طلاق کے حق میں نہیں تھا۔ میرے والد بھی ان دنوں وہیں تھے۔ میں نے ان سے بھی کوئی مشورہ نہیں کیا۔ ظہور کو بلایا اور پوچھا وہ سلمہ سے شادی کے لیے تیار ہے؟ اس نے رضامندی ظاہر کی۔ سلمہ نے بھی صاد کیا۔ میں نے ایک وکیل بلوایا۔ ظہور ہی لے کر آیا۔ طلاق کے کاغذات بنوائے اور جو سلمہ کا سامان اور زیور تھا دے کر رخصت کر دیا۔ وہ ظہور کے ساتھ اس کے گھر چلی گئی۔ میرے رشتہ داروں میں والد سمیت کوئی اس بات سے خوش نہیں ہوا۔ میں نے بعد میں سنا سلمہ کے والدین بھی اس سے ناخوش ہو گئے۔ شکایت یہ تھی کہ طلاق ہو گئی تھی تو ماں باپ کے گھر کیوں نہیں آئیں۔ ظہور احمد کے یہاں کیوں گئیں۔ اب تو ظہور اور سلمہ دونوں ہی اس دنیا میں نہیں۔ خدا ان کی روح کو مغفرت عطا کرے۔

باب (۱۱)

۴۴ء کی حیدرآباد کانفرنس کے بعد میں دلّی یا نجیب آباد جانے کی جگہ بمبئی آ گیا۔ میں پہلے کہیں یہ بات کہہ چکا ہوں کہ میرا کوئی کام سوچا سمجھا نہیں ہوتا۔ بیٹھے بیٹھے ایک رو آتی ہے اور پھر جدھر اللہ لے جائے چل پڑتا ہوں۔ بمبئی جانے کی وجہ مدھوسودن تھے۔ یہ دلّی میں بارہ دری شیر افگن خاں میں میرے ہمسائے تھے۔ اس کے بعد وہ ہمسائیگی دوستی میں بدل گئی تھی۔ جو ابھی تک اسی طرح قائم تھی۔ ان کے بڑے بھائی سری سریواستو فلم سے متعلق تھے۔ کیمرہ مین تھے۔ عکاسی کے شعبے سے متعلق۔ اس نسبت سے یہ پہلے لاہور گئے۔ اس کے بعد جب ان کے بھائی بمبئی آئے تو یہ بمبئی آ گئے۔

مدھوسودن کو طالب علمی کے زمانے میں لکھنے پڑھنے کا بہت شوق تھا۔ افسانے لکھا کرتے تھے۔ "اجالے سے پہلے" ان کی کہانیوں کا ایک مجموعہ یا انتخاب بھی چھپا تھا۔ بمبئی آکر یہ فلموں کے لیے کہانیاں اور منظرنامے لکھنے لگے تھے۔ کئی فلمیں ڈائرکٹ بھی کیں۔ میں کچھ دن ان کے پاس رہا پھر پونا چلا گیا۔ پونا میں کرشن چندر تھے، جوش تھے، ساغر نظامی تھے۔ تینوں ایک فلم کمپنی "شالیمار پکچرس" سے وابستہ تھے۔ میں گیا تو کرشن چند کے پاس تھا۔ مگر وہاں جا کر معلوم ہوا کہ ملک حبیب احمد بھی شالیمار میں منیجر کی حیثیت سے کام کر رہے ہیں۔ ملک حبیب احمد کو میں دلّی سے جانتا تھا۔ اور ان کے گھر بھی بہت آنا جانا تھا۔ ملک صاحب کا منجھلا لڑکا ملک نسیم الظفر میرے ساتھ کالج میں تھا۔ وہ میرا ہم جماعت تو نہیں تھا مگر میرے قریبی دوستوں کے حلقے میں تھا۔ نسیم الظفر ہی کے ہم جماعت جمیل الدین عالی اور رضی الرحمٰن بھی تھے۔ ایک روز ملک صاحب کے ساتھ میں شالیمار گیا۔ کمپنی کے مالک اور ڈائرکٹر پروڈیوسر کا نام وحیدالدین زیڈ احمد تھا۔ ملک صاحب مجھے باہر بٹھا کر خود زیڈ احمد سے ملنے چلے گئے۔ میں بیٹھا سوچتا رہا۔ اب

آتے ہیں کہ جب۔ شاید انھیں احمد صاحب سے میرے بارے میں کچھ کہنے کی ہمت نہ پڑی۔ میں اٹھ کر جانے والا تھا کہ کرشن چندرآ گئے۔

"ارے تم کب آئے ؟" انھوں نے مجھے وہاں دیکھ کر پوچھا۔

" ایک روز قبل" میں نے بتایا۔

" تو باہر کیوں بیٹھے ہو۔ اندر آؤ"

میں کرشن چندر کے ساتھ اندر احمد کے دفتر میں گیا۔ احمد بڑے نستعلیق آدمی تھے۔ بڑی محبت سے ملے۔ ان دنوں میری پہلی کتاب "گرداب" چھپ چکی تھی شاید ان کی نظر سے بھی گزری تھی۔ ان کی باتوں سے اندازہ ہوا کہ انھوں نے مجھے رسائل میں پڑھا تھا۔ جو لکھنے والے زیڈ احمد نے بلا کر رکھے ہوئے تھے جیسے کرشن چندر ساغر نظامی، جوش ملیح آبادی اور ایک ہندی کے شاعر تھے۔ بھرت ویاس' اس سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ ایسے لوگوں کو فلمی صنعت میں داخل کرنا چاہتے تھے جو باقاعدہ ادیب و شاعر ہوں۔ ایک دو ملاقاتوں کے بعد زیڈ احمد نے پوچھا میں اب کیا کر رہا ہوں۔ میں نے بتا دیا واپس علی گڑھ جاؤں گا۔ آگے کچھ پڑھوں لکھوں گا۔ انھوں نے برسبیل گفتگو کہا فلم میں اچھے لکھنے والوں کی بڑی گنجائش ہے۔ میں فلموں میں لکھنے لکھانے کے لیے تو نہیں آیا تھا۔ یہ درست مگر یہ بھی درست تھا کہ علی گڑھ میں جو زندگی میں جی رہا تھا۔ اس سے بہت خوش نہیں تھا۔ آگے بڑھنے کے لیے کوئی دروازہ ہی نہیں کھل رہا تھا۔ بالکل ایک غیر یقینی کی کیفیت تھی۔ احمد صاحب نے تو سرسری طور پر بات کہی ہوگی۔ مگر میں دو دِلا ہو گیا۔ اور فلم میں کام کرنے کی نیت ظاہر کی۔ احمد صاحب نے تنخواہ صرف ڈیڑھ سو روپے کہی۔ مگر وعدہ کیا انھیں میرا کام پسند آیا تو اور بڑھا دیں گے۔ اور میں شالیمار پکچرس میں کام کرنے کے لیے تیار ہو گیا۔

ان دنوں جب میں "شالیمار پکچرس" سے متعلق ہوا وہاں "من کی جیت" بن رہی تھی۔ بن کیا رہی تھی مکمل ہو گئی تھی۔ اس فلم کے مکالمے کرشن چندر نے لکھے تھے۔ اور گانے جوش اور بھرت ویاس نے۔ "من کی جیت" کے اہم اداکار شام چڈھا، نینا اور تیواری تھے۔

شام چڑھتا ہیرو تھا۔ نینا ہیروئن۔ ان کا اپنا نام شاہدہ تھا۔ شیخ عبداللہ جو علی گڑھ میں لڑکیوں کے کالج کے بانی تھے۔ ان کے بڑے بیٹے محسن عبداللہ سے ان کی شادی ہوئی تھی۔ اس فلم کے فوری بعد جو فلم شروع ہونے والی تھی اس کا نام "غلامی" تھا۔ یہ پروپیگنڈہ فلم تھی۔ رینو کا اس فلم کی ہیروئن تھی۔ مسعود پرویز ہیرو تھے۔ رینو کا کا اپنا نام خورشید تھا۔ یہ شاہدہ یعنی نینا کی نند تھیں۔ شیخ عبداللہ کی بیٹی۔

احمد صاحب نے وہ فلم لکھنے کے لیے میرے حوالے کی۔ مکالموں کے علاوہ میں نے اس فلم کے دو گانے بھی لکھے۔ ایک ہیروئن کا گانا تھا

"جاگیں، رگ رگ میں جاگی امنگیں"

جو دراصل میری ایک نظم تھی۔ ایک کہانی اور ایک اوپیرا تھا جس میں آزادی کے لیے بھی ہندوستانیوں کی جدوجہد دکھائی گئی تھی۔ اس نظم کو احمد صاحب شیڈو پلے کی شکل میں پیش کیا۔ تیرہ منٹ کا اوپیرا تھا۔ "غلامی" شروع کرنے کے فوراً بعد "من کی جیت" کی نمائش کے لیے بمبئی گئے۔ وہ سبھی لوگ تھے جنھوں نے "من کی جیت" میں نمایاں حصہ لیا تھا۔ میں بھی گیا۔ فلم ریلیز ہوئی تو لوگوں نے بہت پسند کی۔ تیواری کا رول خاص طور پر اور جوش اور بھرت ویاس کے گانے بھی۔ احمد صاحب بہت خوش تھے اس کامیابی پر طے پایا کسی اچھی جگہ چل کر کھانا کھائیں۔ شاہدہ کہنے لگیں تاج محل ہوٹل چلیں مگر ایک قباحت آن پڑی۔ ان دنوں خاص طور پر کالے ڈنر سوٹ کی قید تھی۔

"اختر الایمان کیا کریں گے؟" اس لیے کہ میں اپنے روزمرہ کے کپڑوں میں تھا۔ وہی سفید کرتا پاجامہ۔ شیروانی تک نہیں تھی۔ میں نے احمد صاحب کی مشکل حل کی اور کہا احمد صاحب میں پاجامہ پہنے رہوں گا، کرتا اتاروں گا۔" سب ہنسنے لگے اور تاج کی جگہ کہیں اور کھانا کھایا۔

بمبئی سے واپس آکر "غلامی" میں مصروف ہو گئے۔ فلم کے دوران ایک دن رینو کا (خورشید) نے شوشہ چھوڑا "بھنگ نہیں کھائی ہم نے کبھی۔ کیا خیال ہے کھائی جائے۔"

مجھے بھنگ کا کوئی تجربہ نہیں تھا۔ بہت سے لڑکے لڑکیاں شوٹنگ میں موجود تھے۔ شیریں نام کی ایک لڑکی بھی تھی۔ غالباً پارسی، اس نے کہا میں کھلاؤں گی۔ اگلے

روز وہ بھنگ کی بہت سی پکوڑیاں پکوا کر لے آئی۔ ایک کمرہ لکھنے والوں کے لیے مخصوص تھا۔ میں کرشن چندر، بھرت ویاس وغیرہ اکثر وہیں بیٹھتے تھے۔ شیریں نے وہ پکوڑیاں لاکر اس کمرے میں رکھ دیں اور مجھ سے اصرار کر کے کہا کسی کو نہ بتاؤں اس میں بھنگ ہے۔ میں نے نہیں بتایا بلکہ یہ ثابت کرنے کے لیے کہ پکوڑیاں بہت اچھی ہیں۔ ہر آنے والے کے ساتھ دو چار کھاتا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وقفے وقفے سے ہنسی کے دورے پڑنے لگے۔ اس روز کہانی پر احمد کے ساتھ نشست تھی۔ تب تک رامانند ساگر بھی شالیمار سے متعلق ہو گئے تھے۔ وہ وقتی طور پر کرشن چندر کے ساتھ ٹھہرے ہوئے تھے۔ اب ایک ایک سے کہہ رہے ہیں احمد صاحب، لیکن وہ نشست نہیں ہو سکی۔ کوئی ان کے پاس نہیں گیا۔ ساگر گئے مگر بجائے کچھ کہنے کے بار بار احمد کا چشمہ اٹھا کر جیب میں رکھ لیتے تھے۔ اور احمد لے کر میز پر رکھ دیتے تھے۔ یہ کہہ کر :

"یہ میرا چشمہ ہے بھائی"۔

ساگر واپس آ گئے۔ پھر سب نے مجھے بھیجا۔ میں گیا مگر عجیب کیفیت تھی۔ کچھ کہنا چاہتا تھا کہ ہنسی نکل پڑتی تھی۔ زیڈ احمد کے پاس جوش بھی بیٹھے ہوئے تھے۔ مجھے بار بار اس طرح ہنستا دیکھ کر بڑی دلچسپی ظاہر کی۔"

"خیریت ہے کیا زعفران کا کھیت دیکھ لیا"؟

"بھنگ کھائی ہے" میرا جواب تھا۔ جوش بہت محظوظ ہوئے اور کھود کھود کر مجھ سے پوچھنے لگے۔ کہاں کھائی، کیسے کھائی، کس نے لاکر دی وغیرہ وغیرہ۔ میں بہت دیر ہنسی نہیں روک سکا اور اٹھ کر باہر آ گیا۔ بھنگ کھانے کا سب ہی پر کچھ نہ کچھ اثر تھا۔ جتنے لوگ اس وقت شالیمار میں تھے سب ایک برادری کی طرح تھے۔ اپنے تہواروں کے موقع پر مسلمان خاص طور پر ایک دعوت کا اہتمام کرتے تھے اور شالیمار کے تمام کام کرنے والوں کو بلا استثنا مدعو کرتے تھے۔ سب لڑکے، لڑکیاں ہیرو ہیروئن اہم کردار کرنے والے، سب میں ایک دوسرے کے ساتھ بھائی چارہ تھا۔ ایک دوسرے کے گھر آتے جاتے تھے۔ رامانند ساگر، کرشن چندر کے پاس ٹھہرے ہوئے تھے۔ ان کا

یہ عالم تھا دوسرے کمرے میں لے جاؤ تو چھوٹ کر کرشن چندر کے کمرے میں آجاتے تھے۔ اور کرشن چندر انھیں دیکھ کر بڑے زور سے قہقہہ لگا کر باہر بھاگتے تھے اور بیچ سڑک پر بیٹھ کر ہنستے تھے۔ دونوں کو پھر الگ کرتے تھے اور پھر وہی ہوتا تھا۔

نواب بیگم بار بار چارپائی کی ادوائن میں پاؤں ڈال کر چلاتی تھی۔ "پھنس گئی پھنس گئی پھنس گئی" بار بار اس کا پاؤں نکالتے تھے اور بار بار وہ پھنسا لیتی تھی۔ مسعود پرویز کی شوٹنگ تھی مگر دن بھر اس کے منہ سے ایک جملہ بھی نہیں نکل سکا۔ بالکل گنگ ہوگئے تھے۔ میں کمرے پر جاکر سکنج بین پی کر سوگیا اور اگلے دن کی خبر لایا۔ غرض یہ کہ سب ہی کی حالت غیر تھی۔ لطیفہ یہ کہ جس نے بھنگ کی فرمائش کی تھی یعنی رینو کا' اس نے پکوڑیاں چکھی بھی نہیں۔

اسی زمانے کی بات ہے نشست کے لیے ایک روز جوش آئے اور کہنے لگے "ارے صاحب کیا زمانہ آیا ہے بچے بڑوں کی سی باتیں کرتے ہیں۔

"کیا ہوا جوش صاحب"

"آج صبح سویرے ہی ہمارا نواسا آیا اور پوچھنے لگا۔

نانا بچے کہاں سے آتے ہیں' اب صاحب اسے بتانا تو ضروری تھا۔ میں نے ایک الٹی سیدھی کہانی سی بنا کر اسے بتایا فرشتے لے کر آتے ہیں:

"پھر"

وہ بیٹھا آرام سے سنتا رہا اور جب میں بتا چکا تو کہنے لگا۔

اماں نانا کیوں چوتیاپن کی باتیں کرتے ہو؟"

ان دنوں پونا شہر کا ماحول بہت اچھا تھا۔ اسٹوڈیو شہر سے باہر شنکر سیٹھ روڈ پر تھا۔ جس کے آس پاس چھوٹی چھوٹی پہاڑیاں تھیں۔ آبادی بھی شہر کی بہت نہیں تھی۔ راتیں ٹھنڈی ہوتی تھیں۔ میں نے کہیں پڑھا تھا۔ اورنگ زیب کو یہ جگہ بہت پسند تھی۔ اس نے شہر کا نام بدل کر محی نگر رکھ دیا تھا مگر اس نام کو قبول عام حاصل نہیں ہوا۔

میں ابتدا میں کچھ روز ملک صاحب کے پاس رہا۔ چند دن بعد جب ملک صاحب

دلی چلے گئے اور پلٹ کر نہیں آئے تو مجھے وہاں رہنے میں تردد ہونے لگا۔ ملک صاحب کے پاس ایک لڑکا انور بھی رہتا تھا۔ وہ میرے ساتھ اینگلو عربک کالج میں بھی تھا اور دلی میں ملک صاحب کے یہاں رہا کرتا تھا۔ ان سے اس کی کوئی رشتہ داری تھی یا وہ اس خاندان کو کیسے جانتا تھا۔ مجھے کچھ نہیں معلوم۔ مگر مجھے یہ خیال پریشان کرنے لگا کہ ملک صاحب واپس نہ آئے تو میں اتنے بڑے مکان کا کرایہ کیسے دوں گا؟۔

شالیمار میں شام اور مسعود پرویز کے ساتھ بھارت بھوشن بھی تھے۔ ان سب فلموں کے ساتھ ساتھ ایک فلم کرشن بھگوان بھی بن رہی تھی۔ بھارت بھوشن اس میں کرشن کا کردار کر رہے تھے۔ میں ان کی ایک فلم "بھگت کبیر" پہلے بھی دیکھ چکا تھا۔ انھوں نے کبیر کا کردار بڑی خوبصورتی سے ادا کیا تھا۔

شالیمار اسٹوڈیو کے سامنے دو تین کوٹھیاں تھیں۔ ایک میں ایک یہودی خاندان تھا۔ دوسری میں شہر کے مجسٹریٹ رہتے تھے۔ جن کا بہت بڑا کنبہ تھا۔ بیچ کی کوٹھی میں بھارت بھوشن رہتے تھے وہ صرف دو میاں بیوی تھے۔ ابھی تک کوئی اولاد نہیں تھی۔ بھارت بھوشن سے اسٹوڈیو میں ملاقات ہوتی رہتی تھی۔ انھیں مکالمے کا بہت شوق تھا۔ کبھی کبھی کہانی کے موضوع پر ان سے باتیں ہوتی تھیں۔ ایک روز معلوم ہوا وہ اپنی کوٹھی کے دو کمرے کرائے پر دینا چاہتے ہیں۔ میں نے پوچھا مجھے دیں گے اور وہ آمادہ ہو گئے۔ میں ملک صاحب والا مکان چھوڑ کر اسٹوڈیو کے سامنے آ گیا۔

ان دنوں کچھ باتیں ایک معمول سا بن گئی تھیں۔ جیسے ایسٹ اسٹریٹ کا ایک ہوٹل جہاں ہم اکثر بیٹھتے تھے۔ کرشن چندر، میں، کبھی کبھی جوش، بھرت ویاس، کچھ دلی ریڈیو کے آرٹسٹ آ گئے تھے۔ جیسے پریم، ابراجکبار اور محمد حسین۔ وہاں بھنا ہوا گوشت بہت اچھا ملتا تھا اور ہوٹل کے مالک نے ہمیں وہاں پینے پلانے کی اجازت بھی دے دی تھی۔ کبھی کبھی شام کے کمرے میں بیٹھک ہوتی تھی اور پینا پلانا ہوتا تھا۔ کبھی میرے یہاں بیٹھ جاتے تھے۔ اکثر محفلوں میں راما نند ساگر بھی ہوتے تھے۔ محفلیں کبھی ان کے

گھر پر بھی ہوتی تھیں۔ ان دنوں میرے ساتھ ایک عجیب بات یہ تھی کہ تین پیگ تک پیوں تو سرور رہتا تھا۔ اس کے بعد پیتا تھا تو اتر جاتی تھی۔ راما نند ساگر کے گھر کی ایک محفل مجھے یاد ہے جس میں جوش بھی تھے۔ میں نے تیرہ چودہ پیگ پیے تھے۔ دو تین پینے والے تو الٹیاں کر رہے تھے۔ میں نے دیکھا جوش آہستہ آہستہ پیچھے کو سرکتے جا رہے ہیں۔ اور آخر میں جوتے ہاتھوں میں لے کر باہر آ گئے۔

"کہاں جا رہے ہیں؟" میں نے ان کے پیچھے پیچھے آکر پوچھا۔

"تم سے مطلب؟"

"میں بھی چلوں گا"

انھوں نے ایک موٹی سی گالی دی۔

"........ یہ لے جاؤ" اور جوتے ہاتھوں میں تھامے اسٹیشن کی طرف بھاگ کھڑے ہوئے اور بھاگتے ہی چلے گئے۔

جوش کے بارے میں کوئی قطعی رائے قائم کرنا مشکل ہے۔ بحیثیت مجموعی میں انھیں معصوم انسان تصور کرتا ہوں۔ پینے کے بعد کبھی بالکل ہنسوڑ ہو جاتے تھے کبھی ان کا خاندانی طنطنہ ابھر آتا تھا۔ اپنے عہد کے بڑے شاعروں میں ان کا شمار ہے مگر میں انھیں یہاں بطور ایک شاعر کے پیش نہیں کر رہا۔ اپنے شالیمار میں کام کرنے والے ایک ساتھی کی حیثیت سے ان کا ذکر کر رہا ہوں۔ ان کے بارے میں بہت سی باتیں مشہور ہیں۔ جو متضاد بھی ہیں۔ مگر ان کی ذاتی زندگی سے بھی اس وقت میرا کوئی سروکار نہیں۔ ہم ساتھ بیٹھتے اٹھتے تھے۔ وہ ہمارے بزرگ تھے۔ ان کی نظمیں سنتے بھی تھے۔ اپنی نظمیں سناتے بھی تھے۔ جب کچھ سنانے لگتے تھے "تو مردود سنو" سے شروع کرتے تھے۔ زمانے کے بعد ایک بار بمبئی کی ایک ادبی نشست میں ملاقات ہوئی۔ کیفی، سردار، وشوامتر عادل اور تقریباً سب ہی کی بیویاں جو جوان تھیں اور دیکھنے میں اچھی بھی لگتی تھیں اس نشست میں شامل تھیں۔ میری بیوی سلطانہ بھی میرے ساتھ تھیں۔ جوش محفل میں آئے تو سب لڑکیوں یا بیویوں کو دیکھ کر کہا۔

مردودوں نے کیا کیا عورتیں رکھی ہیں"۔

سلطانہ گھبراکر بہت بگڑیں۔ کیا مطلب تھا جوش صاحب کا اس بات سے؟ کیا سمجھتے ہیں وہ عورتوں کو۔ وغیرہ وغیرہ۔ میں نے ہنس کر ٹال دیا اس لیے کہ جوش کا سنجیدگی سے کچھ بھی مطلب نہیں تھا۔

شالیمار پکچرس ایک ایسی جگہ تھی جہاں گھوڑوں کی ریس کے زمانے میں سب سے ملاقات ہو جاتی تھی۔ میری مراد فلم کے لوگوں سے ہے۔ اکثر لوگ جب ریس میں آتے تھے تو شالیمار ضرور آتے تھے۔ وہاں میں جدّن بائی سے ملا۔ شوکت حسین اور فضلی سے ملا۔ چندو لال شاہ جو ایک زمانے میں فلم کی بڑی شخصیت تھے ان سے ملا۔ منٹو بھی آتے تھے۔ مسعود پرویز سے ان کی عزیز داری تھی۔ ان سے ملنے بھی آتے رہتے تھے دلی ریڈیو میں ان کے اور اپندر ناتھ کے درمیان اکثر چشمک رہتی تھی۔ ایک بار منٹو اردو کا ٹائپ رائٹر خرید لائے۔ دفتر میں اس پر کام کرنے لگے اور بلند آواز سے اپندر ناتھ کو چڑھانے کے لیے کہنے لگے۔ "ٹائپ رائٹر کی بات ہی کچھ اور ہے۔ ہاتھ سے لکھنے میں وہ مزہ نہیں آتا"۔ منٹو کی ضد میں اپندر ناتھ بھی ٹائپ رائٹر خرید لائے۔ منٹو نے ٹائپ رائٹر پر لکھنا چھوڑ دیا اور اعلان کیا "ہاتھ سے لکھنے میں جو لطف ہے ٹائپ رائٹر پر لکھنے میں نہیں۔

میں جب شالیمار پکچرس بند ہونے کے بعد بمبئی آگیا تو ایک روز شاہد لطیف ایک ٹائپ رائٹر لے کر میرے پاس آئے اور کہنے لگے۔ "یہ منٹو کا ٹائپ رائٹر ہے۔ وہ اسے تین سو روپے کے بدلے میرے پاس رکھ گئے تھے۔ تم رکھ لو مجھے تین سو روپے کی ضرورت ہے۔ وہ ٹائپ رائٹر بہت دن تک میرے پاس رہا۔ اب معلوم نہیں کیا ہوا۔ شاید مکان بدلنے میں اِدھر اُدھر ہو گیا۔ جب میں نے بینڈ اسٹینڈ والا گھر چھوڑا تھا۔ بہت سی چیزیں خورد برد ہو گئی تھیں۔ میں عادتاً بھی پرانی چیزیں بہت دن تک نہیں رکھتا۔ بوسیدگی کی بو آنے لگتی ہے۔ انسانی رشتوں کی بات اور ہے۔ اسٹوڈیو کے سامنے والے مکان میں منتقل ہونے کے بعد اسٹوڈیو میں آنا جانا آسان

ہو گیا تھا۔ ان دنوں شوٹنگ کے اوقات مقرر نہیں تھے۔ کبھی کبھی دن رات سبھی کام ہوتا تھا۔ "غلامی" کی شوٹنگ کے زمانے میں کچھ ایسا ہی ہوا۔ اس فلم میں ایک چھوٹا سا کردار میں نے بھی ادا کیا تھا۔ یونین کا لیڈر بنا تھا۔ دن رات منہ پر میک اپ لیپے لیپے عاجز آگیا تھا۔ جیسے بادشاہوں کے عروج و زوال کی کہانیاں پڑھنے میں آتی ہیں ویسی ہی فلم کے لوگوں کی بھی ہیں۔ سیاست سے متعلق لوگوں کی بھی ایسی ہی ہیں۔ آزاد پیشوں میں ترازو کے پلڑے بہت جلدی جلدی اوپر نیچے ہوتے ہیں۔ تقسیم کے بعد جب بمبئی آیا اور کام کی کھوج میں ٹرینوں میں سفر کرتا تھا۔ ان دنوں بہت سے چہرے جو ریلوے پلیٹ فارم پر ملتے تھے بعد میں بڑی بڑی گاڑیوں اور ہوائی جہازوں میں ملے مگر اس وقت مجھے اس سے سروکار نہیں۔ ان دوستوں اور بزرگوں کا ذکر کر رہا ہوں جو میرے ساتھ شالیمار پکچرس میں بھی تھے اور پھر اس زندگی کے سفر میں آگے بھی کہیں کہیں ملے۔ جیسے کرشن چندر اور جوش۔

کرشن چندر سے میں پہلی بار صادق الخیری کے مکان پر ملا تھا۔ اس کے بعد تو ملاقاتیں ہوتی ہی رہیں۔ دلی میں بھی پونے میں بھی اور بمبئی میں بھی۔ میں ان کے جنازے میں بھی شریک رہا۔ میں ان کا بھی شمار اچھے لوگوں میں کرتا ہوں۔ دوستوں کے دوست، ہمدرد قسم کے انسان تھے۔ کسی کے لیے جو کر سکتے تھے کر دیتے تھے۔ ان کا اپنا ایک طریقۂ کار تھا۔ اپنا ہر کام کر لیتے تھے۔ ہر مشکل نپٹا لیتے تھے۔ دوسروں کو نقصان پہنچائے بغیر۔ شالیمار پکچرس کے زمانے ہی کی بات ہے، بمبئی میں ایک کانفرنس ہوئی۔ وہ بھی شاید ترقی پسند حلقے ہی نے منعقد کی تھی۔ اس میں شرکت کے لیے میں اور کرشن چندر دونوں ساتھ آئے۔ کانفرنس شاید قیصر باغ میں ہوئی تھی۔ جہاں جہاں بھی بمبئی کی سڑکوں اور بازاروں سے ہم گزرے ہر طرف دیواروں پر کانفرنس کے پوسٹر لگے دیکھے مگر ان میں سے کسی پر بھی نہ میرا نام تھا نہ کرشن چندر کا۔ چلتے چلتے وہ ہنس کر کہنے لگے "اخترالایمان نہ تم شاعر ہو اور نہ میں افسانہ نگار" مگر اس کانفرنس میں شرکت کے بعد دیکھتے دیکھتے کرشن چندر ایشیا کے بڑے

افسانہ نگار مان لیے گئے۔

کرشن چندر نے پے در پے ایسے مضامین لکھے جن میں ترقی پسند تحریک میں کام کرنے والوں کو سراہا گیا تھا۔ ایک مضمون میں سجاد ظہیر کو پیار سے "چمڑے کا سوداگر" کہا گیا تھا۔

کرشن چندر پونہ میں ۱۳۱ تلک روڈ پر رہا کرتے تھے۔ اسٹوڈیو سے یہ جگہ بہت فاصلے پر نہیں تھی۔ کرشن چندر بہت ہمدرد قسم کے آدمی تھے۔ ریڈیو چھوڑ کر جب شالیمار پکچرس میں آئے وہاں کے کئی اداکاروں کو ساتھ لے آئے تھے۔ یا بلوا لیا تھا۔ انھیں میں ایک ثمینہ خاتون بھی تھیں۔ زندگی میں جتنی بھی اچھی چیزیں ہیں، جیسے اچھے کھانے اچھی شراب، اچھی زندگی کے سارے لوازمات، اچھے دوست مرد ہوں یا عورت، انھیں سب بہت پسند تھے۔ دلی میں انھیں کچھ دن ایک خاتون کے ساتھ دیکھا جو ہندی کے ایک مشہور ادیب کی بیوی رہ چکی تھیں اب طلاق ہوگئی تھی۔ اس کے بعد ایک اور لڑکی تھی جو ان کے ڈراموں میں کام کیا کرتی تھی۔ پھر ثمینہ خاتون آگئی تھیں۔ فلمی زندگی میں آئے تو وہ بھی آگئیں یا بلا لی گئیں۔ شالیمار چھوڑنے کے بہت دن بعد کی بات ہے ایک روز مجھے باندرہ کے بازار میں مل گئے۔ وہ ان دنوں وہاں قریب ہی رہتے تھے۔ باتیں کرتے کرتے ہم ان کے گھر چلے گئے۔ ان دنوں انھیں گٹھیا ہوگئی تھی۔ کہنے لگے "ڈاکٹر کہتا ہے یہ نہ کھاؤ وہ نہ کھاؤ۔ کچھ نہ کھاؤں تو جیوں کیوں"؟

ایک روز میں اسٹوڈیو میں بیٹھا کام کر رہا تھا نواب بیگم آگئی۔ مجھے کام کرتا دیکھ کر خاموش بیٹھی رہی۔ اچانک میری نظر پڑی۔ اسے مایوس دیکھ کر میں نے پوچھا "کیا ہوا تمھیں"؟ معلوم ہوا ایک بڑے قلمکار کے بارے میں جو اس کا تصور تھا۔ وہ بہت مجروح ہوا ہے۔ میں نے تفصیل پوچھی تو بتایا کہ اس نے ابھی راستے میں کرشن چندر کے ساتھ ثمینہ خاتون کو دیکھا۔

"یہ کیا بات ہوئی۔ تم بھی تو لڑکی ہو اور میرے پاس بیٹھی ہو"۔

"نہیں۔ ایں۔ ایں" اس نے نہیں کو کھینچا اور پھر بتایا کرشن چندر ثمینہ خاتون کا چلن

ہاتھ میں لیے موچی کے پاس جا رہے تھے۔ مجھے یہ کوئی عجیب بات نہیں لگی۔ میں نے ان سے کہا "اگر تم میرے ساتھ بازار جاؤ اور راستے میں تمھاری چپل ٹوٹ جائے تو میں کیا کروں گا"؟

"کیا کریں گے؟"

"تمھاری چپل اٹھا کر موچی کے پاس جاؤں گا۔ یہ ایک عام رویہ ہے کسی بھی مرد کا۔"

"ہٹایئے۔ ہر بات کو مذاق میں ٹال دیتے ہیں آپ"۔ اس نے کہا اور اٹھ کر چلی گئی۔

کچھ دن بعد کرشن چندر شالیمار پکچرس چھوڑ کر بمبئی چلے گئے اور بمبے ٹاکیز سے متعلق ہوگئے۔ شمینہ خاتون بھی چلی گئیں۔ وہاں انھوں نے شمینہ کو ہیروئن لے کر ایک فلم بنائی کیا حشر ہوا نہیں معلوم۔ کرشن چندر کے بعد میں ان کے مکان ۱۲ تلک روڈ پر منتقل ہوگیا۔

شالیمار پکچرس کے علاوہ پونے میں اور دو فلم کمپنیاں تھیں۔ "پربھات" اور "نوبگ چتر پٹ لمیٹیڈ"۔ "غلامی" ختم ہوتے ہی زیڈ احمد نے اگلی تصویر "پرتھوی راج سنجوگتا" شروع کر دی۔ اس میں سنجوگتا کا کردار نینا نے کیا اور پرتھوی راج کا پرتھوی راج کپور نے۔ وہ اپنے زمانے کے بڑے مشہور اداکار تھے۔ فلموں میں کام کرنے کے علاوہ "پرتھوی تھیٹر" کے نام سے ایک تھیٹر بھی قائم کر رکھا تھا جس کے ڈرامے وقتاً فوقتاً ہوتے رہتے تھے۔ پونے میں بھی انہی دنوں اپنا تھیٹر لے کر آئے اور ان کے ساتھ ان کے دوسرے اسٹیج کے اداکاروں سے ملاقات ہوئی۔ ان کے بیٹے راجکپور اور ان کی ہیروئن دمینتی ساہنی سے بھی۔ اس فلم کی ہدایت کے لیے نجم نقوی کو بلایا گیا۔ نجم نقوی نے انھیں دنوں نوبگ کے لیے ایک فلم بنائی تھی۔ جو بہت کامیاب ہوئی تھی۔ نجم نقوی سے ملاقات علی گڑھ یونیورسٹی میں ہوئی تھی۔ بمبے ٹاکیز میں کئی برس ایک جرمن فلم ڈائرکٹر کے ہاتھ تلے کام کیا تھا جسے ہمانشو رائے لے کر آئے تھے۔ اس زمانے میں اور بہت سے پہچان کے لوگ جو فلموں سے وابستہ تھے پونا آگئے تھے۔ شاہد لطیف اور عصمت چغتائی "نوبگ" کے لیے ایک فلم بنا رہے تھے۔ جس میں ہیروئن کا کردار گیتا نظامی کر رہی تھی۔ اس سے پہلے وہ "نوبگ" کی فلم "پنا" کی ہیروئن رہ چکی تھی۔

جس کے ڈائرکٹر نجم نقوی تھے۔ گیتا نظامی ادھ کچری سی لڑکی تھی۔ ناخواندہ ہونے کے برابر مگر ان ہی سب سے دوستی بھی تھی۔ ایس و یدی پہلے مظہر خاں کی فلم "بڑے نواب صاحب" بنا چکے تھے۔ جو اچھی خاصی چلی تھی۔ آہستہ آہستہ ایسٹ اسٹریٹ کے حلقے والوں میں یہ سب نام بھی شامل ہو گئے تھے۔ جن کا میں نے ابھی ذکر کیا۔

میرا تلک روڈ والا گھر ایک طرح کا مہمان خانہ بن گیا۔ جسے کہیں رہنے کی جگہ نہیں ملتی تھی میرے پاس آکر بستر لگا لیتا تھا۔ کچھ دن کے لیے نورالحق بھی آگئے۔ آج وہ بھی حیات نہیں۔ جن دنوں میں علی گڑھ یونیورسٹی میں تھا۔ وہ بھی وہاں پڑھتے تھے۔ حیدرآباد کے رہنے والے تھے۔ اکبر یار جنگ کے پوتے یا نواسے، تفصیل یاد نہیں رہی۔ ان سے کچھ اور دوستوں سے جیسے مشتاق احمد یوسفی، ذکی آغا اور بلوچستان کا ایک لڑکا تھا ایسا میل ہو گیا تھا کہ دوپہر کا کھانا سب ساتھ کھاتے تھے۔ کوئی عثمانیہ ہاسٹل میں تھا کوئی ماریسن کورٹ میں اور کوئی ایس ایس ہال میں۔ سب اپنا کھانا ایک جگہ منگا لیتے تھے۔ اور مل کر کھاتے تھے۔ نورالحق کے بعد ایک بنگالی میوزک ڈائرکٹر آگیا تھا اب نام یاد نہیں رہا۔ کچھ دن کے لیے شالیمار پکچرس میں ملازم ہو گیا تھا۔ وہ گیا تو خورشید منیر اور سلمہ صدیقی آگئے۔ ان دونوں کو میں خود لایا تھا۔

علی گڑھ کی طالب علمی کے زمانے میں کئی بار میں نے خورشید منیر کو دیکھا تھا مگر واقفیت کبھی نہیں ہوئی تھی۔ چھیلا صفت لڑکا تھا۔ اور ایسے کھیلوں میں حصہ لیتا تھا جس میں جسمانی نمائش زیادہ تھی۔ میں جب شالیمار میں آیا تو ایک روز دیکھا وہ بھی وہاں ہے کب آیا کس کے توسط سے آیا مجھے کچھ معلوم نہیں تھا۔ مجھے اتنا معلوم تھا جسٹس منیر کا بیٹا ہے۔ پونے میں دو تین لڑکوں نے مل کر ایک کمرہ لے رکھا تھا۔ ان کے ساتھ رہتا تھا۔ پتہ نہیں وہ کیوں آگیا تھا۔ مجھے اس کے اندر کبھی اداکاری کی صلاحیت محسوس نہیں ہوئی۔ ایک بار چند روز کی چھٹی لے کر گیا اور آیا تو ساتھ بیوی تھی۔ رشید احمد صدیقی کی بیٹی سلمہ۔ میں رشید صاحب کا بہت احترام کرتا تھا۔ اور سلمہ کے بارے میں بھی میری رائے تھی کہ پڑھی لکھی اور ذہین ہیں۔ مگر یہ شادی؟ بات میری سمجھ میں نہیں آئی مگر یہ

مجھے معلوم تھا کہ خورشید منیر کے پاس رہنے کا کوئی اچھا ٹھکانہ نہیں۔ میں نے کچھ روز سوچا اور پھر ایک دن جا کر انھیں اپنے پاس لے آیا۔

۱۲ تلک روڈ کا مکان بنگلہ نما تھا۔ اوپر ایک کمرشیل آرٹسٹ پٹوردھن رہتے تھے۔ جب تک میں پونے میں رہا اسی مکان میں رہا۔ گھر کے قریب ہی ایس پی کالج تھا گھر کے سامنے جمخانہ تھا جس کے لان میں اکثر آر ایس ایس کے نوجوان مختلف قسم کی ورزشوں میں صبح اور شام کے وقت مصروف نظر آتے تھے۔ نوبگ، پربھات اور شالیمار میں کام کرنے والے لوگوں کے ساتھ ایک اور بھی نام ہے جس کا ذکر ضروری ہے۔ ان کا نام مسز مجل تھا۔ نیم انگریز نسل کی خاتون تھیں اور عرف عام میں ممی کہہ کر بلائی جاتی تھیں۔ بڑا مسکراتا ہوا نرم سا چہرہ جس پر اب جھریاں نظر آنے لگی تھیں۔ اپنی جوانی میں ضرور خوبصورت رہی ہوں گی۔ بڑی "بابت روا" قسم کی خاتون تھیں۔ جسے جب جو چاہیے مل جاتا تھا۔ ٹھرے سے انگریزی شراب تک اور گھاٹن سے اینگلو انڈین اور انگریز لڑکی تک۔ شام چڈھا خاص طور پر ان کا گاہک تھا۔ وہ مجھ پر بھی بہت مہربان تھیں میں اسٹوڈیو سے گھر یا گھر سے اسٹوڈیو جاتے وقت تھوڑی دیر ان کے ہاں ضرور بیٹھتا تھا۔ ان کی دسترس کہاں تک تھی یہ وہی جانتی تھیں۔ وید، رندھیر ایکٹر، شاہد لطیف شام، کون تھا جو ان کا گردیدہ نہیں تھا۔

ان دنوں میں ڈائری لکھا کرتا تھا۔ آگے اس ڈائری کے کچھ حوالے دوں گا جو ممکن ہے۔ بے ربط لگیں مگر میرے اس زمانے کی جھلک ان میں مل جائے گی۔ اور میں ایک طول امل سے بچ جاؤں گا۔ "پرتھوی راج سنجوگتا" ختم ہونے کے بعد "میرا بائی" شروع ہونے والی تھی۔ میں زیڈ احمد سے اجازت لے کر کچھ دن کے لیے گھر گیا۔ میرے گھر کی صورت حال ایسی تھی کہ اب اسے ٹھیک کرنا ضروری ہو گیا تھا۔ میں نے اماں کو دلی بلایا اور خود نجیب آباد چلا گیا۔ سلمہ اور ظہور احمد کو بلایا، ایک وکیل کو بلایا اور وکیل کے سامنے سلمہ کو طلاق دے دی اور اس کا سارا سامان دے کر اسے ظہور احمد کے ساتھ رخصت کر دیا۔ بعد میں ان دونوں نے شادی کر لی۔ میرے گھر کے افراد والد

والدہ، تایا، چچا کے لڑکے کسی کو میری یہ بات پسند نہیں آئی مگر میں نے جو طے کرلیا تھا وہ کیا اور دلی آگیا۔ سلطانہ کے بڑے بھائی حامد علی سے ملا اور ان کے سامنے تجویز رکھی کہ سلطانہ سے میرا نکاح اب کر دیں رخصتی اگلے سال ہو جائے گی ان کا بڑا خاندان تھا۔ تھوڑی دیر انھوں نے مجھے سمجھانے کی کوشش کی کہ نکاح بھی اگلے سال ہی ہو جائے۔ مگر میں نے اپنے دلائل دیے اور اڑا رہا۔ آخر نکاح ہو گیا۔ اور ۲۱ر مئی ۴۴ء کو ظہر اور عصر کے درمیان سلطانہ میری بیوی بن گئیں۔ رخصتی اگلے سال پر ملتوی کر دی گئی۔ کچھ روز دلی میں رہ کر میں واپس پونا آگیا۔

یہ وہ زمانہ ہے جب فضا مکدر ہوتی جا رہی تھی اور ملک پر تقسیم کے بادل منڈلانے لگے تھے۔ جگہ جگہ انگریزوں کے خلاف مظاہرے اور بلوے ہو رہے تھے۔ فرقہ واری فساد زور پکڑنے لگے تھے۔ کرشن چندر تو بمبئی چلے ہی گئے تھے۔ نجم نقوی اور جوش بھی چلے گئے اور مسعود پرویز بھی۔ ایک روز کسی نے آکر اطلاع دی گیتا نظامی ایس ویدی کے ساتھ چلی گئی۔ نظامی کو چھوڑ دیا۔ نظامی لاہور چلے گئے۔ ویدی "نویگ" کی ایک فلم کمرہ نمبر ۹ بنا رہے تھے۔ گیتا اس فلم کی ہیروئن تھی شالیمار پکچرس کی مالی حالت بھی بگڑنے لگی تھی۔ کئی کئی مہینے تنخواہ نہیں ملتی تھی۔ ان دنوں میں سگریٹ پیتا تھا۔ اور بہت پیتا تھا۔ سگریٹ سے سگریٹ جلا کر۔ ایک روز سگریٹ خریدنے کے لیے پیسے نہیں تھے۔ میں خزانچی کے پاس گیا اور کچھ پیسے مانگے۔ اس نے آٹھ آنے دیے۔ فلپس موریس تو آٹھ آنے میں نہیں آتی تھی۔ مجھے بہت برا لگا اور میں نے اس روز سے سگریٹ پینا چھوڑ دیا۔ ان دنوں پان بھی کھاتا تھا۔ اور اس میں مرادآبادی تمباکو کھاتا تھا۔ سگریٹ پینا چھوڑا تو تمباکو کھانا بھی چھوڑ دیا اور پان بھی۔

اس انتشار کے زمانے کی بات ہے ایک روز پٹ وردھن میرے پاس آئے اور کہا :

"رات کو یہاں نہ رہنا کہیں اور چلے جاؤ۔"

"کیوں ؟" میں نے پوچھا۔

"آر ایس ایس کے لڑکے شام گاڑیوں میں بیٹھ کر اس گھر کے چکر لگا رہے تھے۔ خطرہ ہے۔"

"اور تم؟" میں نے پٹ وردھن سے پوچھا۔

"میں یہیں ہوں" اس نے جواب دیا۔

"جب تک تم میرے پڑوسی ہو میں بھی گھر چھوڑ کر نہیں جاؤں گا۔"

کہنے کو تو یہ سب میں نے کہہ دیا۔ مگر رات بھر نیند نہیں آئی۔ رات کا بیشتر حصہ برآمدے میں کھڑے کھڑے گزرا۔ مگر کوئی نہیں آیا۔ پٹ وردھن سے میرے بہت اچھے مراسم تھے۔ مسز پٹ وردھن اکثر میرے پاس آ بیٹھتی تھیں۔ ان کے یہاں ابھی تک کوئی اولاد نہیں تھی۔ وہ مراٹھی کے سوا کوئی دوسری زبان بھی نہیں جانتی تھیں۔ مگر ہم "یس" اور "نو" سے کام چلا لیتے تھے۔ ایک روز میں کسی کام سے اوپر پٹ وردھن کے یہاں گیا۔ کمرہ تھوڑا سا کھلا ہوا تھا۔ میں ذرا سا دھکا دیا تو کھل گیا۔ مسز پٹ وردھن کسی کے ساتھ بستر میں تھیں۔ میں واپس آ گیا۔ اسٹوڈیو میں کچھ پڑھے لکھے مراٹھوں سے بات کی تو انھوں نے بتایا کہ مہاراشٹر میں "نیوگ" آج بھی رائج ہے۔ بچہ نہ ہوا ہو یا نہ ہوتا ہو تو شوہر کے سوا اور کسی سے بھی لے سکتے ہیں۔ میں نے کبھی اس بات کی تحقیق نہیں کی، ضرورت بھی نہیں تھی۔

انھیں دنوں کی بات ہے گرمی بہت تھی۔ میں اسٹوڈیو سے جلدی آ گیا۔ کھانا کھایا اور دھوتی بنیان پہن کر لیٹ گیا۔ اکیلا ہی تھا۔ میں نے بنیان بھی اتار دیا۔ پھر لیٹنے لگا تھا کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ میں نے ایسے ہی ننگے بدن اٹھ کر دروازہ کھول دیا۔ باہر ایک لڑکا کھڑا تھا۔ کتابیں ہاتھ میں تھیں۔ شاید ایس پی کالج کا طالب علم تھا۔ اس نے مجھے غور سے دیکھا۔

"یہاں آپ رہتے ہیں؟" اس نے کچھ ڈرے ڈرے لہجے میں پوچھا۔

"ہاں" میں نے جواب دیا۔

"سنا ہے اس گھر میں بھوت ہے۔"

"کھڑا ہوں تمہارے سامنے" مجھے شرارت سوجھی۔ وہ ایسا سٹپٹایا کہ فوراً ہی بھاگ کھڑا ہوا۔ اور جب تک میں اسے دیکھتا رہا وہ بھاگا ہی چلا جا رہا تھا بعد میں کسی نے مجھے بتایا اس گھر کے بارے میں۔ اکثر کہا جاتا تھا کہ وہاں بھوت ہے۔

میں ان دنوں ڈائری لکھا کرتا تھا مگر تسلسل کے ساتھ نہیں۔ کہیں کہیں سے نقل کرتا ہوں۔ مراد اپنی اس وقت کی زندگی کا مختصر سا خاکہ پیش کرنا ہے۔ جن واقعات کو میں یہاں نقل کر رہا ہوں وہ اسی طرح بیان ہوئے ہیں۔ جس طرح مجھ سے صاحب واقعہ نے بیان کیے تھے۔ غلط ہیں یا درست اس کی تحقیق میں نے نہیں کی۔

۹ر مارچ ۴۶ء کی تاریخ میں لکھا ہے۔ "آج سر آغا خاں کو ہیروں میں تولا گیا۔ ہندوستان میں قحط پڑنے والا ہے۔ انگریزوں کے خلاف ہر جگہ مظاہرے ہو رہے ہیں۔ جشن فتح کے موقع پر لاہور کے اسکولوں اور بنکوں کو آگ لگانے کی کوشش کی گئی۔"

۱۵ر مارچ ۴۶ء کی تاریخوں میں گاندھی جی کا بیان تھا " آزادی کی جنگ لڑنے کے ساتھ ساتھ ہم اپنے کو سمجھنے کی کوشش بھی کریں۔"

اس کے نیچے کی سطروں میں ہے: "بے بی کا نتیجہ نکل آیا وہ پاس ہوگئی۔ اس خوشی میں مٹھائی لے کر آئی تھی۔"

میرے پڑوس میں ایک مراٹھا خاندان تھا۔ ان کے یہاں چھوٹی لڑکی کو بے بی کہہ کر بلاتے تھے۔ مجھ سے ان کا بہت خلا ملا تھا۔ نیچے کی سطر میں لکھا تھا۔ ایک مدت بعد سنبہ پربھا پردھان سے ملاقات ہوئی۔ جب میں شالیمار سے متعلق ہوا تھا۔ اس وقت تعارف ہوا تھا۔ شاہد لطیف کی فلم "شکایت" میں کام کر رہی ہے۔ آج "شکایت کی مہورت میں مل گئی۔ پوچھ رہی تھی آپ نے گھر آنا کیوں چھوڑ دیا۔ دو بار پہلے بھی کھانے پر بلا چکی ہے۔ عام طور پر میں اس سے بچتا ہوں۔ طبیعت کی بہت چھوٹی ہے۔"

بعد کی سطروں میں لکھا ہے: " شالیمار پکچرس کی حالت دگرگوں ہے۔ زبیدہ احمد

روپے کے لیے پریشان نظر آتے ہیں۔ اسٹاف کی تنخواہیں کبھی نہیں ملیں"۔ نیچے کی سطروں میں جوش صاحب سے ملاقات کا ذکر ہے۔

"جوش صاحب سے بہت دیر تک باتیں ہوتی رہیں۔ بغیر پیے بہت مزیدار باتیں کرتے ہیں۔ پی کر ان کی انا کبھی کبھی ابھر آتی ہے۔ حیدرآباد میں نظام کے ملازم رہ چکے ہیں۔ نظام دکن کی عادات و فضائل کا ذکر کر رہے تھے۔ انھیں انگریزوں سے نفرت ہے۔ ان کے قصے سناتے رہے۔ کمرے کی صفائی کرتے وقت خادم یا خاکروب کی جیب سے ایک روپیہ بھی زمین پر گر جائے تو اسے باہر نکال دیتے تھے اور روپیہ اٹھا کر جیب میں رکھ لیتے تھے۔ کوئی درباری مر جائے تو پرسہ دینے سب سے پہلے پہنچ جاتے تھے۔ اور اس کے بدن یا انگلی پر جو سونا یا ہیرا ہوتا تھا اتار لیتے تھے۔ نواب سالار جنگ نظام کے بعد دکن کے سب سے متمول شخص تھے۔ نظام نے ان سے اپنی بیٹی کی شادی کرنے کی خواہش ظاہر کی۔ مگر وہ نظام کی نیت سے واقف تھے۔ انھوں نے معذرت کر دی:

"حضور میں تو عورت کے قابل ہی نہیں ہوں"۔ اس ڈائری کی آخر کی سطریں ہیں۔ مجھے اور نجم نقوی کو رامانند ساگر نے شام کے کھانے پر مدعو کیا۔ ان کے والد آئے ہوئے ہیں۔ ان سے ملنا مقصود تھا"۔

۲۶ر مارچ ۴۶ء "ہماری زندگیاں یوں ہی کوئی بڑا مقصد سامنے رکھے بغیر کٹ جاتی ہیں۔ اس پر بھی ہم درازی عمر کی دعائیں مانگتے رہتے ہیں۔ اس دوران نجم نقوی کے ساتھ موٹر سے بمبئی گیا اور آیا۔ بمبئی میں احمد عباس اور عصمت چغتائی سے ملاقات ہوئی۔ عصمت سے یہ میری دوسری ملاقات تھی۔ شام کی چائے احمد عباس کے ساتھ پی۔ وہ نجم نقوی کے عزیزوں میں ہیں۔ بمبئی میں مدھوسودن کے پاس ٹھہرا۔

"آج اسٹوڈیو سے واپس آتے وقت ثریا میرے ساتھ آگئی۔ یہ لڑکی تیواری کے ساتھ رہتی ہے۔ اچھی میٹھی سی لڑکی ہے۔" میں نے پوچھے سے کہا چائے

بنائے۔ اس بیچ میری پڑوسن اندو متی بھی آگئیں۔ میں نے ثریا سے تعارف کرایا۔ دونوں باتیں کرنے لگیں۔ تھوڑی دیر بعد بے بی اور اندو متی کی ایک عزیز گلاب بھی آگئیں۔ سب نے مل کر چائے پی۔ بہت دیر تک ہنستے ہنساتے رہے۔"

۲۲ر مارچ ۴۶ء "کل ہم دیر تک مصروف تھے۔ ہولی کا دن تھا۔ شام کے ہاں ہولی کھیلی۔ وہاں ایک لڑکی سے ملاقات ہوئی۔ نام زیبا تھا۔ اچھی خوبصورت لڑکی ہے لڑکی کیا عورت ہے فلموں میں کام ڈھونڈنے آئی ہے۔ ہولی کا اختتام نجم نقوی کے مکان پر ہوا۔ چلتے وقت شاہد لطیف نے کہا رات کو شام کے ہاں بیٹھیں گے۔ گپ کریں گے۔"

شام کو گیا۔ وہاں زیبا بھی تھی۔ اس نے ترنم سے کئی غزلیں پڑھیں۔ اچھا وقت گزرا۔

۲۳ر مارچ ۴۶ء — ۱۱ر بجے کے قریب صبح ادیب اپنی بیٹی اور سالی کے ساتھ آگئے۔ یہ بریلی کے رہنے والے ہیں۔ اور یہاں گولہ بارود بنانے کی فیکٹری میں کام کرتے ہیں۔ انہی کے ساتھ دو تین لڑکے اور آئے ہیں۔ تھوڑی دیر بیٹھتے اور باتیں کرتے ہیں۔ اچھے سلجھے ہوئے لڑکے ہیں۔ مجھے بھی اچھا لگتا ہے۔ شام کو گھومنے کے لیے نکلا اور سفر امپیریل ہوٹل پر ختم ہوگیا۔ شاہد لطیف مل گئے وہ ہوٹل میں ہی رہتے ہیں۔ ان کے ساتھ ابراہیم بھی تھا۔ وہ فتحپوری اسکول میں میرے ساتھ تھا۔ شام راولپنڈی گیا ہوا ہے۔ وہ اس کا وطن ہے۔ شاہد لطیف نے زیبا کا ذکر چھیڑ دیا۔ اتنے میں وہ آگئی اور غزلیں سنانے کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ اس کا ترنم بھی اچھا تھا۔

۱۴ر اپریل ۴۶ء، آج اسٹوڈیو سے آتے وقت کچھ دیر کے لیے جوش صاحب کے یہاں بیٹھ گیا۔ اپنے خاندان کے حالات اور بزرگوں کے قصے سنانے میں انھیں فخر و مباہات ہوتا ہے۔ انھوں نے اپنا سنہ پیدائش ۱۸۹۸ء بتایا تھا۔ ان کے دادا کے ایک سو بارہ لڑکے تھے۔ چار منکوحہ بیویاں تھیں۔ باقی کنیزیں۔ باندیاں اور ادھر اُدھر کی عورتیں۔ جوش کا بیان ہے کہ ان کے دادا اپنی اولاد کو نہیں پہچان سکتے تھے۔ وجہ؟ کثرت اولاد۔

تیس بتیس بیویوں میں سے کسی کا بچہ ان کے پاس آنے سے انکار کر دیتا تھا یا انھیں نہیں پہچان سکتا تھا تو اس زور سے طمانچہ مارتے تھے کہ بچے کا دم نکل جاتا تھا۔ کئی ایسے واقعات ہونے کے بعد ان کی داشتہ عورتیں اپنے بچے ان کے سامنے لاتے ہوئے گھبرانے لگی تھیں۔ اگر کبھی سامنا ہو جاتا اور وہ پوچھتے تھے۔ "یہ بچہ کس کا ہے تو" میاں آپ کا ہے" کہہ کر بھاگ کھڑی ہوتی تھیں۔ اور بدحواسی میں بھاگتی جاتی تھیں اور کہتی جاتی تھیں " میاں آپ کا ہے" " میاں آپ کا ہے" " میاں آپ کا ہے"۔ ایک مرتبہ ان کے چھوٹے لڑکے نے ان کے بارے میں کہہ دیا تھا " میاں تو لکھنؤ کے نوابوں کی چال چلتے ہیں"۔ کیونکہ وہ ذرا سست گام تھے اور تیز چلنے کو بدتمیزی میں شمار کرتے تھے جب انھیں یہ اطلاع ملی کہ ان کے لڑکے نے ان کے بارے میں ایسی رائے کا اظہار کیا تو تلوار لے کر اس کے گھر پہنچ گئے اور راستے میں جو کتا بلی آیا اسے مارتے گئے۔ وجہ یہ تھی کہ وہ لکھنؤ کے نوابوں کو نامرد تصور کرتے تھے۔" جوش اپنے بارے میں کہہ رہے تھے کہ ایک مرتبہ وہ گاؤں کے کنویں پر کسی کو مار رہے تھے۔ دادا نے جب دیکھا تو گھر بلوا کر انھیں ہار پھول پہنائے اور مٹھائی بانٹی اور جوش کے والد سے کہا یہ لڑکا بہت دلیر ہو گا۔ اس لیے کہ اس کے انداز میں پیٹتے وقت بزدلی شامل نہیں تھی۔"

اپنے کسی نوجوان عزیز کے متعلق بات کر رہے تھے کہ انھوں نے ناخن کٹواتے ہوئے ایک بار " سی ای ای" کی اس پر باپ نے اسے " نامرد" جیسے خوبصورت لفظ سے یاد کیا اور بیٹے نے اپنی بہادری کا ثبوت دینے کے لیے اپنے تمام ناخن پتھر سے کچلوا کر باپ کے پاس بھیج دیئے۔"! جوش پیدائشی شیعہ نہیں تھے۔ کچھ لکھنؤ کے ماحول اور اثر اور کچھ شیعہ لڑکیوں کی محبت میں شیعیت اختیار کر لی۔ جب باپ کو معلوم ہوا تو انھوں نے عاق کر دیا۔ لیکن انھوں نے شیعیت کو ترک نہیں کیا۔ آخر باپ نے محبت سے مجبور ہو کر بیٹے کو معاف کر دیا اور اپنی جائداد کا حق دار قرار دیا۔"

۱۵/ اپریل ۱۹۴۶ء ـ

"۱۵/اپریل کے بعد ڈائری کو آج ہاتھ لگایا ہے۔ہم ایسے لوگوں کی زندگی میں ایسا ہوتا ہی کیا ہے جسے باقاعدہ قلمبند کیا جاتے ؟۔

آج بنجمین نام کی ایک لڑکی آئی تھی۔ سانولا رنگ ہے مگر دیکھنے میں اچھی لگتی ہے۔فلم میں کام کرنے کا شوق ہے مگر زبان نہیں جانتی۔کہتی تھی آپ زبان سکھا دیجیے میں نے کہا آیا کرو وقت ملے گا تو تمھاری مدد کردوں گا۔شلندر نام کی بھی ایک لڑکی آئی تھی۔ مہاراشٹرین ہے۔اچھی شراب کا شوق ہے۔شنکر روڈ پر ایک صاحب رہتے ہیں۔کسی چھوٹی موٹی ریاست کے نواب ہیں۔گجراتی میں شاعری کرتے ہیں۔ان کے یہاں ملی تھی۔میری شاعری سننے آئی تھی۔میں نے کہا۔بیٹھو باتیں کرو شاعری رہنے دو۔" ۱۰/مئی ۴۶ء

آج دوپہر کو زیبا آگئی تھی۔بہت دیر تک باتیں کرتی رہی۔شام کے ساتھ رہتی ہے۔بمبئی کی کسی فلم میں ہیروئن رہ چکی ہے۔یہاں پونا میں ابھی اسے کوئی کام نہیں ملا۔میں نے زیڈ احمد سے اس کی سفارش کی تھی۔ وہ پندرہ سو روپے مہینہ پر رکھنے کو تیار تھے مگر وہ آمادہ نہیں ہوئی۔شاید پندرہ سو روپیہ اس کی نظر میں بہت کم تھا۔ نجم نقوی بمبئی چلے گئے۔وہاں فلمستان کے لیے کوئی فلم بنا رہے ہیں۔مجھ سے کہہ کر گئے تھے تمھیں بمبئی بلا لوں گا مگر ابھی تک کچھ ہوا نہیں۔کچھ کرنے کو جی نہیں چاہتا " تاریک سیارہ" کا دیباچہ لکھنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ وہ بھی نہیں لکھا گیا۔نظم کہنا چاہتا ہوں وہ بھی نہیں ہو رہی۔معلوم ہوتا ہے سارے سوتے بند ہوگئے ہیں۔"

"اندومتی سے ملاقات ہوتی رہتی ہے۔ہم سامنے جمخانہ کے لان میں جاکر بیٹھ جاتے ہیں۔اور ایسے ہی ادھر ادھر کی باتیں کرتے ہیں۔ ۱۱/مئی ۴۶ء

"آج خورشید اور سلمہ ایک مہینے کے لیے علی گڑھ چلے گئے۔میں ان کے خالی کمرے میں گیا اور بہت دیر تک کھڑا ننگے کمرے کو دیکھتا رہا۔آدمی جگہ چھوڑتا ہے تو اپنے پیچھے کتنا بڑا گھاؤ چھوڑ جاتا ہے۔جسے عرف عام میں خلا کہتے ہیں۔ حالانکہ خورشید اور سلمہ کا وجہ سے مجھے کافی پریشانی ہوئی۔میری آزادی بڑی حد تک سلب ہوگئی تھی

پھر بھی مجھے ان کے جانے سے زندگی میں کمی کا احساس ہوا۔ ۱۵/جولائی ۴۶ء۔
میں کئی روز کی علالت کے بعد آج کچھ سکون محسوس کر رہا تھا۔ بہت دیر تک سامنے کے لان میں ٹہلتا رہا۔ میرے گھر کے سامنے والی پہاڑی پر ایک مندر ہے جسے یہاں والے پاربتی کا مندر کہتے ہیں۔ اسے مرہٹہ پیشواؤں نے بنوایا تھا۔ کہتے ہیں مندر میں بہت بیش قیمت جواہرات اب تک محفوظ ہیں۔ کل وہاں ایک میلہ تھا۔ مشہور ہے کہ میرے مکان سے لے کر مندر تک کسی زمانے میں ایک بہت بڑا تالاب تھا۔ اس کی یادگار ایک بہت بڑا گڈھا اب بھی موجود ہے جسے مہاراشٹر کلب والے بڑی تیزی سے پاٹ رہے ہیں۔ اب یہ جگہ ان کے پاس ہے۔

۱۴/نومبر سے ۱۲/جنوری تک کچھ لکھنے کو جی نہیں چاہا۔ ذہن پراگندہ رہا۔ شالیمار کی مالی حالت میں کوئی سدھار نہیں ہوا۔ میراجی ابھی تک میرے پاس ہیں۔ انھوں نے اپنی نظموں کا مجموعہ ترتیب دیا ہے۔ ناشر نہیں ملتا۔ نورالحق کے امتحان ختم ہو گئے وہ واپس حیدرآباد جا رہے ہیں۔ میراجی کا خیال ہے شاید حیدرآباد میں ناشر مل جائے ہیں اور وہ دونوں نورالحق کے ساتھ حیدرآباد جا رہے ہیں۔ حیدرآباد میں ہم نورالحق کے یہاں ٹھہرے۔ ان کے والد سے مل کر جی خوش ہوا۔ بڑے زندہ دل اور خوش باش آدمی ہیں۔ حیدرآباد میں اچانک آفتاب سے ملاقات ہو گئی۔ وہ اپنے ساتھ بیڑ لے گیا۔ بیڑ سے ہم اس کے ساتھ اجنتا گئے۔ تکلیف دہ سفر تھا۔ بیڑ سے احمد نگر تک کا سفر موٹر اور بس میں کیا۔ محنت کش طبقے کی عورتوں میں اکثر ایسی تھیں جنھیں خوش شکل کہا جا سکتا تھا میرے خیال میں یہی وہ عورتیں یا ان کی اولادیں ہیں جن کے نقوش اجنتا کے غاروں کی تصویروں میں ملتے ہیں۔ اس سفر میں سب سے فضول آدمی حکیم ظہیرالدین ملے جن کے مکان پر ہم ایک رات اورنگ آباد میں ٹھہرے تھے۔ جس فن یا شعبے کی بات کرو وہ اس کے ماہر تھے۔ ۱۲/فروری ۴۶ء۔

یہ اکیس جنوری ۴۷ء کی رات ہے۔ آفتاب بیڑ سے آیا ہوا ہے۔ شاہد لطیف اور ان کا بھانجا اطہر بھی میرے پاس ہے۔ شاہد بمبئی گیا ہے اور اطہر سو گیا ہے، آفتاب

سو گیا ہے اور میرے کمرے میں ہے۔ اب رات کے ساڑھے گیارہ بجے ہیں۔

نورالحق پریشان ہو گا۔ وہ میراجی اور محمد حسین کے ساتھ دوسرے کمرے میں ہے۔ میراجی اور محمد حسین دونوں پیے جا رہے ہیں اور کبھی روتے ہیں کبھی ہنستے ہیں میراجی ہر وقت ہاتھوں میں دو گولے رکھتے ہیں اور مالا پہنے رہتے ہیں۔ ۲۱/جنوری ۴۷ء

"میں پچھلے دنوں بمبئی گیا تھا۔ نجم نقوی نے ڈیوڈ سے کہا مجھے بمبئی بلانا ہے پرو تما داس گپتا فلموں کی مشہور ہیروئن بھی ہے اور فلم پروڈیوسر بھی۔ وہ ایک فلم بنا رہی ہے۔ "جھرنا" فلم کا نام ہے۔ لکھنے کے لیے مجھے بلایا۔ بیگم پارہ اور پروتما ساتھ رہتی ہیں۔ میں ملا اور ان سے فلم لکھنے کا معاہدہ ہو گیا۔ ایک دو روز کے لیے پونے جاؤں گا۔ میراجی ابھی وہیں ہیں۔ اب میں شاید مستقل طور پر بمبئی آ جاؤں۔

کرشن چندر سے بھی ملاقات ہوئی۔ وہ ثمینہ کو ہیروئن بنا کر کوئی فلم بنا رہا ہے "راکھ" نام رکھا ہے۔

پچھلے دنوں سرن دلی سے آئے تھے۔ میں نے انھیں زیڈ احمد سے ملوایا اور احمد نے انھیں شالیمار میں آ جانے کی دعوت دی۔ سرن پھر آنے کا وعدہ کر کے واپس چلے گئے۔

میں واپس بمبئی جانے کی تیاری میں تھا کہ ایک صاحبزادے سامان سمیت آ گئے۔ میں انھیں ایک دو بار دیکھ چکا تھا۔ زیبا کے بھائی ہیں۔ میں نے ان سے کہا اپنے آنے کی خبر تو دیتے۔ میں تو بمبئی جانے کا ارادہ کر رہا ہوں۔ انھوں نے کہا ایک روز کے لیے آیا ہوں آپ سے کام تھا۔ کھانا کھانے کے بعد کہنے لگے میں زیبا کا پیغام لے کر آیا ہوں۔

"کیسا پیغام" ؟ کہا "آپ ان سے شادی کر لیجیے"۔

زیبا اچھی عورت تھی مگر اس سے شادی کا خیال تو میرے ذہن میں کبھی نہیں آیا تھا۔ وہ میرے ڈھب کی عورت ہی نہیں تھی۔ اچھی دوست تھی مگر بیوی نہیں بن سکتی تھی۔ اس کے علاوہ شادی تو میری طے ہو گئی تھی۔ سلطانہ کے ساتھ

میں نے ان سے کہا میں بمبئی آؤں گا تو زیبا سے ملوں گا۔ آپ آرام کیجیے میں ذرا اسٹوڈیو کا ایک چکر لگا آؤں۔ اگلے روز ان کو رخصت کر کے میں بمبئی چلا گیا۔ ۲۶/ مارچ ۷۴ر

آج کئی روز بعد بمبئی سے پلٹا ہوں۔ میرا جی واپس بمبئی چلے گئے۔ وہ عام طور پر موہن سہگل اور ملک کے ساتھ ٹھہرتے ہیں۔ بمبئی میں ان سے ملاقات نہیں ہوئی۔ پروتما کی کہانی پر کام کرتا رہا۔ بالکل وقت نہیں ملا۔ دو چار روز بعد پھر جاؤں گا تو ان سے ملوں گا۔ میں مدھو سودن کے پاس ٹھہرتا ہوں۔ موہن سہگل کا مکان اس کے گھر کے نزدیک ہی ہے۔

پروتما کی کہانی پر کام کرتے کرتے دن نکل جاتا ہے۔ ایک روز پوچھنے لگی "تم پیتے ہو؟"

"کبھی کبھی" میں نے کہا

وہ ہنسنے لگی۔ "روز میں کیا حرج ہے؟"

"میں نے خیام کی رباعیوں کا حوالہ دیا جس کا مطلب تھا کبھی کبھی پیو، ہنس کے پیو اور خوبصورت لوگوں کے ساتھ پیو" اس نے بڑے زور سے قہقہہ لگایا۔

"ہم خوبصورت تو ہیں"

"ہاں ــ اور ہنستی بھی رہتی ہو اس لیے ساتھ دے دوں گا۔"

وہ اندر سے بہت اچھی شراب لے کر آئی۔

اس کا باپ کسی ریاست کا دیوان تھا۔ انگریزی اور بنگالی شاعری سے بڑی دلچسپی ہے۔ چل نکلتی ہے تو بہت مزے کی باتیں کرتی ہے۔ اپنے شباب اور اپنے چاہنے والوں کا ذکر بہت ہنس ہنس کر کرتی ہے۔ ان میں سے ایک ابھی تک یاد آتا ہے۔ موسیقی میں قاضی نذرالاسلام کی شاگرد رہ چکی ہے۔ کچھ دن شانتی نکیتن بھی رہی ہے۔

"گرو دیو کو خوبصورتی بہت پسند تھی" ایک روز کہہ رہی تھی۔

"ہر فن کار کو ہوتی ہے" میں نے کہا۔

اپنے شوہر کے بہت خلاف تھی۔ کہہ رہی تھی جسم کے سوا اس کی اور کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ تنگ آکر اس نے طلاق لے لی۔ ازدواجی زندگی مشکل سے چار پانچ ہفتے نبھا پائی۔ گپ کرتے کرتے اور شغل کرتے کرتے کافی رات ہوگئی۔ میں نے کہا "میں ابھی بمبئی سے پوری طرح واقف نہیں۔ کوئی سواری ملے گی؟" اس نے اپنی گاڑی میں گھر پہنچایا۔ اس کا گھر مدھوسودن کے گھر سے بہت دور نہیں۔ وہ ورلی پر رہتی ہے۔ سمندر کے کنارے۔

پروتما اور بیگم پارہ سے اچھی خاصی نبھ رہی ہے۔ ہمارے درمیان اب تکلفات اور رسمی رویہ حائل نہیں رہا۔ ایک دوسرے سے بے تکلف دوستوں کی طرح ملتے ہیں پارہ اور پروتما کے مزاجوں میں بڑا فرق ہے۔ پارہ بہت کھلنڈری اور زندگی سے بھرپور ہے۔ پروتما سنجیدہ اور پریشان حال۔

میں نے پچھلے دنوں آئزاڈورا ڈنکن کی سوانح پڑھی۔ میں نے پروتما کو مشورہ دیا۔ وہ اپنی سوانح لکھے اچھی مزے دار ہوگی اور ڈنکن کی سوانح کی طرح اس کی سوانح کی بھی بہت اہمیت ہوگی۔ اس بات کو سامنے رکھ کر میں اکثر اس سے اس کے ماضی کے بارے میں استفسار کیا کرتا تھا۔

ایک شام ہم دونوں بیٹھے شغل کر رہے تھے۔ باتوں باتوں میں امرد پرستی اور عورتوں میں ہم جنسی کا موضوع نکل آیا۔ پروتما کے بارے میں مشہور تھا کہ اس کے ہاں ہم جنسی کا رجحان ہے۔ میں نے دبی زبان میں اس کی طرف اشارہ کیا اور وہ بے تکلفی کے ساتھ بات کرنے لگی۔ پروتما صاف گو بہت تھی۔ ہم دونوں کی دوستی کا بڑا سبب یہی تھا۔ کہ ہم بے جھجک بالغ انسانوں کی طرح بات کر سکتے تھے اپنی شادی کے سلسلے میں بتانے لگی کہ اپنے شوہر سے وہ کلکتہ میں ملی تھی۔ اس وقت بیگم پارہ سے اس کی ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ وہاں اس نے اسے پہلے منگنی کے بہانے مسلمان کیا مگر وہ منگنی نہیں تھی۔ نکاح تھا۔ جس کا پروتما کو بالکل علم نہیں تھا۔

اس کے بعد وہ بمبئی آ گئی۔ اس کا شوہر بھی آ گیا اور اس نے پر وتما کو بتایا وہ منگنی نہیں تھی نکاح تھا اور اس پر اپنے شوہر ہونے کا حق جتایا۔ مگر پر وتما نے اس کو شادی تسلیم نہیں کیا اور دوسری شادی کر لی۔ ان دنوں وہ ایک فلم "کنوارا باپ" میں کام کر رہی تھی۔ ہیروئن تھی اس فلم کی۔

اپنی ہم جنسی کے بارے میں اس نے ایک واقعہ بیان کیا۔ وہ کسی کام سے غالباً فلم شوٹنگ کے سلسلے میں دلی جا رہی تھی۔ راستے میں اس کی ہم سفر ایک ترک عورت ہو گئی۔ وہ عورت پہلے پر وتما سے بے تکلف ہوئی۔ اس کے بعد اسے شراب پلائی پھر غسل کرایا پھر اس کے ساتھ ہمبستری کی۔ پر وتما مفعول تھی اور وہ فاعل۔ میں نے کہا میری معلومات کے لیے بتا نا لڑکیاں یہ سب کیسے کرتی ہیں۔ وہ ٹال گئی۔ کہا پھر کبھی بتاؤں گی۔ ۲/ جون ۷۴ء۔

بمبئی سے واپس آیا تو دیکھا گھر میں راجکمار بیدی اپنی والدہ اور والد، بہن، وغیرہ کے ساتھ براجمان ہیں۔ کہنے لگے تھوڑے دن کے لیے ان لوگوں کو لے آیا۔ چلا جاؤں گا۔ میں خاموش ہو گیا۔ میری زندگی کا تو ڈھرّہ ہی یہ تھا۔ جسے کہیں جگہ نہیں ملتی تھی میرے گھر آ جاتا تھا۔ سلمہ صدیقی اور خورشید منیر رہے۔ ایک بنگالی میوزک ڈائرکٹر جسے شالیمار میں ملازمت مل گئی تھی اپنی بہن کے ساتھ رہتا رہا۔ نور الحق واڈیا۔ یہیں رہتے رہے میرے پاس حالانکہ متمول باپ کے بیٹے ہیں۔ سراج رہے۔ ایک مرتبہ ایک راجزادے فرمانے لگے۔ "شام کو گھر دیر سے آیئے۔ میں اپنی دوست کو یہاں لے کر آنا چاہتا ہوں"!

بچو چلا گیا ہے۔ یعقوب اس کی جگہ آیا ہے۔ اس نے خط لا کر دیا۔ دلّی سے آیا تھا۔ سلطانہ کی بڑی بہن امجدی بیگم کا۔ اس میں دلّی کی فضا اور حمیدہ عارف کا ذکر تھا۔ امجدی اور عارف ایک ہی اسکول میں پڑھاتی تھیں۔ امجدی ڈرائنگ سکھاتی تھیں عارف سلطانہ کی استانی بھی رہ چکی تھیں۔ امجدی نے ایک ضیافت کی تھی، شادی کی خوشی میں، اس میں عارف کو بلوایا تھا۔ عارف نے رخصت ہوتے وقت کہا سلطانہ

بہت اچھی لڑکی ہے تمھیں خوش رکھے گی۔ امجدی نے لکھا تھا۔ جب عارف کو اطلاع شادی کی ملی تو وہ بہت دیر تک خلا میں گھورتی رہی۔ یہ ان کا گمان بھی ہو سکتا ہے اور سچ بھی۔ جن دنوں میں کالج میں تھا لڑکے لڑکیاں جو قریب تھے۔ اکثر میری اور عارف ہی کی باتیں کیا کرتے تھے۔ میں عارف کے ساتھ وہ قربت نہیں محسوس کر سکا جو سلطانہ کے ساتھ ہوئی۔

دلّی کی فضا کے بارے میں لکھا ہے۔ "رات بھر سو نہیں سکتے۔ ہر طرف سے اندھیرے میں ہر ہر مہادیو' اور اللہ اکبر' کے نعروں کی آوازیں آتی رہتی ہیں"۔

جب سلطانہ سے میری ملاقات ہوئی تھی ان دنوں یہ لوگ چیلوں کے کوچے میں دریا گنج میں رہتے تھے۔ بعد میں مجاہد علی کے کوارٹر میں جو میوٹنی میموریل روڈ، پہاڑ گنج میں تھا چلے گئے تھے۔" ۴/جون ۴۷ء

کبھی کبھی سوچتا ہوں ہم بھی نباتات، جمادات، یا حیوانات کی طرح ہوتے تو کیا اچھا ہوتا۔ احساس نعمت بھی ہے اور عذاب بھی۔

ان دنوں پھر روپے کی طرف سے پریشان ہوں۔ شالیمار کی طرف گیارہ مہینے کی تنخواہ واجب الادا ہے اور اب وہاں دروازے پر تالا پڑا ہے۔ پربھات کا کام بھی کر کے دے دیا اور باقی بھی ہو رہا ہے مگر پیسہ اس کے پاس نہیں۔ جانے روپے کو مجھ سے کیا بیر ہے۔ اپنا تو خیر کسی نہ کسی طرح کام چلتا ہی رہتا ہے مگر سلطانہ کی وجہ سے فکر مند ہوں۔ انھیں ان سختیوں کی عادت نہیں ہو گی۔ کیوں ایسا کوئی کام نہ کر لیا کہ زندگی کے اتار چڑھاؤ کا کچھ اثر ہی نہ ہوتا۔ ہر کام ضرورت کے وقت ہو جاتا میں مشین کے پرزے کی طرح اپنے کام میں لگا رہتا۔

سرن میرے ساتھ ایک فلم بنانے کو کہہ رہا تھا۔ وہ لندن جا کر بیٹھ گیا۔ پربھات کے پاس پیسہ نہیں۔ نجم نقوی اپنے کام میں مصروف ہے اور میرے پاس دوسرے ذرائع نہیں۔ مگر میں جینے سے بددل اس لیے نہیں ہوتا کہ حالات ہمیشہ بہتر سے بہتر ہی ہوتے چلے گئے ہیں۔ ایک زمانے میں پانچ روپے کی ٹیوشن کر کے گزارہ کرتا تھا۔

ساغر نظامی کے یہاں ۲۵ روپے مہینہ ملتے تھے۔ سپلائی کے محکمے میں ۶۵ روپے تنخواہ تھی۔ ریڈیو اسٹیشن پر پچھتر روپے ملتے تھے۔ شالیمار میں ڈیڑھ سو مہینہ پر ملازم ہوا تھا۔ اب بارہ سو مہینہ ملتے ہیں۔ قدم تو پیچھے نہیں ہٹا۔ ہو رہے گا کچھ نہ کچھ گھبرائیں کیا۔ ۲۷/جون ۴۷ء

اب میں جن کا حوالہ دے رہا ہوں یہ اس ڈائری کے آخری صفحات ہیں۔ ان پر ۱۶/جنوری ۴۹ء کی تاریخ پڑی ہے۔ اس دوران جو گزری اس کا خلاصہ یہ ہے کہ ہندوستان کا بٹوارہ ہو گیا۔ زیڈ احمد ہندوستان چھوڑ کر لاہور چلے گئے۔ گیتا نظامی، نظامی کو چھوڑ کر دیدی کے ساتھ چلی گئی اور اس کے ساتھ شادی کر لی۔ نظامی بھی لاہور چلا گیا۔ تو یگ میں ویدی ایک فلم کمرہ ۹ بنا رہے تھے۔ گیتا اس فلم کی ہیروئن تھی۔ میں اپنا مکان راجکمار بیدی کی نگرانی میں چھوڑ کر مدھوسودن کے پاس بمبئی آ گیا۔ کبیر ایک اخبار نویس تھے۔ اردو کا ایک روزنامہ "اقبال ڈیلی" کے نام سے نکالتے تھے۔ نجم نقوی ان کے لیے ایک فلم ڈائرکٹ کر رہے ہیں۔ میں وہ لکھ رہا ہوں۔ نجم نقوی ۲۲ ٹرنر روڈ باندرہ میں رہتے ہیں۔ ان کے برابر جو صاحب رہتے ہیں ان کا نام شیرازی ہے ایرانی ہیں۔ وہ ہندوستان چھوڑ کر پاکستان جا رہے ہیں۔ میں ان کا مکان لینے کی کوشش کر رہا ہوں۔ وہ چار ہزار روپے مانگ رہے ہیں۔ تقسیم کے بعد پتہ چلا سلطانہ کا گھر فسادیوں نے لوٹ لیا۔ وہ بمشکل تمام گھر سے بھاگے اور اپنی جان بچائی سلطانہ آصف علی بیرسٹر کی بہن ہیں۔ وہ امریکہ میں سفیر کے عہدے پر ہیں۔ اتفاق سے وہ دلّی آئے ہوئے تھے۔ کسی طرح ان لوگوں نے انھیں اطلاع دی اور فوج کی نگرانی میں یہ سب گھر کے لوگ پہلے پٹیل کے یہاں گئے اور پھر وہاں سے مولانا آزاد کے پاس چلے گئے اس کے بعد آصف علی کے پرانے مکان جو چیلوں کے کوچے میں تھا۔ وہاں جا کر ٹکے۔ مجھے پتہ چلا سب لوگ کراچی جا رہے ہیں۔ امجدی بیگم سرن کی وجہ سے نہیں جانا چاہتی تھیں۔ میں نے انھیں لکھا سلطانہ کو بمبئی بھیج دو۔ میں اس لیے نہیں جا پایا کہ ملک میں بدامنی کے سبب سفر کرنا مشکل تھا۔ دوستوں نے جانے کا

مشورہ نہیں دیا۔ ٹکٹ بھی نہیں مل رہے تھے۔ میں ابھی ماٹنگا والے مکان میں مدھوسودن کے ساتھ ہی تھا کہ سلطانہ آگئیں۔ سرن لے کر آئے تھے۔ وہ چھوٹا سا مکان تھا۔ دو کمرے، باورچی خانہ اور غسل خانہ وغیرہ۔ میں باورچی خانہ میں سوتا تھا۔ سلطانہ آئیں تو ان کے لیے بھی وہی کمرہ تھا۔ مگر کچھ دن بعد نجم نقوی والا مکان مل گیا اور میں وہاں منتقل ہو گیا۔ چار ہزار روپے شیرازی کو دیے جس میں سے دو ہزار نجم سے مستعار لیے تھے۔ اور مشق سخن کے ساتھ چکی کی مشقت بھی شروع ہو گئی یعنی کہ میں ازدواجی زندگی میں بندھ گیا۔

باب (۱۲)

شادی کے دو تین مہینے بعد سلطانہ جب دلّی سے بمبئی آئیں اس وقت میں مدھوسودن کے پاس دادر میں ٹھہرا ہوا تھا۔ ۲ر مئی ۱۹۴۷ء کو ہمارا نکاح ہوا تھا۔ جمیل الدین عالی نے یہ شرارت کی کہ نکاح میں شہدے لے آیا۔ جنھوں نے نکاح کی رسم ختم ہوتے ہی اپنے فن کا مظاہرہ شروع کر دیا۔ اس شادی میں میرے والد اور چچا بھی شریک تھے۔ شہدوں کی حرکتوں سے وہ بہت مکدّر ہوئے۔ خیر، تو نکاح کے بعد ہی یہ طے ہوا رخصتی کی رسم کسی بہتر وقت پر ملتوی کر دی جائے۔ بہتر وقت جس کے انتظار میں انسان جیتا مرتا رہتا ہے۔ مگر یہ اکثر اوقات یا خواب بنا رہتا ہے یا آکر یوں نکل جاتا ہے۔ پتہ ہی نہیں چلتا کب آیا کب نکلا۔ ہوا یوں کہ میں نکاح کے بعد واپس پونا پہنچا تو شالیمار پکچرس کی حالت دگرگوں تھی۔ سوچا یہ تھا واپس پونا پہنچ کر رخصتی کی تاریخ اور دن آرام سے طے کروں گا مگر وہ آرام کا لمحہ آتے آتے کنّی کاٹ نکل گیا اور میں دُبدا میں پڑ گیا کہ کیا کروں، کہاں جاؤں؟

میری پہلی فلم "غلامی" تھی۔ اس میں ایک ایکٹر ڈیوڈ تھا۔ وہ میرا پکا دوست بن گیا تھا۔ دوسری فلم "پرتھوی راج سنجوگتا" نجم نقوی نے ڈائریکٹ کی تھی۔ وہ بھی بمبئی چلے گئے تھے۔ ڈیوڈ اور نجم نقوی دونوں نے وعدہ کیا تھا۔ وہ مجھے بمبئی بلوالیں گے مگر کب؟ یہ طے نہیں ہوا تھا۔ میں ان کے بلاوے کا انتظار ہی کر رہا تھا کہ شالیمار کا زوال شروع ہوگیا اور ملک کا بٹوارہ بھی ہوگیا۔ دلّی سے سلطانہ کی بڑی بہن امجدی بیگم نے اطلاع دی گھر کے سب لوگ لاہور جارہے ہیں۔ تقسیم ملک کے فوراً بعد دلّی اس دور سے گزر رہا تھا جو اس نے ۱۸۵۷ء میں دیکھا تھا جسے ہندوستان کی تاریخ میں غدر کا نام دیا گیا تھا۔ امجدی بیگم نے لکھا ان کا گھر لٹ گیا۔ بلوائی آئے اور گھر کا سارا سامان لاریوں میں لاد کر لے گئے۔ گھر کے لوگ ننگے پاؤں ننگے سر گھر چھوڑ کر بھاگے۔ ایک دوپٹہ کو پھاڑ کر اس کے دو حصّے کیے اور کسی طرح سر چھپایا اور

پہاڑ گنج کے پولیس اسٹیشن میں جاکر پناہ لی۔ یہ لوگ بیرسٹر آصف علی کے قریب ترین رشتہ داروں میں تھے۔ سلطانہ کی والدہ آصف علی کی چچی تھیں۔

آصف علی ان دنوں امریکہ کے سفیر تھے آئے ہوئے تھے۔ کسی طرح ان سے رابطہ قائم کیا گیا اور یہ سب فوج کی نگرانی میں پولیس اسٹیشن سے مولانا آزاد کے یہاں چلے گئے۔ وہاں سے لاہور جانے کا ارادہ کر رہے تھے۔ اس لیے کہ بڑے بھائی حامد علی لاہور چلے گئے تھے۔ امجدی بیگم، اسے بھوشن سے شادی کرنا چاہتی تھیں اس لیے ہندوستان چھوڑ کر نہیں جانا چاہتی تھیں۔ وہی صورت حال سلطانہ کو در پیش تھی۔ ان کا بھی نکاح ہو چکا تھا۔ لاہور چلی گئیں تو پھر خدا جانے کیا صورت پیش آ جائے۔ میں اسی الجھن میں تھا کہ اب کیا کروں کہ نجم نقوی اور ڈیوڈ دونوں کا پیغام ملا فوراً بمبئی آ جاؤں اور میں بمبئی چلا گیا۔ گھر کا سامان راج کمار بیدی کی نگرانی میں چھوڑا جو ان دنوں میرے پاس ٹھہرے ہوئے تھے۔ بمبئی آکر مدھوسودن کے پاس ٹھہرا اور امجدی بیگم کو لکھ دیا سلطانہ کو میرے پاس بھیج دیں۔ مدھوسودن اپنے بڑے بھائی کے پاس رہتے تھے۔ یہ دو کمروں کا مکان تھا۔ میں باورچی خانے کے فرش پر سوتا تھا۔ کہاوت ہے چمگادڑ کے مہمانوں کو بھی الٹا ہی لٹکنا پڑتا ہے۔ سلطانہ آئیں تو وہیں باورچی خانے کے فرش پر سونا پڑا۔ بمبئی آکر پرو تماداس گپتا اور گریٹ انڈیا پکچر کی فلمیں لکھنے کو ملیں۔ گریٹ انڈیا کی فلم کا نام "پرائی آگ" تھا جسے نجم نقوی ڈائریکٹ کر رہے تھے۔

نجم نقوی باندرہ رہتے تھے۔ ۲۲ ٹرنر روڈ پر۔ باندرہ اس وقت بمبئی کے مضافات میں شمار ہوتا تھا۔ کہانی پر نشست کے سلسلے میں مجھے ہر روز نجم نقوی کے یہاں باندرہ آنا پڑتا تھا۔ نجم نقوی کے برابر کے مکان میں شیرازی نام کے ایک صاحب رہتے تھے۔ ایک روز معلوم ہوا نقل مکان کر کے وہ کراچی جا رہے ہیں۔ میں نے نجم نقوی کے ذریعے ان سے بات کی۔ اور وہ فلیٹ مجھے مل گیا۔ چار ہزار روپے میں معاملہ طے ہوا تین ہزار میرے پاس تھے۔ ایک ہزار نجم سے لیا اور میں اس مکان میں منتقل ہو گیا۔

سلطانہ دلی سے آ تو گئیں تھیں مگر ہر وقت پراگندہ خاطر رہتی تھیں۔ ایک طرف والدین سے اچانک الگ ہونے کا غم، دوسری طرف دلی کے اندوہناک واقعات جن سے گزر کر وہ آئی تھیں۔

یہ جس فوجی گاڑی میں مولانا آزاد کے یہاں گئی تھیں اس کی ساری تفصیل ان کے ذہن پر مرتسم تھی۔ سڑکوں پر پڑی ہوئی لاشیں جن پر سے فوجی گاڑیاں گزر کر جا رہی تھیں، ان کے بوجھ سے مردوں کے ہڈیاں ٹوٹنے کی آواز، ان بلوائیوں کے چہرے جنھوں نے ان کا گھر لوٹا تھا۔ انھیں سکھوں کو دیکھ کر ڈر لگتا تھا اور اندر گھر میں چلی جاتی تھیں۔ اس لیے کہ جنھوں نے انھیں لوٹا تھا وہ سکھ تھے۔ ان کے دل سے ڈر نکالنے کے سلسلے میں سکھ دوستوں کو پکڑ پکڑ کر لاتا تھا۔ ایک کپڑا بیچنے والے سردار جی تھے۔ کافی عمر رسیدہ تھے۔ وہ بھی فساد کی صعوبتیں جھیل کر بمبئی آئے تھے۔ انھیں میں نے سارا واقعہ سنایا۔ وہ اکثر آکر بیٹھ جاتے تھے اور سلطانہ سے "پتری پتری" کہہ کے ادھر اُدھر کی باتیں کرتے رہتے تھے۔

گھر میں ابھی تک بے سرو سامانی کا عالم تھا۔ سامان ابھی تک پونا میں تھا۔ نوکر بھیج دیا تھا۔ سامان لانے کے لیے پر وہ ابھی آیا نہیں تھا۔ اس دوران ہم بھی باہر کھانا کھا لیتے تھے کبھی میں نجم کے اصرار پر سلطانہ کو ان کے یہاں بھیج دیتا تھا۔ مگر انھیں وہاں جانا پسند نہیں تھا۔ جب جاتی تھیں نجم کی والدہ پوچھتی تھیں۔ "تمھارا سامان کب آئے گا" خدا خدا کر کے ملازم سامان لے کر آگیا۔ اور ہماری ازدواجی زندگی شروع ہوگئی۔

میں ٹرنر روڈ پر منتقل ہوگیا تو میراجی ملنے آئے۔ پونا سے آنے کے بعد سے اب تک ان کے پاس رہنے کا کوئی مستقل ٹھکانہ نہیں تھا۔ کبھی دادر میں موہن سہگل کے یہاں سو جاتے تھے کبھی ریڈیو اسٹیشن کی دفتر کی میز پر کبھی کہیں اور۔ پونا چھوڑنے سے پہلے میری ملاقات ساقی نام کے ایک اخبار نویس سے ہوئی تھی۔ میں بمبئی آیا تو وہ ملے اور بتایا وہ لاہور جا رہے ہیں کالے گھوڑے پر ان کے پاس ایک کمرہ تھا۔ اس کی چابی وہ مجھے دے گئے۔ مدھوسودن ابھی اپنے بھائی ہی کے پاس تھے۔ میں نے اس کمرے کی چابی مدھوسودن کو دے دی اور ان کے ساتھ میراجی کو نتھی کر دیا۔ کثرت شراب نوشی سے میراجی کی آنتوں میں زخم ہو گئے تھے جس کے لیے وہ ہومیوپیتھی دوائیں استعمال کرتے رہتے تھے۔ مدھوسودن کبھی ملنے آتے تھے تو بتاتے تھے۔ میراجی کے ساتھ ان کی خاصی کھینچ تان رہتی ہے۔ میراجی کو نہانے کی عادت نہیں تھی، مدھوسودن باقاعدہ نہاتے تھے۔ اس کے علاوہ اور بہت سی عادتیں تھیں میراجی کی جنھیں

مدھو سودن ناپسند کرتے تھے۔ مدھو سودن تو کبھی کبھی آتے تھے مگر اتوار کے دن میراجی باقاعدہ آتے تھے اور شام تک رہتے تھے۔ اس کے علاوہ اور کئی دوست تھے جو میرے یہاں آتے رہتے تھے۔ جیسے راجہ مہدی علی، ساحر لدھیانوی اور ایک دو جن کے نام اس وقت ذہن میں نہیں آرہے۔ مہدی علی کو کھانے کا بہت شوق تھا۔ آخر زمانہ میں ان کے جسم میں خون کے بجائے پانی بھر گیا تھا۔ اسی میں ان کا انتقال ہوا۔ بہت دلچسپ آدمی تھے۔ ہر وقت کوئی نہ کوئی ایسی بات کرتے رہتے تھے کہ ہنسی آئے۔ انھیں مجسّم ظرافت کہنا چاہیئے۔ یہ صفت میراجی میں بھی تھی مگر ہنسی کی بات کرتے وقت چہرہ ان کا بالکل سنجیدہ رہتا تھا۔ یہ خوبی ساحر لدھیانوی میں بھی تھی۔ مگر اس کے جملوں میں مزاح کے ساتھ طنز کا پہلو زیادہ ہوتا تھا۔

فلموں کے لیے گانے لکھنے سے پہلے ساحر لدھیانوی نے منظرنامے اور مکالمے لکھنے کی کوشش کی تھی۔ ایک بار میرے پاس ایک کہانی کا خاکہ لے کر آئے۔ کہا پروڈیوسر شیخ مختار کی کہانی ہے۔ مجھ سے لکھوانا چاہتے ہیں۔ بتاؤ اس کا منظرنامہ کیسے بنے گا۔ جلدی جلدی میں جو اس کی شکل بن سکتی تھی۔ میں نے بنانے کی کوشش کی۔ مگر اس میدان میں ان سے گاڑی چلی نہیں۔ اسی دوران کسی نے گانا لکھنے کی فرمائش کر دی اور وہ اس طرف رجوع ہو گئے۔ ایک بار وہ اور میں دونوں کاروار اسٹوڈیو میں تھے۔ اردرا نام کا ایک پروڈیوسر تھا جو صادق بابو سے اپنی فلم ڈائریکٹ کرنا چاہتا تھا۔ صادق بابو اس زمانے کے ایک مشہور ڈائریکٹر تھے۔ اردرا کھڑا تھا صادق بابو کرسی پر بیٹھے تھے۔ اردرا نے بیٹھ کر صادق کے پاؤں کا انگوٹھا پکڑ لیا اور کہنے لگا بابو جب تک میرا کام نہیں کریں گے میں یہ انگوٹھا نہیں چھوڑونگا وہ بات تو ہنسی میں ٹل گئی پر جب اسٹوڈیو سے نکلنے لگے تو میں نے ساحر سے کہا دیکھو کامیابی کا گُر یہی ہے کسی کا انگوٹھا پکڑ لو۔ چند روز بعد ساحر مجھے ملا تو ہنس کر کہنے لگا میں نے برمن کا انگوٹھا پکڑ لیا۔ برمن اس زمانے کے بڑے میوزک ڈائریکٹر تھے۔ ساحر نے ان کی کئی فلمیں لکھیں جو بہت کامیاب ہوئیں۔

میرے اور سلطانہ کے ٹرنر روڈ پر آنے کے کچھ دن بعد سلطانہ کی بڑی بہن بھی آگئیں اور ان کے پیچھے پیچھے اسے بھوشن بھی آ گئے۔ ان سے میری پہلی ملاقات دلّی میں سلطانہ کے

مکان پر ہوئی تھی۔ وہ ٹھیک کیا کرتے تھے مجھے اس کی تفصیل نہیں معلوم تھی۔ صرف اتنا سنا تھا کہ وہ اسٹیج پر ناچتے ہیں۔ اودے شنکر کے ٹروپ میں کام کرتے ہیں۔ اور زیادہ تر الموڑے میں رہتے ہیں۔ وہ امجدی بیگم سے شادی کرنا چاہتے تھے۔ جب دونوں میرے پاس آ گئے تو میں نے کبار جسٹرار کے یہاں درخواست دے دو اور پندرہ دن بعد شادی ہو گئی۔ اسے کبھوشن ناشتہ کر کے صبح ہی نکل جاتے تھے اور شام کو گھر آتے تھے۔ کچھ دن بعد امجدی بیگم نے بھی ایک لڑکیوں کے اسکول میں ملازمت کر لی۔ وہ بھی صبح ہی چلی جاتی تھیں اور زندگی کا یہ ڈھرہ کچھ دن اسی طرح چلتا رہا۔

اس مکان میں آنے کے بعد آس پاس کے لوگوں میں سب سے پہلے جس سے ملاقات ہوئی وہ ایوب سرور تھے۔ وہ باندرہ میں میرے گھر کے قریب ہی رہتے تھے اور مجھ سے واقف بھی تھے۔ میں چاہتا تھا آس پاس کے لوگوں میں کسی سے ملنا جلنا ہو تو سلطانہ کہیں جا سکیں۔ ایوب سرور بڑے دل افروز سے آدمی تھے۔ انھیں کہانیاں لکھنے کا شوق تھا۔ ہم ان کے گھر گئے۔ وہ پشاور کے رہنے والے تھے۔ بڑا بھرا پرا کنبہ تھا۔ ان کے والد، والدہ، چھ بہنیں، چھ بھائی۔ سب سے ملاقات ہوئی۔ گھر کے لوگوں میں تھوڑا بہت ادب کا ذوق بھی تھا۔ ہم اکثر وہاں آنے جانے لگے اور سب سے بڑے گھریلو سے مراسم ہو گئے۔ سب سے بڑی بہن آپا کہلاتی تھیں۔ ان کے بعد تاج تھیں۔ پھر اختر، سعیدہ، فریدہ اور فوزیہ۔ بھائیوں میں بڑے نور محمد تھے پھر ایوب سرور، یوسف خاں، ناصر خاں، احسن اور اسلم۔ اب آپا، ایوب سرور اور ناصر خاں اس دنیا میں نہیں ہیں، اللہ کو پیارے ہو گئے۔ ناصر خاں اور یوسف خاں دونوں فلموں سے متعلق ہو گئے تھے۔ یوسف خاں دلیپ کمار کے نام سے جانے گئے اور اپنے وقت کے بے انتہا مقبول اور چوٹی کے اداکار بن گئے۔ میرے مراسم ان سب سے ابھی تک اسی طرح استوار ہیں۔ سعیدہ کبھی کبھی ملنے اب بھی آ جاتی ہیں۔

شالیمار چھوڑنے کے بعد بمبئی میں میری فلمی زندگی کا بھی ایک طرح سے آغاز ہی ہی تھا۔ آزاد پیشگی چل نکلے تو کام ہی کام ہے، نہ چلے تو آدمی نان شبینہ کو محتاج ہو جاتا ہے۔ نجم نقوی کی 'پرائی آگ' ختم ہو گئی تھی۔ گریٹ انڈیا پکچرس کے مالک کبیر احمد دوسری

تصویر" بنانے کا ارادہ کر رہے تھے۔ ان دنوں ایس۔ ایم۔ یوسف بھی ایک مقبول فلم ڈائریکٹر تھے۔ "پرائی آگ" بنانے کے لیے پروڈیوسر کبیر نے ہدایت کار کے لیے ایس۔ ایم یوسف کا انتخاب کیا تھا۔ پیشگی کے طور پر انھیں کچھ روپیہ بھی دیا تھا مگر کسی وجہ سے فلم ان سے نہیں بنوائی۔ نجم نقوی سے بنوائی۔ دوسری تصویر کے لیے کبیر صاحب نے پھر ایس۔ ایم یوسف سے بات کی اور وہ تیار ہو گئے۔ کہانی کی تلاش شروع ہوئی۔ میرے پاس ایک کہانی تھی۔ نام یا عنوان "بکھرے موتی" تھا۔ وہ ایک نفسیاتی مریض کی کہانی تھی جو بہت دولتمند ہے مگر کنوارا۔ جو لڑکی اسے پسند آتی ہے اس کے آگے اپنی تنہائی اور بدنصیبی کا رونا روتا ہے۔ اپنے روپیہ اور دولت کے زور پر اسے لبھاتا ہے، اپنے قریب لاتا ہے اور آخر میں اسے خراب کر دیتا ہے۔ اس مرکزی کردار کے لیے جس کا انتخاب کیا گیا وہ فلموں میں جینت کے نام سے مشہور تھے۔ ان کا اپنا نام زکریا خان تھا۔ آگے چل کر وہ میرے سمدھی بنے ان کے بیٹے امجد خان سے میری بڑی بیٹی شہلا کی شادی ہوئی۔ اس مرکزی کردار کے علاوہ اور ایک دو لڑکے اور تین لڑکیاں چاہیئے تھیں۔

فلم کے لیے ابھی لڑکیوں کی تلاش جاری ہی تھی کہ ایک روز زیبا میرے یہاں آگئی۔ کام کی تلاش وہ اکثر نجم نقوی کے پاس آیا کرتی تھی۔ پتہ چلا میں پڑوس میں آگیا ہوں تو میرے پاس بھی آئی۔ اس کے لیے میں نے شالیمار پکچرس میں بھی کوشش کی تھی مگر جو کردار اسے دیا گیا وہ اس نے کیا نہیں تھا۔ میں نے وہی بات دہرائی۔ کہنے لگی نہیں اب وہ ایسا نہیں کرے گی اسے کام کی ضرورت ہے۔ میں نے اسے کبیر اور ایس۔ ایم یوسف دونوں سے ملوا دیا اور اسے ہیروئن کے رول کے لیے لے لیا گیا۔

ایس ایم یوسف صاف دل کا آدمی نہیں تھا۔ جب اس کے ساتھ تھوڑا خلط ملط ہوا تو اس نے پروڈیوسر کبیر کا ذکر بڑی حقارت سے کیا۔ اور معلوم ہوا اس نے کبیر کی فلم بنانے کا وعدہ اس سے انتقام لینے کے لیے کیا تھا۔ کبیر نے اس سے معاہدہ کر کے فلم نجم نقوی سے بنوائی تھی۔ یہ بات اسے کھل گئی تھی۔ عورت بھی ایس ایم یوسف کی بڑی کمزوری تھی۔ خود زیبا بھی کم نہیں تھی فلم کی شوٹنگ کے دوران زیبا اور یوسف اتنے قریب آگئے کہ دونوں نے

شادی کر لی۔ کچھ دن بعد" بکھرے موتی" کی رفتار دھیمی پڑ گئی۔ پھر لنگڑا کر چلنے لگی۔ زیبا مجھ سے بہت بے تکلف تھی۔ حال میں باندرہ ہی میں اس نے مکان خریدا تھا۔ ایک روز میں اس سے ملنے گیا۔ مجھے اس کی باتوں سے لگا جیسے وہ بہت خوش نہیں ہے۔ میں نے کہا زیبا تم نے یوسف سے شادی تو کر لی مگر اپنا سب کچھ اس کے حوالے مت کر دینا۔ تم میری دوست ہو اس لیے کہہ رہا ہوں۔ روپیہ پیسہ سنبھال کے رکھنا۔ وہ بچوں کی طرح رونے لگی۔ اور بہت دیر تک روتی رہی۔ پھر بتایا مکان، روپیہ وغیرہ سب یوسف نے لے لیا۔ یوسف کی پہلی بیوی موجود تھی۔ وہ اپنے بڑے بیٹے کو لے کر کراچی چلی گئی۔ کچھ دن بعد ادھوری فلم اور زیبا کو چھوڑ کر یوسف بھی چلے گئے۔ میں بے روزگار ہو گیا۔ زیبا نے ایک اور بڑے پروڈیوسر سے شادی کر لی۔ وہ ایک بہت بڑی فلم بنا رہا تھا۔ جس میں مدھو بالا اور دلیپ کمار کام کر رہے تھے۔ اس میں ایک اہم کردار بھی ادا کیا۔ فلم بنانے کے بعد وہ پروڈیوسر بھی سدھار گیا۔ زیبا آج کل ہندوستان سے باہر اپنی بیٹی کے پاس رہتی ہے۔ وہ بیٹی بھی ایس۔ ایم۔ یوسف سے ہے اب یوسف کا بھی انتقال ہو گیا ہے۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔ کہتے ہیں جب انسان زندہ رہے جینے کا کوئی نہ کوئی بہانہ نکل ہی آتا ہے۔ نجم نقوی نے ایک فلم شروع کی جس کا نام " رنگیلی" تھا۔ اس فلم میں ریحانہ اور راجکمار تھے۔ ریحانہ تو میرے گھر کے سامنے ہی رہتی تھی۔ اس سے گاہے گاہے ملاقات بھی ہوتی رہتی تھی۔ کبھی کبھی میں اس کے یہاں جا کر اس سے اور اس کے بھائی کے ساتھ ٹیبل ٹینس کھیلا کرتا تھا۔ مگر راجکمار نئے اداکار تھے۔ وہ سی آئی ڈی کی ملازمت چھوڑ کر فلم میں آئے تھے۔ اچھے قد آور دل پسند سے آدمی تھے۔ دھیرے دھیرے ان سے دوستانہ مراسم قائم ہو گئے۔ جو آج تک اسی طرح استوار ہیں۔ خیر میں تو اس فلم " رنگیلی" میں مصروف تھا کہ بیچ میں ایک نئی کہانی شروع ہو گئی۔ نجم نقوی کے یہاں ایک لڑکا ملازم تھا۔ ہندو لڑکا تھا۔ ایک روز دو سپاہی آئے اور اس لڑکے کو لے گئے۔ نجم پریشان تھے لڑکا واپس نہیں آیا۔ پولیس کیوں لے گئی ہے۔ کہیں کوئی حادثہ نہ ہو گیا ہو۔ وغیرہ وغیرہ۔ کہ لڑکا واپس آ گیا۔ جو سپاہی لے کر گئے تھے وہی واپس چھوڑ گئے۔ کسی نے پولیس کو اطلاع دی تھی ایک مسلمان گھر کے لوگ ایک ہندو لڑکے کو مسلمان بنا رہے ہیں۔ مگر چوکی میں جا کر لڑکے نے

بیان دیا اسے کوئی مسلمان نہیں بنا رہا ہے غلط بات ہے۔ پولیس نے لڑکے کو واپس بھیج دیا مگر رپورٹ کس نے کی تھی۔ یہ پتہ نہیں چلا۔ کچھ دن بعد میرے ایک دوست نعیم الحق مجھ سے ملنے آئے۔ وہ میرے اینگلو عربک کالج کے ساتھی تھے اور یہاں ٹاٹا انسٹی ٹیوٹ سے سوشل سائنس کا ڈپلوما کیا تھا۔ اور اب کراچی جا رہے تھے۔ ان کے ساتھ ایک لڑکی تھی۔ جس کا نام جمنا تھا۔ وہ ایک زمانہ میں ریڈیو پر اناؤنسر تھی۔ نعیم نے مجھے بتایا انھوں نے جمنا سے شادی کر لی ہے اور اب اس کا نام حمیدہ ہے۔ یہ شادی باقاعدہ عدالت سے اجازت لے کر کی گئی ہے۔ اور وہ کراچی جانے سے پہلے ایک دو روز میرے پاس رہنے کے لیے آئے ہیں۔ "بچشم ما روشن دل ما شاد" میں نے کہا مگر شام کو جب گھر واپس آیا تو معلوم ہوا حمیدہ اور نعیم نہیں ہیں۔ مجھے تشویش ہوئی اور پوچھ تاچھ کے بعد پتہ چلا دونوں پولیس کی حراست میں ہے۔ نعیم پولیس کی حراست میں ہے اور حمیدہ ایک ہندو ہوم میں کسی نے پولیس کو اطلاع دی تھی ایک مسلمان لڑکا ایک نابالغ ہندو لڑکی کو اغوا کر کے پاکستان لے جا رہا ہے۔ نعیم نے مقدمہ لڑنے کے لیے بیرسٹر رفیق زکریا کو کیا تھا۔ جب مقدمہ عدالت میں پیش ہوا تو حمیدہ نے بیان دیا۔ سب غلط ہے، وہ اپنی مرضی سے مسلمان ہوئی ہے اور یہ کہ وہ بالغ ہے۔ ثبوت میں اس نے اپنے کاغذات عدالت میں پیش کیے اور نعیم اور حمیدہ کو بری کر دیا گیا اور وہ دونوں کراچی چلے گئے۔

گھر کی فضا مکدر دیکھ کر میں نے سلطانہ کو کچھ دن کے لیے کراچی بھیج دیا۔ جب یہ گئیں۔ اس وقت ہندوستان پاکستان کے درمیان کوئی ویزا، پاسپورٹ کا سلسلہ نہیں تھا مگر جب انھوں نے واپس آنا چاہا تو دقت ہوئی۔ سی۔ آئی۔ ڈی آفس سے یہ سند لینی تھی کہ میں ہندوستانی ہوں اور سلطانہ میری بیوی ہے۔ جتنے کاغذات، نکاح نامہ جو بھی میرے پاس تھا۔ سب دفتر میں پیش کر دیا مگر مطلب براری نہیں ہوئی۔ ایک روز جو گیا تو پرانے افسر کی جگہ ایک اینگلو انڈین تھا۔ میں نے وہی کاغذات اس کے آگے رکھ دیے۔ ان میں میرا اسکول کا سرٹیفکیٹ بھی تھا جو صوفی صغیر حسن نے دیا تھا۔ اس نے وہ پڑھا تو مسکرایا اور کہا "تم نے بہت مصیبت جھیلی ہے"۔ میں نے کہا:

"سر بہت کوشش کرتا ہوں مصیبت اب بھی ختم نہیں ہو رہی۔ اب دیکھیے

ہندوستان پاکستان تو میں نے نہیں بنوایا تھا۔ میں نے بہت منع کیا تھا مگر
کسی نے میری نہیں سنی تھی۔"

وہ ہنسنے لگا اور جو سرٹیفکٹ مجھے چاہیے تھا اس نے دے دیا اور سلطانہ واپس آگئی۔

۱۸ر اگست ۱۹۴۹ء کو میرے یہاں ایک لڑکی پیدا ہوئی جس کا نام شہلا رکھا۔ اس کی دیکھ بھال کے لیے ہم نے ایک بوڑھی عیسائی عورت کو جس کا نام ڈیون تھا ملازم رکھا۔ کچھ دن بعد کسی کام سے ڈیون گوا چلی گئی اور اپنی جگہ اپنی بیٹی آئیڈا کو چھوڑ گئی۔ گوا سے واپس آنے کے بعد ایک دن ڈیون میرے پاس آئی اور رونے لگی۔

"صاحب! یہ تم نے کیا کیا؟ اس کا مرد تو اسے گھر میں نہیں رکھے گا۔"

"کیسے؟" میں نے پوچھا۔

"آئیڈا کو۔"

"کیا ہوا آئیڈا کو؟"

اور اس نے بتایا آئیڈا حاملہ ہے اور وہ بچہ اسے بھوشن کا ہے۔ میں نے بھوشن سے کہا تو ڈھٹائی کرنے لگا۔ گو چھپی سے بچنے کا ایک ہی طریقہ تھا کہ میں چپ ہو جاؤں۔ میں نے ڈیون کو سمجھایا اور کچھ لے دے کر معاملہ رفع دفع کر دیا مگر میں پریشان ضرور ہوا اور سوچنے لگا۔ یہ سب کیا ہو رہا ہے اور یہ اسے بھوشن کیا چیز ہے۔ مجھے یہ بھی پتہ چل گیا تھا کہ نجم کے نوکر بابو اور حمیدۂ نعیم کی گرفتاری کے پیچھے بھی بھوشن ہی کا ہاتھ تھا۔ میں سوچنے لگا ایک آدمی یہ سب کچھ تو کر سکتا ہے مگر اسے بھوشن کیوں کر رہا ہے اس کی تو میں نے بہت مدد کی ہے۔

ایک روز گھر میں صرف میں اور بھوشن ہی تھے۔ میں نے پوچھا بھوشن بتا سکتے ہو یہ سب کچھ کیا ہو رہا ہے اور کیوں ہو رہا ہے۔ اس نے جواب میں مسلمانوں کو ایک موٹی سی گالی دی۔ میں نے کہا میں بھی مسلمان ہوں۔ تمہاری شادی تو مسلمان لڑکی سے میں نے ہی کرائی ہے۔ اس نے پھر بے ہودگی کی۔ مجھے عام طور پر غصہ نہیں آتا۔ میں بہت پُرامن انسان ہوں مگر اس وقت جیسے میرے سر پر جنون سوار ہو گیا۔ میں نے اسے مارنا شروع کر دیا۔

میری کوشش تھی اسے گھسیٹ کر غسل خانے میں لے جاؤں اور گلا گھونٹ کر مار دوں۔ غرضیکہ سخت لڑائی ہوئی۔ پڑوس کے لوگ آ گئے اور چھوٹ چھٹول ہوگئی۔ معاملہ پولیس تک پہنچا۔ بھوشن نے جاکر پولیس چوکی میری رپورٹ لکھوائی میں نے اس کی ناک توڑ دی۔ معائنہ کے لیے پولیس نے اسے اسپتال بھیجا جو برابر ہی کے احاطے میں تھا۔ وہاں میرے دوست ڈاکٹر ہوسے انچارج تھے۔ چوٹ بھی ایسی کوئی خاص نہیں آئی تھی۔ انھوں نے لکھ دیا کچھ نہیں ہوا۔ بات تو رفع دفع ہوگئی مگر میں نے اسے بھوشن سے کہا جس قدر جلد ممکن ہو وہ میرے گھر سے چلے جائیں اور اپنی بیوی کو بھی لے جائیں۔ اس واقعہ کے دو روز بعد میرے پاس ایک سی آئی ڈی انسپکٹر آیا اور مجھے ہیڈ آفس لے گیا۔ یہ زمانہ ترقی پسند ادیبوں اور شاعروں پر بڑی سختی کا تھا۔ بہت سے شاعر اور ادیب روپوش تھے جیسے مجروح سلطانپوری اور کچھ جیلوں میں تھے، جیسے علی سردار جعفری، ظ انصاری وغیرہ۔ ہیڈ آفس میں لاکر مجھ سے ان سب کے بارے میں سوالات کیے گئے " فلاں فلاں شاعر، ادیب کہاں ہیں۔ ترقی پسند لکھنے والوں سے آپ کا کیا تعلق ہے آپ کس سیاسی پارٹی کے ممبر ہیں۔ وغیرہ وغیرہ" مختصر یہ کہ مجھے رہا کرنے کے بجائے بغیر کسی وارنٹ رقعہ کے مجھے آرتھر روڈ جیل بھیج دیا گیا۔ پولیس مجھے اس طرح اچانک پکڑا کر لے گئی کہ میری سمجھ ہی میں نہیں آیا۔ اس پریشانی کا کیا تدارک کروں۔ میں کسی پارٹی کا ممبر تو تھا نہیں کہ کوئی میری مدد کو آتا۔ نہ دوستوں میں سے کسی کو میری اس گرفتاری کی خبر تھی۔ اسی ششش و پنج میں کیا کروں کیا نہ کروں ایک مہینہ گزر گیا۔ ایک روز جیلر میرے پاس آیا اور پوچھنے لگا میں کس جرم میں ماخوذ ہو کر جیل میں آیا ہوں۔ میں نے کہا مجھے نہیں معلوم اس نے مجھ سے ایک عرضی کمشنر کے نام لکھوائی جس کا لب لباب یہ تھا کہ یا تو وجہ بتائی جائے مجھے گرفتار کیوں کیا گیا ہے۔ کوئی وجہ نہیں تو مجھے رہا کیا جائے ورنہ میں اپنا مقدمہ عدالت کے سامنے پیش کروں گا۔ اس واقعہ کے دوسرے روز مجھے رہا کر دیا گیا اور لینے کے لیے وہی انسپکٹر آیا جو مجھے آرتھر ڈ جیل میں لے کر آیا تھا۔

راستہ میں اس انسپکٹر نے بہت باتیں کیں۔ ایسا لگا جیسے بڑا ہمدرد آدمی ہے۔ اس نے بتایا جو آدمی آپ کے ساتھ رہتا ہے وہ آپ کا ہمدرد نہیں دشمن ہے۔ وہ ہیڈ کوارٹر میں ایک

کمشنر کے پاس آتا ہے اور آپ کے خلاف شکائتیں کرتا ہے۔ اس کی کوشش یہ ہے کہ آپ کو اور آپ کی بیوی کو ہندوستان سے نکال دیا جائے اور آپ کا مکان اسے مل جائے۔ سمجھیے آپ کے سر پر تلوار لٹک رہی ہے۔ گھر آکر میں نے اسے بھوشن سے کہا کہ اب تک اس نے جو میرے خلاف کیا ہے مجھے اس کا سب کا پتہ چل چکا ہے۔ اس کی بہتری اسی میں ہے میرا گھر چھوڑ کر فوراً چلا جائے۔ اور وہ چلا گیا۔

جیل خانے کا نقصان یہ ہوا کہ جتنے لکھنے کے کام میرے ہاتھ میں تھے سب نکل گئے۔ پروڈیوسروں کے دل میں یہ خوف بیٹھ گیا یہ اب کس وقت بھی جیل جا سکتا ہے اور مجھ سے کنارہ کشی اختیار کر لی۔ اسی اثنا میں کسٹوڈین کا نوٹس آگیا "مکان خالی کر دو۔ یہ کسٹوڈین کی ملکیت ہے" میرے ایک وکیل دوست مجھے ایک مشہور اشتراکی وکیل کے پاس لے گئے جن کا نام لال بھائی تھا۔ انھوں نے میرا مقدمہ ہائی کورٹ میں داخل کر دیا مگر جرح کے دن وہ میرے حق میں ایک لفظ بھی نہیں بول سکے۔ مجھے بعد میں معلوم ہوا انھوں نے مقدمہ ہی غلط دائر کیا تھا۔ نتیجہ یہ کہ میرے مکان پر کسٹوڈین کا قبضہ ہو گیا۔ اور مجھے ۲۲ ٹرنر روڈ والا مکان خالی کرنے کا نوٹس مل گیا۔ اسی دوران میراجی کی صحت اتنی گر گئی کہ مجھے انھیں اپنے پاس لانا پڑا۔ گھر آکر میں نے ایک ڈاکٹر بلوایا جو روز انھیں دیکھنے آتا تھا مگر ان کی ضد تھی ہومیوپیتھک ڈاکٹر کو بلایا جائے۔ اب ایک جگہ ان کو دو ڈاکٹر دیکھنے آتے تھے اور دونوں کو فیس دی جاتی تھی۔ مگر دونوں کے علاج سے کوئی افاقہ نہیں ہوا۔ ان کی حالت اتنی گر گئی تھی کہ حوائج ضروری کے لیے پاخانہ تک نہیں جا سکتے تھے۔ راستہ ہی میں خطا ہو جاتا تھا۔ مہترانی نے بھی انکار کر دیا وہ صاف نہیں کرے گی' بہت بدبو آتی ہے۔ یہ کام سلطانہ کرتی تھیں ایک سولہ سال کی لڑکی جو ابھی شادی ہو کر آئی تھی۔ جسے یہاں نہ کوئی دلہن کہہ کر بلانے والا تھا نہ ہاتھوں کی چھاؤں کرنے والا اور نہ وہ ناز برداری جو عام طور پر نئے شادی شدہ گھر میں دلھنوں کی ہوتی ہے۔ اس کے برعکس ایک مریض کی دیکھ بھال اور خدمت کرنی پڑی جس سے اس کا کوئی رشتہ نہیں تھا۔ دوسرے اسے بھوشن جیسے آدمی کو برداشت کرنا پڑا۔ میں اوپر کہیں ڈاکٹر بلوے کا ذکر کر چکا ہوں۔ بھابا اسپتال جو میرے گھر سے بہت قریب تھا اس کے انچارج تھے۔

ایک روز وہ مجھ سے ملنے آئے۔ انھوں نے میراجی کی یہ حالت دیکھی تو مشورہ دیا میں انھیں ان کے اسپتال میں داخل کر دوں اور میں آمادہ ہو گیا۔ اسپتال میں داخل کرنے کے کچھ دن بعد میراجی کی ذہنی حالت بگڑ گئی۔ وہ بہکی بہکی باتیں کرنے لگے۔ اس علاج کے لیے کے۔ای۔ایم اسپتال منتقل کرنا پڑا۔ وہاں انھوں نے ایک نرس کے ہاتھ میں کاٹ لیا۔ میں نے کہا میراجی وہ تو اچھی خوبصورت نرس ہے، اس کے ہاتھ میں کیوں کاٹ لیا آپ نے۔ کہنے لگے پھر وہ مجھے انڈا کیوں نہیں دیتی۔ اس اسپتال میں وہ جس ڈاکٹر کی نگرانی میں تھے۔ وہ لاہور سے آیا تھا۔ اس نے مجھ سے پوچھا یہ وہی میراجی تو نہیں جنھیں ہم پڑھا کرتے تھے۔ میں نے کہا ہاں وہی ہیں۔ انھوں نے بڑی توجہ سے میراجی کا معائنہ کیا اور کہا ان کا علاج PSYCHOTHERA— PEUTIC SHOCKS.— ہیں۔ یہ سن کر میراجی رونے لگے۔

"اختر میں یہ علاج نہیں کرانا چاہتا۔"

"کیوں میراجی؟ آپ اچھے ہو جائیں گے۔"

"میرے COMPLEXES دور ہو گئے تو میں لکھوں گا کیسے۔"

"لکھتے تو آپ اپنی ذہانت سے ہیں۔" میں نے کہا اور میں انھیں اسپتال میں داخل کر کے گھر آ گیا۔ اگلے روز بمبئی میں شدید طوفان آیا جو دو تین دن تک نہیں رکا۔ ریلیں، بسیں سب بند رہیں۔ اور میں میراجی کو دیکھنے نہیں جا سکا۔ رات کو بیٹھا کھانا کھا رہا تھا کہ اسپتال کا تار ملا کہ "میراجی سدھار گئے" کھانا چھوڑ میں فوراً ہی نجم نقوی کو لے کر اسپتال گیا اور سب بند وبست کر دیا۔ اور اگلے روز ان کی لاش لے کر میرن لائنز کے قبرستان میں دفن کر دی۔ یہ ۳ نومبر ۴۹ء کی بات ہے۔ میراجی کے انتقال کی سب ادیبوں کو اطلاع دی مگر ترقی پسند خاص طور پر تجہیز و تکفین میں شامل نہیں ہوئے۔ اس لیے کہ میراجی رجعت پسند سمجھے جاتے تھے اور یہ فتویٰ ان پر ۱۹۴۴ء کی حیدرآباد کانفرنس میں لگایا گیا تھا۔

اسی زمانے میں میری ملاقات ایک صاحب سے ہوئی جن کا نام یوسف پیر بھائی تھا۔ اچھے دوست نواز اور ہمدرد قسم کے آدمی تھے۔ کسٹوڈین کی دی ہوئی مدت بھی ختم ہو رہی تھی میں نے پیر بھائی سے رجوع کیا۔ انھوں نے مجھے ایک پارسی خاتون سے ملوایا۔ جن کا نام

مس پاؤری تھا۔ مس پاؤری کے مکان میں ایک کمرہ خالی تھا۔ جس کا انھوں نے چھپن روپیہ بھی مانگا۔ میرے پاس وہ چھپن روپے بھی نہیں تھے۔ مگر تھوڑا بہت بھروسہ تو مستقبل پر رکھنا ہی پڑتا ہے۔ میں نے وہ کمرہ لے لیا اور میراجی کے ساتھ ماضی کی ساری پریشانیاں اور اندیشے بھی وہیں دفن کر دیے اور میں اس کمرے میں منتقل ہو گیا۔

اس وقت شہلا کی عمر ایک سال کے لگ بھگ تھی اور میرے یہاں ایک دوسرا بچہ آنے والا تھا۔ اس کمرے کی سہولتوں کا اندازہ اس بات سے لگائیے کہ اس میں پاخانہ اور غسل خانہ دونوں ہی نہیں تھے۔ مس پاؤری اوپر کے کمرے میں رہتی تھیں۔ اور برابر کے کمرے میں ایک عیسائی خاتون رہتی تھیں۔ پاخانے کا بندوبست ہم نے پانچ روپے مہینہ پر ان سے کیا اور نہانے کے لیے اوپر مس پاؤری کے یہاں جاتے تھے۔ کھانا سلطانہ اس کمرے کے برآمدے میں بناتی تھیں۔ اس مکان میں رہنے والے تقریباً سب ہی کرایہ دار خدا کی بنائی ہوئی خاص مخلوق تھے مگر میرے برابر کے دوسرے کمرے میں دو ماں بیٹے رہتے تھے جن کا مسئلہ سلجھایا نہیں جا سکتا تھا۔ پہلے تو انھوں نے اصرار کیا شہلا بڑی بی کو نانی کہے اور بیٹے کو ماموں میں مان گیا مگر ماں بیٹے کی چپقلش حل کرنا مشکل تھا۔ بڑی بی نے بیٹے کی شادی بڑے اصرار سے کی تھی مگر جب دلھن آئی تو بڑی بی نے بیٹے اور دلھن کے بیچ میں سونے پر اصرار کیا اور دلھا دلھن کی ہچر مچر کے باوجود اپنی ضد پوری کی۔ یہ گاڑی کتنے دن چلتی۔ بہو نے طلاق لے لی اور ماں پھر بیٹے کے لیے دلھن ڈھونڈنے لگیں۔ اس گھر کے برابر والے گھر میں ایک رئیس خاندان آباد تھا۔ اس گھر میں دو تین لڑکے اور پانچ چھ لڑکیاں تھیں۔ شہلا ان لڑکیوں سے بہت مانوس ہو گئی۔ بہت اچھے لوگ تھے۔ ایک دن ضرورت پڑنے پر ان کی والدہ نے مجھے سو روپے بھی دیے تھے۔ رئیس کے گھر کے برابر ماسٹر علی بخش رہتے تھے۔ ان کی دو تین بیٹیاں تھیں۔ بڑی کا نام حسینی تھا جو ماسٹر جی کی پہلی بیوی سے تھی۔ دوسری بیوی سے اور دو لڑکیاں تھیں جن کے نام مہ لقا اور رمہ جبین تھے وہ بڑی ہو کر بے بی مادھوی اور میناکماری کے نام سے مشہور ہوئیں۔ کچھ دن بعد جب میناکماری مشہور ہوئی تو ماسٹر جی نے نبوت کا دعویٰ بھی کر دیا۔ اور کوئی تو ان پر ایمان نہیں لایا۔ مگر میں لے آیا۔ اسی

لیے جب ان پر وہی آنے لگی تو خوش ہو کر سب سے پہلے مجھے سنایا کرتے تھے۔ یہ نبوت کا سلسلہ اس دن ختم ہوگیا جب انھوں نے اپنی ملازمہ سے شادی کرلی اور باپ بیٹیوں میں جوتیوں میں دال بٹی۔ دن تو کٹ رہے تھے مگر اب تک میرے پاس کوئی کام نہیں تھا۔ مہالکشمی بلڈنگ فلم کا مرکز تھا۔ اکثر فلم پروڈیوسروں کے دفتر وہاں تھے میں نے سوچا لوگوں سے ملوں اور اپنا تعارف کراؤں شاید کام مل جائیں۔ میں ایک ایک دفتر میں گیا۔ مگر حاجت برداری نہیں ہوئی۔ انھیں دفتروں میں ایک پر لکھا ہوا تھا "ایس۔ ایم۔ نواب" نئے پروڈیوسر تھے۔ فلم سازی کا کوئی تجربہ نہیں تھا مگر فلم بنا رہے تھے۔ اور خود ہی اداکار بھی تھے۔ دفتر میں گیا تو معلوم ہوا وہ آئے نہیں۔ میں اپنا نام لکھ کر چھوڑ آیا۔ اگلے روز نواب صاحب کا بلاوا آگیا۔ میں گیا۔ بڑے مہذب، خلیق اور مرنجان مرنج سے آدمی تھے۔ گیا کے بڑے زمینداروں میں ان کا شمار تھا۔ وہ بڑی محبت سے ملے اور معذرت کی کہ اس وقت ان کے پاس کوئی خاص کام نہیں مگر وہ مجھے چار سو روپے مہینہ دے سکتے ہیں۔ میں آمادہ ہوگیا۔ میں نے انھیں ایک کہانی کا خیال سنایا جو انھیں پسند آیا۔ ساز کے نام سے وہ فلم شروع ہوئی اس میں زیبا ہیروئن تھی مگر وہ فلم نہیں بنی۔

مس پادری کے مکان میں میرے یہاں ۲۳ دسمبر ۵۰ء کو ہفتہ کے روز رات کے ۱۱ بجکر ۲۵ منٹ پر ایک اور لڑکی پیدا ہوئی جس کا نام اسمار رکھا مگر اس مکان میں آئے ہوئے بہت مدت نہیں ہوئی تھی کہ مس پادری نے مکان خالی کرنے پر اصرار شروع کر دیا۔ گلی سے آتے جاتے میں دیکھتا تھا ایک مکان بن رہا ہے اور تقریباً تیار ہے۔ جس پر مکان بن رہا تھا، اس سڑک کا نام رج بلو روڈ تھا۔ ایک روز میں نے وہاں میاں محمد دین کے منیجر کو دیکھا۔ وہ مکان جو مجھ سے کسٹوڈین نے خالی کرایا تھا۔ میاں محمد دین ہی کا تھا۔ میں اس منیجر کو جانتا تھا۔ میں اس سے ملا۔ تو معلوم ہوا یہ مکان اسی کا ہے۔ اس نے کہا کہ آپ میاں صاحب سے ملیے۔ میں ان سے ملا۔ میاں صاحب نے کہا ہاں بھائی تمھارے ساتھ بہت زیادتی ہوگئی۔ پندرہ سو روپے دے دو میں منیجر

سے کہہ دیتا ہوں۔ اتنا روپیہ میرے پاس کہاں تھا مگر میاں صاحب سے دو روز کا وعدہ کر کے میں واپس آگیا۔ ابھی تک نواب صاحب کی فلم پر کام ہو رہا تھا مگر میں روپے کے سلسلے میں فکر مند تھا۔ نواب صاحب نے پوچھا کیا بات ہے، آپ فکر مند نظر آ رہے ہیں؟ میں نے وجہ بتا دی۔ انھوں نے فوراً روپے مجھے دے دیے کہا آگے آپ سمجھ لیں گے۔ مختصر یہ کہ میں نے رِی بلیو روڈ والا مکان لے لیا اور اس میں منتقل ہو گیا۔ اس کا نام زلیور ولا تھا۔ چھوٹا سا مکان تھا مگر بہت پر سکون۔ ایک سونے کا کمرہ تھا۔ ایک بیٹھک اور ایک باورچی خانہ۔ شہلا اور اسمار کے علاوہ اس گھر میں میرے یہاں دو اولادیں اور ہوئیں۔ ایک لڑکا رامش اور ایک لڑکی رخشندہ۔

زلیور ولا لینے کے کچھ دن بعد نجم نقوی ملے۔ کہنے لگے وہ فلمستان کے لیے ایک فلم بنا رہے ہیں۔ انھوں نے کمپنی کے ڈائریکٹر ایس مکرجی سے میرا ذکر کیا ہے اور ان سے کہا ہیں ان سے ملوں ان دنوں فلمستان بہت بڑا اور مشہور فلم ساز ادارہ تھا۔ میں اگلے روز مکرجی سے ملنے فلمستان گیا۔ دفتر میں گھسا تو کرسی پر سامنے ایک گورے چٹے، لمبے تڑنگے آدمی کو بیٹھے دیکھا۔ چہرے پر پولیس افسر جیسی سنجیدگی تھی۔ انھوں نے رعب دار آواز میں کہا "بیٹھیے"۔ میں بیٹھ گیا اسی آواز میں پھر کہا "کچھ سنائیے"۔ میں سمجھا کچھ گانا وغیرہ سننے کی فرمائش کر رہے ہیں مگر میں فلموں کے لیے گانے لکھتا نہیں تھا۔ میں نے معذرت کے انداز میں کہا میں تو مکالمے لکھتا ہوں۔ جو مجھے زبانی یاد نہیں مگر وہ اپنی بات پر اڑے رہے۔ میں چاہتا تھا یہ کام مل جائے۔ اور سنانے کے لیے میرے پاس کچھ تھا بھی نہیں۔ میں نے پھر معذرت کی۔ اس مرتبہ وہ تھوڑے بگڑ گئے۔ "جو بھی یاد ہے سُنا کیوں نہیں دیتے؟" میں نے سوچا یہ کام تو ملنے والا نہیں۔ یہ آدمی کرسی پر بیٹھا خواہ مخواہ حکم چلا رہا ہے۔ مجھے جھنجھلاہٹ بھی ہونے لگی تھی۔ پریشان حال آدمی ویسے ہی چڑچڑا ہو جاتا ہے۔ میں نے کہا سنیے۔

"کھٹکھٹاتا ہے درِ خستہ کوئی
انتظار، اشک، گمان کچھ بھی نہیں
شمع، پروانے، دھواں کچھ بھی نہیں"

یہ میری ایک چھوٹی سی نظم ہے" دستک" میں نے پوری پڑھ دی اور پوچھا" آپ سمجھ گئے ؟" مکرجی الہٰ آباد کے تعلیم یافتہ تھے۔ یونیورسٹی میں رہے ہے۔ اردو بہت اچھی بولتے تھے مگر یہ شاعری ان کے پلّے کیا پڑتی۔ تھوڑا بوکھلا گئے۔

"نہیں نہیں ! آپ میرا مطلب نہیں سمجھے": میں نے پھر کہا۔ وہ تھوڑا گرم ہوئے اور مزید کچھ کہنا چاہتے تھے مگر میں اٹھ کر چلا آیا۔ یہ کہتے ہوئے۔ آپ کا نہیں یہ اس کرسی کا قصور ہے"۔ اتنے میں نجم نقوی آ گئے۔ وہ مکرجی سے ملنے جا رہے تھے۔ میں نے کہا" آپ ہو آیئے میں بیٹھا ہوں"۔

دراصل مکرجی ایسے آدمی نہیں تھے۔ جیسا میں نے انھیں پہلی ملاقات میں سمجھا تھا وہ کرختگی ان کا ظاہری روپ تھا۔ ورنہ وہ بڑے دلچسپ آدمی تھے۔ الہٰ آباد یونیورسٹی میں تعلیم پائی تھی۔ بڑی اچھی اردو بولتے تھے اور ہندوستان کے بڑے پروڈیوسروں میں ان کا شمار تھا۔ جب ہمانشو رائے نے بمبئی ٹاکیز کی داغ بیل رکھی' اس وقت سے نجم نقوی اور ششدھر مکرجی دونوں ان کے اسسٹنٹ کی حیثیت سے کام کر رہے تھے اور ہمانشو رائے کے بعد اب اپنی کمپنی بنا لی تھی۔ نجم نقوی ڈائریکٹر ہو گئے تھے۔ ایک دو روز بعد نجم نقوی سے کہہ کر انھوں نے مجھے پھر بلوایا اور میرے ساتھ ایک تحریری معاہدہ کیا مگر معاہدے پر دستخط کرنے کے بعد انھوں نے کچھ ایسی بات کہی کہ میں جھنجلا گیا۔ وہ معاہدہ وہیں پھاڑ دیا اور گھر آ گیا۔ سلطانہ کو معلوم ہوا تو وہ رونے لگیں۔ مکرجی نے پھر مجھے بلوایا اور ایسے ملے جیسے کچھ ہوا ہی نہیں تھا۔ اس کے بعد میں نے فلمستان کی کئی فلمیں لکھیں۔ ایکٹرس بہت کامیاب ہوئی۔ نجم نقوی نے ڈائریکٹ کی تھی۔ انار کلی اور ناستک پر بھی کام کیا تھا مگر ان دونوں پر میرا نام نہیں تھا۔ یہ ان کے اسسٹنٹ حمید بٹ کی غلطی تھی۔ فلمستان بیچ دینے کے بعد مکرجی نے" فلم آلیہ" کے نام سے ایک اور کمپنی بنائی اور مجھے وہاں بلا کر ایک اور فلم" ایک مسافر ایک حسینہ" لکھنے کو کہا مگر وہ فلم میں نے آدھے میں چھوڑ دی۔ ڈائریکٹر راج گھونسلا کی" میرا سایہ" لکھی جو بہت کامیاب ہوئی۔ اس کے بعد ایک دو فلمیں اور لکھیں۔ مگر وہ خاص کامیاب نہیں ہوئیں۔

اچھی اور کامیاب فلمیں لکھنے کے بعد بھی آسودگی کا احساس نہیں ہوا۔ ایسا محسوس ہوتا رہا جیسے کسی چوراہے پر بیٹھا ہوں کہیں کوئی جائے اماں نہیں مگر اس کا ذمہ دار میں خود تھا۔ کہیں ذہن میں اندر یہ بات بیٹھ گئی تھی کہ آسودگی میں اچھا تخلیقی کام نہیں ہوتا۔ خاص طور پر شاعری۔ اس کے لیے گوناگوں تجربات اور ان گنت ٹھوکروں کی ضرورت ہے۔ علی گڑھ میں رہتا تو پروفیسر ہو جاتا۔ وہ سکون ہی سکون کی زندگی تھی مگر وہ بھی کہاں اختیار کی اس میں مستقل ایسا محسوس ہوتا رہا جیسے کھونٹی پر لٹکا ہوں پاؤں ٹکانے کی جگہ ہی نہیں مل رہی۔

ایک دن معلوم ہوا نجم نقوی بھیس بدل کر مع عیال کے کھوکرا پار سے پاکستان چلے گئے بڑا سناٹا محسوس ہوا۔ گریٹ انڈیا پکچرس بھی بند تھی۔ ایس ایم یوسف "بکھرے موتی" ادھوری چھوڑ کر پاکستان چلے گئے تھے۔ مکرجی کی فلمالیہ میں بھی کوئی خاص کام نہیں ہو رہا تھا۔ ایس۔ ایم۔ نواب فلم بنانے کے علاوہ اور سب کچھ کر رہے تھے۔ اب چار سو روپے کی ملازمت بھی نہیں رہی تھی۔ نجم نقوی اچھا دلچسپ آدمی تھا کئی بار یاد آیا۔ اس سے پہلی ملاقات اس وقت ہوئی جب وہ "لوٹیگ" میں پتا بنا رہا تھا۔ اسی کے توسط سے اس کی ہیروئن گیتا نظامی سے تعارف ہوا اور دوستی بڑھی۔ ویدی بھی "لوٹیگ" کے لیے کمرہ نمبر ۹ بنا رہے تھے۔ جس کی ہیروئن بھی گیتا نظامی تھی، ان سے بھی وہیں ملا۔ بہت سے مناظر تیزی سے آنکھوں کے آگے سے گزر گئے۔ گیتا کا معاشقہ پہلے نجم کے ایک اسسٹنٹ جمال سے ہوا۔ جسے کمپنی سے نکال دیا گیا۔ پھر کمرہ نمبر ۹ میں ویدی سے ہوا اور وہ نظامی کو چھوڑ کر ویدی کے پاس آگئی۔ ویدی اور گیتا دونوں بمبئی آگئے۔ ویدی کو بمبئی میں ایک فلم ملی جس کا ہیرو ستیش تھا۔ ہیروئن گیتا تھی۔ گیتا ویدی کو چھوڑ کر ستیش کے ساتھ چلی گئی۔ پھر ستیش نے بھی چھوڑ دیا۔ بہت دن ادھر اُدھر پریشان حال پھرتی رہی۔ ایک روز کچھ روپے مانگنے آدھی رات کو میرے پاس بھی آئی تھی۔ پھر غائب ہوگئی اور کئی سال بعد نمودار ہوئی۔ اس نے بتایا وہ پاکستان میں ہے۔ اس نے شادی کر لی ہے اور اب اس کا نام رشیدہ ہے۔ اپنی اس بیٹی کی تلاش میں آئی تھی جو ویدی سے تھی۔ میرے پاس ٹھہری مگر وہ بیٹی ملی نہیں۔ واپس کراچی چلی گئی۔ اب ویدی بھی نہیں رہا۔

اسی خالی الذہنی کے زمانے میں ماسٹر علی بخش کی بیٹی مہ جبیں کا بلاوا آگیا۔ وہ اب مینا کماری بن گئی تھیں اور کمال امروہوی کی بیوی تھیں۔ کہلوایا تھا میں کمال صاحب سے مل لوں گا میں گیا۔ کمال نے ایک فلم پر کام کرنے کو کہا۔ روپیہ بھی طے ہوا اور معاہدہ بھی تحریری طور پر ہو گیا۔ کمال نے فرمائش کی ایک ہندو ادیب بھی ساتھ ہو تو بہت اچھا رہے۔ میں مدھو سودن کو لے گیا اور ہم دونوں نے فلم "پاکیزہ" لکھی فلم پر کام کرنے کے زمانے میں کمال اور مینا کی زندگی کے بہت سے مناظر سامنے آئے۔ وہ ہر دوسرے تیسرے روز غسل خانے میں گر پڑتی تھیں اور ناک، سر، کسی بھی حصہ پر چوٹ آ جاتی تھی۔ مگر میں اس کی تفصیل میں نہیں جاتا۔ یہ ان کا گھریلو معاملہ تھا۔ کہانی پر ردّ و قدح کے دوران ایک لطیفہ ہو گیا۔ کہانی میں ایک ایسا موقع آگیا جہاں بارہ سال کا وقفہ گزارنا تھا۔ ایک کے بعد ایک کئی سجھاؤ آئے مگر کمال مطمئن نہیں ہوئے۔ جب طبیعت زچ ہو گئی تو میں نے کہا "کمال صاحب بارہ سال گزارنے کا ایک اور طریقہ بھی ہے۔"

"کیا؟" وہ بولے۔

میں نے کہا۔ "ایک نلکی میں کتے کی دم بند کرتی ہوئی دکھائیں۔ پھر تھوڑی دیر بعد کھولیں اور کہیں "دیکھیے بارہ سال گزر گئے مگر کتے کی دم ٹیڑھی کی ٹیڑھی ہے۔" کمال کھسیانی ہنسی ہنس کر خاموش ہو گئے۔ جب "پاکیزہ" مکمل ہو گئی اور اس کی نمائش ہوئی تو اس پر صرف کمال امروہوی کا نام تھا۔ میرا اور مدھو سودن کا نام نہیں تھا۔ مدھو سودن نے فلمی ادیبوں کی انجمن میں کمال پر مقدمہ دائر کیا۔ کمال کو کسی وجہ سے یہ خیال نہیں رہا کہ "پاکیزہ" لکھنے کا میرے ساتھ ان کا تحریری معاہدہ ہے۔ انھوں نے مقدمے کا فیصلہ ہوتے وقت ثبوت مانگا۔ میں نے وہ تحریری معاہدہ انھیں دکھا دیا اور وہ مقدمہ ہار گئے۔ مگر اس جیت کا نہ مجھے کوئی فائدہ ہوا۔ نہ مدھو سودن کو۔ ہم نے اس بد دیانتی کے لیے کمال سے نہ کوئی معاوضہ مانگا نہ ہرجانہ طلب کیا۔

"پاکیزہ" پوری کرنے کے بعد ہی میں اچانک بیمار ہو گیا۔ صحیح معنوں میں اچانک کہنا غلط ہوگا۔ اس بیماری کا سلسلہ میرے ساتھ بہت پرانا تھا۔ میں خونی بواسیر کا

مریض تھا۔ جب کبھی دورہ پڑتا تھا میں ایک یونانی دوا کھا لیتا تھا اور خون بند ہو جاتا تھا۔ اس بار جو دورہ پڑا تو خون بند نہیں ہوا۔ بدن سے اتنا خون نکل گیا میں ایک دو بار بے ہوش ہو گیا۔ ایک ڈاکٹر کے پاس گیا۔ اس نے کہا مسہ پھٹ گیا ہے فوراً اسپتال جاؤ۔ میں بالکل قلاش تھا علاج کیسے ہو۔ سلطانہ اپنی بہن کے پاس گئیں اور ان سے دو سو روپے مانگ کر لائیں اور میں نانا وتی اسپتال میں داخل ہو گیا۔ مگر علاج کیسے پورا ہوگا۔ آپریشن کرانا تھا۔ اس تمام خرچ کی کیا صورت پیدا ہوگی۔ اچانک ایک صورت نکل آئی۔ جن دلوں دلیپ کمار سے میری نئی نئی ملاقات ہوئی اور میں، دلیپ اور ایوب سرور اکثر ملتے تھے۔ اس حلقہ میں چوتھا ایک اور شخص بھی تھا۔ اس کا نام گلاب داس بروکر تھا۔ وہ گجراتی زبان کے بڑے معروف ادیب تھے۔ افسانے لکھتے تھے۔ میں یوسف خاں، ایوب سرور اور گلاب داس کہیں ایکانت میں جا کر بیٹھ جاتے تھے۔ اور گپ اور لطیفہ بازی کرتے تھے۔ گلاب داس نانا وتی اسپتال کے نزدیک ہی رہتے تھے۔ کسی طرح انھیں علم ہو گیا میں بیمار ہوں۔ وہ مجھے دیکھنے آئے۔ اور جب انھیں علم ہوا میں مالی طور پر پریشان ہوں، وہ اسپتال کے سپرانٹنڈنٹ سے ملے۔ میرا غائبانہ تعارف کرایا اور میری شاعری کو بہت بڑھا چڑھا کر پیش کیا۔ سپرانٹنڈنٹ مسٹر سیٹھ بھی گجراتی تھے اور گلاب داس کا بہت احترام کرتے تھے۔ وہ مجھ پر بہت مہربان ہو گئے میرا کمرہ بھی بدل دیا اور آپریشن میں بھی بہت سہولتیں دلوائیں اور میں تندرست ہو کر گھر آ گیا۔ یہ سن ۱۹۵۰ء کے آس پاس کی بات ہے۔

زلیو پر ولا میں آکر مکان کی شکل اور بواسیر کی بیماری سے تو نجات مل گئی تھی مگر معاش کا سلسلہ ابھی تک ڈانواڈول تھا۔ پرمتا داس اس دوران برابر ملتی رہی۔ اس کی مالی حالت بھی اچھی نہیں رہی تھی۔ بیچ میں چھوٹے موٹے ایک دو کام کیے مگر تسلی بخش صورتحال پیدا نہیں ہوئی۔ خالی الذہن بیٹھا سوچتا رہتا تھا۔ معاش کے لیے میں کیا کروں؟ میں کسی سے مدد مانگنے سے اکثر پرہیز کرتا رہا تھا۔ ایک زمانے میں میرے والد پوسٹ آفس کے سامنے بیٹھ کر خط لکھا کرتے تھے۔ مجھے وہ اچھا نہیں لگا تھا۔ میں انھیں ہاتھ پکڑ کر وہاں سے اٹھا لایا تھا۔ گھر بھیج دیا تھا اور خرچ کی ایک ماہانہ رقم مقرر کر دی تھی۔ مگر میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے اس صورتحال

سے نکالنے والا کوئی نہیں تھا۔

جن دنوں میں شالیمار پکچرس میں تھا۔ وہاں ایک بار بی آر چوپڑہ سے سرسری ملاقات ہوئی تھی مجھے وہ سنجیدہ فلم ساز محسوس ہوئے تھے۔ ایک دن اچانک ان کا خیال آیا اور میں ان سے ملنے چلا گیا۔ ان کا دفتر تو کاردارا سٹوڈیو، پریل میں تھا۔ مگر میں نے گھر جانا مناسب سمجھا۔ وہ بہت محبت سے پیش آئے۔ باتوں باتوں میں فلم کا ذکر نکل آیا۔ انھوں نے ایک کہانی کا ذکر کیا جو ان کو بہت پسند تھی۔ مگر سرمایہ لگانے والی پارٹی نے اسے رد کر دیا تھا۔ انھوں نے کہانی کا خیال سُنایا اس لیے کہ وہ ابھی تک چاہتے تھے اس کہانی کو بنائیں۔ کہانی کا خاکہ سناکر انھوں نے پوچھا "آپ اسے ٹھیک کرسکتے ہیں؟"

"کوشش کرسکتا ہوں۔" میں نے کہا۔

کہانی کچھ اس طرح شروع ہوتی تھی کہ جج کے سامنے ایک ملزم پیش کیا جاتا ہے جس پر قتل کا الزام ہے مگر وہ گڑگڑا گڑگڑا کر کہے جاتا ہے اس نے قتل نہیں کیا اور اتنا چلاتا ہے کہ جج عدالت ملتوی کر دیتا ہے اور اپنے چیمبر میں آکر سوچنے لگتا ہے کیا ایسا ممکن ہے ایک بے قصور آدمی کو خون کے جرم میں ملوّث کر دیا جائے، اور وہ چیمبر میں بیٹھے ہی بیٹھے اپنے تصور میں ایک کہانی گھڑ لیتا ہے اور اسی مفروضہ کی بنیاد پر فیصلہ دے دیتا ہے۔ میں نے چوپڑہ صاحب سے کوئی لین دین کی بات نہیں کی۔ جو انھوں نے سنایا تھا اس پر غور کرنے کا وقت مانگا اور ایک دو روز بعد آنے کا وعدہ کرکے گھر واپس آگیا۔

گھر آکر میں نے جب اس کہانی پر غور کیا تو مجھے دو باتیں لگیں۔ ایک یہ کہ اس کہانی کا آغاز ہی ٹھیک نہیں۔ دوسرے یہ کہ اس کہانی کا جسم پر گوشت پوست نہیں۔ وہ صرف ایک خیال ہے جو جج کے دماغ میں ہے۔ اسے پوری طرح جسم دینا چاہیئے۔ اگلے روز دفتر میں جاکر میں نے چوپڑہ صاحب سے اس پر تھوڑا تبادلۂ خیال کیا۔ ان کی عادت ہے وہ لفظوں پر اعتبار نہیں کرتے جب تک وہ کاغذ پر نہ آئیں اور انھیں مطمئن نہ کر دیں۔ میں نے بغیر کوئی لین دین کی بات کیے اسے لکھنا شروع کر دیا۔ "قانون" نام رکھا۔ وہ صرف مکالموں کی تصویر تھی اور بیشتر مناظر عدالت میں تھے۔ اس میں گانے بھی نہیں تھے۔ غالباً ہندوستان

کی فلمی صنعت میں وہ پہلی فلم تھی جس میں گانے نہیں تھے۔ فلم بن جانے کے بعد جب اس کی نمائش ہوئی تو بہت پسند کی گئی۔ اور مجھے مکالمہ نگار کی حیثیت سے بہت سراہا گیا۔ اس کہانی کا معاوضہ مجھے صرف چار ہزار روپے ملا جو میری توقع سے بہت کم تھا۔ اس کے بعد میں بی آر فلمز سے مستقل طور پر متعلق ہوگیا اور کم و بیش بیس سال تک ان کی فلمیں لکھیں۔ اگلی آنے والی فلموں میں جو بہت کامیاب ہوئیں کئی فلمیں تھیں جیسے "وقت" اس کے مکالمے زبان زد عام ہوگئے۔ لوگ گلی محلوں میں بولتے پھرتے تھے۔ "قانون" اور "وقت" ان دونوں فلموں کے مکالمے اتنے دیر پا ثابت ہوئے کہ آج کے بھی بہت سے فلمیں لکھنے والے ادیب اپنی نئی فلموں میں گھما پھرا کر دہراتے رہتے ہیں اور گھوم پھر کر قانون کے عدالت کے مناظر دہرائے جاتے ہیں۔ "قانون" اور "وقت" میں کام کرنے والے کئی اداکار آج تک ان ہی دو فلموں کے مکالموں پر زندہ ہیں اور انھیں سے ابھر کر سامنے آئے ہیں۔ بی آر فلمز میں مجھ پر ایسی پابندی نہیں تھی کہ باہر کی فلمیں نہ لکھیں۔ باہر کی فلموں میں سنجے خان کی "چاندی کا سونا" تھی جس کے سلسلے میں ان کے ساتھ مارشیس گیا۔ فیروز خان کی فلم "اپرادھ" تھی اسی کو پورا کرنے کے ساتھ جرمنی گیا اور ایک مہینہ مائنز میں رہا۔ کم و بیش ایک مہینہ مارشیس میں بھی رہا۔ جرمنی سے جنیوا اور روم ہوتا ہوا واپس آیا۔ مدار اس کی ایک فلم "آدمی" لکھی جس میں دلیپ کمار اور وحیدہ رحمٰن وغیرہ تھے۔ پریم جی کی ایک فلم "میرا سایہ" لکھی۔ اس میں سنیل دت اور سادھنا تھے۔ انھیں کے لیے "مجرم" اور "پھول اور پتھر" لکھی غفار بھائی کی "پتھر کے صنم" لکھی۔ یہ سب فلمیں کامیاب فلمیں تھیں۔

جن دنوں بی آر فلمز سے متعلق تھا "افرو ایشیائی" کانفرنس میں شرکت کا بلاوا آیا اور بیروت گیا۔ وہاں سے دمشق۔ اور واپسی میں ماسکو اور پھر لندن، فرانس اور قاہرہ ہوتا ہوا اور ان مقامات پر ایک ایک مہینہ ٹھہرتا ہوا واپس ہندوستان آیا۔

زلویر ولا چھوٹا سا مکان تھا مگر وہاں سکون بہت تھا۔ میں اس مکان میں ۱۹۵۰ء سے تقریباً ۱۹۶۳ء تک رہا۔ کچھ دوست ایسے تھے جو زلویر ولا میں ہر اتوار کو آتے تھے۔ تصدیق سہارنپوری اور ان کی بیوی رضیہ ایک اسکول ٹیچر تھے جو اب لندن میں ہیں۔ کچھ برس پہلے جب

میں لندن گیا تھا تو ان سے ملاقات ہوئی تھی ۔ نام یاد نہیں رہا ۔ باقر مہدی، وہ اکثر شام کو آیا کرتے تھے ۔ باقر ان نقادوں میں ہیں جنھوں نے میری شاعری کو پڑھا اور اس پر لکھا ۔ باقر مہدی کہنے کو ایک فرد ہیں مگر انھیں اجتماع کہا جا سکتا ہے ۔ جب بہت خوش ہوتے ہیں اور دوستوں میں دلچسپی لیتے ہیں تو اکیلے اتنا ہنستے اور شور کرتے ہیں کہ بہت سے آدمی مل کر بھی نہیں مچا سکتے ۔ ادب کا بہت غائر مطالعہ کیا ہے ۔ قومی اور بین الاقوامی دونوں سطحوں پر ۔ کب کیا کریں گے ۔ ان کے بارے میں کوئی پیشن گوئی نہیں کی جا سکتی ۔ ان سے ملنے جائیے کبھی آپ کو سر آنکھوں پر بٹھائیں گے ۔ اور کبھی آپ کے منھ پر کہہ کر اچانک دروازہ بند کر دیں گے ۔ "آپ بڑے ذلیل آدمی ہیں بھنڈی کی ترکاری پسند نہیں آپ کو ۔" ان ہمہ اوصاف کے باوجود میرے بڑے کرم فرما ہیں ۔ میری سالگرہ پر ذرا سی وسکی لے کر آتے ہیں ۔ ایک گھونٹ مجھے دیتے ہیں ایک خود پی لیتے ہیں اور یہ کہہ کر رخصت ہو جاتے ہیں ۔ "اچھا اختر بھائی اگلے سال ملیں گے ۔" ایک احسان الحق تھے ۔ وہ مکتبہ جامعہ میں منیجر تھے ۔ مدھوسودن تھے ۔ ایک دو اور تھے جن کے نام اس وقت ذہن میں نہیں ۔ ایک روز احسان آئے اور پلنگ پر گر کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے ۔ سلطانہ نے وجہ پوچھی تو معلوم ہوا قیصر نام کی کوئی لڑکی ہے ۔ جس سے عشق ہو گیا ہے ۔ شادی کرنا چاہتے ہیں ۔ مگر لڑکی کے والدین خلاف ہیں ۔ میں لڑکی کے والدین کو جانتا تھا ۔ والد کا نام جنید تھا ۔ وہ ادیبوں شاعروں کا بڑا احترام کرتے تھے ۔ کبھی وہ مجھ سے ملنے آتے تھے ۔ جب میں ان کے یہاں جاتا تھا ۔ تو جب تک میں نہ بیٹھ جاؤں کھڑے رہتے تھے ۔ میں اور سلطانہ ایک روز جنید کے گھر گئے ۔ وہاں کھانا بھی کھایا اور انھیں دھمکی بھی دی کہ اگر قیصر کی شادی احسان سے نہ کی تو لڑکی ان کے ہاتھ سے جاتی رہے گی ۔ وہ بے چارے دھمکی میں آ گئے اور اس شادی پر رضامند ہو گئے ۔ اس واقعہ کے دو تین سال بعد یہ ہوا احسان ترکِ عشق کر کے لندن روانہ ہو گئے ۔ کچھ مدت بعد قیصر کا بھی انتقال ہو گیا ۔ اب احسان بھی حیات نہیں ۔

زلویر ولا میں پیچھے کا حصہ میرے پاس تھا ۔ پہلی منزل پر آدواڑے رہتے تھے ۔ ان کے تین بیٹے تھے ایک بیٹی ۔ شرایو نام تھا ۔ لڑکے زیادہ تر اپنے ماموں کے یہاں رہتے

تھے۔ ادوارے وکیل تھے۔ اور باندرہ کی مقامی عدالت میں وکالت کرتے تھے۔ شراب کے بڑے رسیا تھے۔ ان کے موکل انھیں ان کا معاوضہ اکثر دیسی شراب کی شکل میں دیتے تھے۔ انھیں اکثر کسی نالی میں سے اٹھا کر لایا جاتا تھا۔ جب وہ گھر واپس آتے تھے ان کی رات جھگڑے سے شروع ہوتی۔ باتوں سے ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ اپنی بیوی سے بدظن ہیں۔ یا اس پر بھروسہ نہیں کرتے۔ لڑائی مراٹھی میں ہوتی تھی۔ پہلا جملہ یہ سننے میں آتا تھا۔ "میں کون؟" (می کون؟)

"تو میرا صاحب؟" (تو ماجھا صاحب؟)

جھگڑا تو خیر دونوں میں ہوتا ہی رہتا تھا مگر اب جو بات میں کہنے جارہا ہوں اس کا کوئی پیر نہیں۔ ایک روز رات کو زور زور سے مسز ادوارے کے چلّانے کی آواز آئی.... 'مسٹر ایمان.... مسٹر ایمان' کافی رات گزر چکی تھی۔ میں سمجھا میاں بیوی میں تکرار کچھ زیادہ بڑھ گئی۔ میں اوپر آگیا۔ دروازہ کھلا ہوا تھا۔ اندر کمرے میں گیا۔ سناٹا تھا۔ میں پلنگ کے نزدیک گیا۔ مسز ادوارے نے چادر سے ہاتھ نکال کر مجھے اپنی طرف کھینچا۔ وہ بستر پر ننگی تھیں۔ میں ہاتھ چھڑا کر واپس آگیا۔ ان کے اس رویّہ کا مطلب میں آج تک نہیں سمجھ پایا اس لیے کہ اس سے پہلے کبھی میرے ان کے درمیان ایسی بات کا ذکر کبھی نہیں ہوا تھا۔ اور اس کے بعد بھی کبھی انھوں نے اس واقعہ کو دہرایا نہ اس کا ذکر کیا۔

شرایو کی ایک لڑکے شری پت سے دوستی ہوگئی۔ وہ اس کے ساتھ آکر رہنے لگا۔ بعد میں دونوں نے شادی کرلی اور امریکہ چلے گئے۔ اب شرایو وہاں جج ہے۔ سنا ہے شری پت کا انتقال ہوگیا۔ مسز ادوارے کینسر کے مرض میں مبتلا ہوکر انتقال کرگئیں۔ ادوارے کثرت شراب نوشی سے بیمار ہوگئے۔ اسپتال میں انتقال ہوا۔ ہم آخر تک اس خاندان سے متعلق رہے۔ زیویر وِلا سے چلے جانے کے بعد بھی۔ ادوارے اور مسز ادوارے کی بھی محبت کی شادی تھی۔ ادوارے انھیں پہلے ٹیوشن پڑھایا کرتے تھے۔

میں جہاں جہاں بھی رہا ہمسایوں سے ہمیشہ اچھے تعلقات اور قربت رہی۔ زیویر وِلا میں بھی یہی صورت تھی۔ ادوارے کے اوپر والی منزل میں انور حسین رہتے تھے۔ وہ پٹنہ

کے رہنے والے تھے۔ بمبئی میں گوئل سنے کارپوریشن پروڈکشن میں کام کرتے تھے۔ اس کے بعد خود پروڈیوسر ہوگئے تھے۔ "مسافر" کے نام سے ایک فلم بنائی تھی جو سین نے لکھی تھی۔ انور پر اچانک دل کا دورہ پڑنے سے ان کا انتقال ہوگیا۔ وہ ابھی جوان ہی تھے۔ بیوی بچے گھر کو تالا لگاکر پٹنہ چلے گئے۔ زیویر ولا ابھی بھری پُری جگہ تھی۔ دیکھتے دیکھتے اجاڑ ہوگئی۔ ادوارے کے تین لڑکے تھے۔ وہ بھی امریکہ چلے گئے اور وہیں آباد ہوگئے۔ گنڈو، منڈو اور جبو نام تھے۔ منڈو نے ایک روسی لڑکی سے شادی کر لی تھی۔ اب معلوم نہیں سب کس حال میں ہیں۔

جب میں نے زیویر ولا لیا تھا اس وقت بڑا تھا اب چھوٹا پڑنے لگا تھا۔ میں نے قریب ہی "ہل دیو" نام کی عمارت میں ایک فلیٹ خریدا اور ہم اس میں منتقل ہوگئے۔ زیویر ولا کو میں نے اپنے پڑھنے لکھنے کی جگہ بنا لیا۔ "ہل دیو" سے پانچ سات منٹ کا راستہ تھا۔ یہ فلیٹ اب بھی میرے پاس ہے۔

یہ فلمیں جو میں نے اس دور میں لکھیں جن کا اوپر کہیں کہیں ذکر ہے۔ ساری فلمیں نہیں ساری کیا آدھی بھی نہیں۔ نخشب میرا بہت گہرا دوست تھا۔ ان کامیاب فلموں میں نخشب کا اپنا نام اختر تھا۔ نخشب کو اس وقت سے میں جانتا تھا۔ جب ساغر نظامی کے ایشیا میں کام کر رہا تھا۔ اور میرٹھ کالج سے فارسی میں ایم اے بھی کر رہا تھا۔ اب مجھے "نغمہ"، "رفتار" اور "زندگی اور طوفان" کے سوا نخشب کی اور کسی فلم کا نام یاد نہیں رہا۔ مگر نخشب یاد رہے۔ اس قسم کا آدمی تھا کہ جتنی دیر آپ کے ساتھ رہے گا۔ آپ کو ہشاش بشاش رکھے گا۔ بہت ہی زندہ دل شخص تھا۔ اس کے صرف دو تین ہی شوق تھے۔ گھوڑوں کی ریس، خوش پوشی، مشرقی انداز کی شاعری اور لڑکیوں سے دلچسپی جس کے لیے حکیم حیدر بیگ کی دوائیں اور کشتے بہت کام آتے تھے اس کے پڑوس میں ایک اینگلو انڈین لڑکی رہتی تھی۔ اچھی صورت کی تھی۔ عمر کوئی سولہ سترہ مجھے اس کے لیے بہت دل اکساتا رہا۔ "چل کمال کی چیز ہے، صرف چار سو روپے لیتی ہے جتنی دیر تمہارے ساتھ رہے گی۔ زندگی کا مزہ بدل دے گی"۔ میں ہنس کر چپ ہو جاتا تھا۔ اس لیے کہ اس لڑکی کو میں بھی جانتا تھا اکثر نخشب کے یہاں آتی تھی۔ نخشب کی

دلی میں ڈائریکٹر شانتا رام سے کہیں ملاقات ہو گئی تھی چند ہی روز میں ان سے ایسی رسم و راہ پیدا کی کہ ان کی فلم کے گانے لکھنے ان کے ساتھ بمبئی آ گیا۔ ڈائریکٹر شوکت حسین رضوی کی ایک فلم میں اس نے عورتوں کی قوالی لکھی جو بہت مقبول ہوئی۔ بیچ میں عباس نام کے ایک آدمی سے ملاقات ہوئی جو بہت نمازی قسم کا تھا مگر فلموں سے دلچسپی رکھتا تھا نخشب اس کے ساتھ پانچوں وقت کی نماز پابندی سے پڑھنے لگا۔ اس نے خوش ہو کر فلم بنانے کے لیے روپیہ دے دیا اور نخشب پروڈیوسر بن گیا۔ اس میں بہت سی باتیں تھیں جو مجھے پسند تھیں۔ جامہ زیب، خوش وقت، خوش خوراک، بہت زندہ دل اور دوستوں کا دوست ہر وقت ہنستا رہتا تھا۔ پاکستان چلا گیا تھا۔ وہاں آنت پھٹ جانے کی وجہ سے جوان ہی مر گیا۔ مجھے اب تک افسوس ہے۔ وہ اتنی جلدی کیوں مر گیا۔ اسے بہت دن زندہ رہنا چاہیے تھا۔

نخشب کے ساتھ منور آغا مجنوں کا ذکر بھی ضروری ہے۔ میری ان سے ملاقات ملاقات نخشب ہی کے مکان پر ہوئی تھی۔ ایک روز جو میں نخشب سے ملنے گیا تو گھر پر نہیں تھے۔ منور آغا مجنوں، نادرہ کو اپنا کلام سنا رہے تھے۔ نادرہ نخشب کی پہلی فلم "نغمہ" کی ہیروئن تھی۔ مجنوں لکھنؤ کے رہنے والے تھے۔ جعفر علی خان کے خاندان سے تعلق تھا۔ مزاحیہ شاعری کرتے تھے۔ فلموں میں کوئی کام مل جاتا تھا، وہ بھی کر لیتے تھے۔ نخشب کی پہلی فلم "نغمہ" میں بھی انھوں نے ایک ملازم کا کردار کیا تھا۔ ان کی ایک نظم تھی "مکھی" وہ بہت سنایا کرتے تھے۔ ایک نظم بمبئی پر کہی تھی۔ یہ دونوں نظمیں اچھی مزے دار تھیں مجنوں اپنی ذات سے بھی بہت باغ و بہار آدمی تھے گورے چٹے چھوٹا قد تھا۔ نخشب کے یہاں ملاقات کے بعد میرے یہاں بھی اکثر آنے لگے تھے۔ اپنے دوست کاظم کے ساتھ جن کا محبوب مشغلہ بوڑھی امیر عورتوں سے شادی کرنا تھا۔ مجنوں کچھ دن تو کاظم کے ساتھ آتے رہے پھر ایک لڑکی جگنو کے ساتھ آنے لگے تھے۔ یہ دلی کی رہنے والی ایک لڑکی تھی۔ جسے فلموں میں کام کرنے کا شوق تھا مجنوں

کا کینسر کے مرض میں انتقال ہوا۔ جگنو کو دل کا عارضہ ہو گیا تھا۔ موت اچانک دورہ پڑنے سے ہوئی۔ مجنوں کا کوئی مجموعۂ کلام نہیں چھپا شاید۔

باب (۱۴)

میں زیویر ولا سے منتقل ہو کر ہل ویو میں آگیا۔ یہ جگہ زیویر ولا سے بہت دور نہیں تھی اس لیے زیویر ولا چھوڑا نہیں اسے اپنی لائبریری بنا لیا۔ مقصد یہ کہ سب لکھنے پڑھنے کا کام وہاں کرنے لگوں۔ زندگی کی اس تگ و دو میں وقت کا اندازہ ہی نہیں رہا۔ ڈائری کھول کر دیکھی۔ پہلے صفحہ پر ۱۳ر نومبر ۴۹ء کی رات لکھی تھی اور آج یکم جنوری ۶۶ء کی رات تھی۔ سترہ سال کی اس مدت میں جو اب ایک ثانیہ سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتی تھی میرے حالات میں بہت سی تبدیلیاں اور آئی تھیں۔ اس وقت جب پچھلی ڈائری لکھی تھی میرے یہاں صرف ایک اولاد تھی۔ شہلا اور آج میں تین لڑکیوں اور ایک لڑکے کا باپ ہوں۔ یہ بچے بھی اب بڑے ہو رہے ہیں۔ شہلا اب سترہویں سال میں ہے اس سے ایک برس چھوٹی اسمار ہے۔ رامش اسمار سے چھ سال چھوٹا ہے اور رخشندہ رامش سے ڈھائی سال چھوٹی۔

میرے مالی اور معاشی حالات بھی پہلے کے مقابلہ میں اطمینان بخش ہیں۔ اس سترہ سال کی مدت میں اس ملک میں کیا کیا تبدیلیاں آئیں۔ اس کی تفصیل میں نہیں جاؤں گا۔ بس ایسا محسوس ہوتا ہے کلچر اور ثقافت کی وہ عظیم عمارت جس کے نیچے ہم بیٹھے تھے ایکدم ڈھے گئی۔

۱ر جنوری ۶۶ء

دن تمام ہو گیا۔ یوں بھی عام طور پر روز کوئی قابل ذکر بات نہیں ہوتی میں آج کل اپنے حالات سے بہت غیر مطمئن ہوں۔ اس کا سبب مالی پریشانی نہیں۔ اپنے ادبی کام سے غیر مطمئن ہوں۔ کبھی کبھی اپنے اوپر غصہ اور جھنجھلاہٹ ہوتی ہے۔ آخر مجھ میں اتنی قناعت

کیوں نہیں آئی۔ غربت اور فقیری میں دن گزار کر کوئی بڑا ادبی کام کرتا۔ پھر سوچتا ہوں اگر قناعت ہوتی تو شاید یہ شاعری بھی نہ ہو پاتی۔ جواب تک میں نے کی ہے۔ حالانکہ میری نظر میں اس کی بھی کوئی بڑی اہمیت نہیں۔ پچھلے کچھ دنوں سے صحت بھی ناہموار رہتی ہے۔ ایک اضمحلال سا طاری رہتا ہے۔ یا شاید یہ اضمحلال اور بے دلی ہے بس اس کے سبب کہ زندگی کے رائیگاں اور عبث ہونے کا احساس طاری رہتا ہے۔ غرضیکہ ذہن ایک جگہ نہیں ٹکتا۔ بڑا ادبی کام کیا ہے یہ بھی تو نہیں معلوم نہ اس کا کوئی واضح تصور ذہن میں ہے۔ اپنی کلاسیکی شاعری سے دور نہیں جانا چاہتا اور آج کی قدریں، تقاضے اور زندگی کا ہیولہ ہی بدل گیا ہے۔

۱ر جنوری ۶۷ء

آج ڈائری لکھنے کو بالکل جی نہیں چاہ رہا تھا مگر تہیہ کر لیا تھا ۶۷ء میں باقاعدہ ڈائری لکھوں گا اس لیے چند سطریں لکھ رہا ہوں۔ شام کو بازار سے واپس آنے کے بعد ذہن پراگندہ ہو گیا۔ ایسے ہی موقع ہیں جب ازدواجی زندگی سے جی خواہ مخواہ اچاٹ ہو جاتا ہے۔ سلطانہ بیڈمنٹن کھیلنے کے لیے واپس نیچے جانا چاہتی تھیں۔ میں "پتھر کے صنم" کے کچھ مناظر لکھنا چاہتا تھا۔ روپیہ کی ضرورت تھی۔ اس کھنچاؤ میں نہ کھیلنے جا سکے نہ کچھ لکھا گیا۔ مجھے حیرت ہے بیویاں اپنے شوہروں کی مشکلات کا اندازہ کیوں نہیں لگا سکتیں۔ اگر کبھی اس قسم کی بات زبان پر لاؤ تو وہ اپنا رونا لے بیٹھتی ہیں۔

صبح میں بہت صحت مند محسوس کر رہا تھا لائبریری میں جا کر دوپہر تک کام کرتا رہا اور "آدمی اور انسان" کے کچھ سین لکھے۔ ڈیڑھ بجے آ کر کھانا کھاتا۔ کچھ دیر کے لیے لیٹ گیا۔ اور آنکھ لگ گئی۔ چار بجے کے قریب اٹھا۔ نہایا چائے پی اور سلطانہ کو لے کر بازار گیا۔ انھیں شہلا اور اسمار کے لیے کچھ دوپٹوں اور پاجاموں کا کپڑا خریدنا تھا۔ عید قریب آ رہی ہے۔

۲ر جنوری ۶۷ء

وہ اضمحلال جس کا میں نے پچھلے صفحوں میں ذکر کیا ہے۔ میری ذات کا ایک حصّہ بنا ہوا ہے۔ اس طرح کی تھکن کا مجھے پہلے کبھی کوئی تجربہ نہیں ہوا تھا۔ جب لکھنے بیٹھتا ہوں کمر تختہ ہو جاتی ہے۔ ذہن پر ہر وقت ایک چڑچڑاپن سوار رہتا ہے۔ میں اس احساس کو اپنانا نہیں چاہتا مگر جانے کیوں یہ بات ہر وقت دماغ پر سوار رہتی ہے کہ بیوی بچّے بے حس ہیں۔ انھیں میری تگ و دو کا ذرا بھی اندازہ نہیں۔ سوچتا ہوں مہاتما بُدھ کی طرح دنیا چھوڑ کر چلا جاؤں مگر مہاتما بدھ کے سامنے تو ایک آدرش تھا۔ کوئی الجھا ہوا مسئلہ یا کوئی لگن انسان اور انسان کی زندگی سے متعلق۔ میں نے کر سامنے کیا ہے کنواں کھودنا اور پانی پینا

میں ایک مدّت سے اس نتیجہ پر پہنچا ہوا ہوں کہ مسائل جوں کے توں رہتے ہیں۔ آدمی مرتا کھپتا رہتا ہے۔ وقتی طور پر ان مسائل کا کوئی حل نکل آتا ہے۔ مگر اس حل سے کچھ اور نئے مسائل پیدا ہو جاتے ہیں۔ زندگی کا کوئی بڑا مقصد نہیں۔ یہ زمین پر محض اتفاقی اور حادثاتی ہے۔ اس زمین پر خیالات کا اور تصورات کا جو بھی منصوبہ ہے وہ انسان کا پیدا کردہ ہے۔ وہ اپنی زندگی کو ایک مقصد دینا چاہتا ہے اس لیے مسلسل ادھیڑ بن میں مصروف رہتا ہے۔ روٹی کی تلاش اور جنس کی لذّت کے حصول کے بعد اس کے پاس اور کچھ نہیں بچتا اس لیے وہ روز نئے مسائل اٹھاتا رہتا ہے اور خوش ہے اپنی زندگی کا مقصد پورا کر رہا ہے۔

سُنتا ہوں بڑے شوق سے افسانۂ ہستی\
کچھ خواب ہے کچھ اصل ہے کچھ طرزِ ادا ہے

اصغر گونڈوی کا یہ شعر اچھا ہے بات کو سمجھانے کے لیے۔

۴ر جنوری ۶۷ء

آج مجھ پر بڑی جھنجھلاہٹ اور غصّہ سوار رہا اسٹوڈیو سے روانہ ہوا اپنی موٹر پر غصّہ آتا رہا۔ اس کے بعد موٹر کے کاری گر سجاد پر غصّہ آتا رہا۔ جب گاڑی لے جاتا ہے

پٹرول نکال لیتا ہے۔ گھر پہنچا تو گڈو پر غصہ آتا رہا۔ مٹھائی کھائے جاتا ہے اور داڑھ کے درد کی شکایت کرتا رہتا ہے۔ اسے ڈاکٹر کے پاس لے کر گیا۔ ڈاکٹر نہیں ملا۔ واپس میں اسے درزی کے یہاں لے گیا مگر اس نے حسب وعدہ پتلون نہیں بنائی تھی۔ اسی خفگی میں گھر پہنچا تو پتہ چلا ٹیلیفون خراب ہے۔ شہلا نے کہا کسی کا فون تھا "بل نہیں دیا تمھارا فون کٹ جائے گا"۔ ٹیلیفون پر غصہ آتا رہا۔ سونے جا رہا تھا کہ اپنے کتے پولی پر غصہ آتا رہا۔ جنگلی کتوں کی سی عادتیں اس کے اندر پیدا ہو رہی ہیں۔ آخر میں جب جائزہ لیا تو محسوس ہوا یہ غصہ مجھے اپنے اوپر تھا۔ کوئی بھی چیز میرے قبضہ میں نہیں۔

۶ر جنوری ۶۶ء

رات ۲ بجے آنکھ کھل گئی تھی۔ دن بھر طبیعت مکدر رہی ٹیلیفون کے سلسلہ میں بھی پریشان تھا۔ آخر میں پڑوس کے لڑکے نیول کو اس کام کے لیے بھیجا اور شام کو فون چلنے لگا۔ چھوٹی چھوٹی چیزیں مجھے کتنا پریشان کرتی ہیں کبھی کبھی۔ شام کو علی سردار جعفری آ گئے تھے۔ اس کے بعد باقر مہدی، قاضی سلیم اور ندا فاضلی آ گئے۔ ادھر ادھر کی باتوں اور ادیبوں شاعروں کے لطیفے سننے میں تھوڑا وقت گزر گیا۔ ندا ہمیشہ ایسے قصے بنا کر لاتا ہے۔

۷ر جنوری ۶۶ء

میں اس وقت بہت غمگین ہوں۔ ڈاکٹر ژواگو کا وہ حصہ پڑھ رہا ہوں جہاں حرکت قلب بند ہو جانے سے اچانک اس کی موت ہو جاتی ہے اور اسے اٹھا کر کمرے سے باہر لایا جاتا ہے۔ وہاں اچانک لارا آتی ہے اور ان لمحات کے بارے میں سوچ کر روتی ہے جو اس نے ژواگو کے ساتھ گزارے تھے۔ سوا یادوں اور حسرتوں کے انسان کے پاس رہ کیا جاتا ہے۔ ماضی جہاں تسکین بخش ہے۔ وہاں خوفناک بھی ہے۔ ایک عفریت کی طرح زمین آسمان کے بیچ کھڑا ہنستا رہتا ہے اس لیے کہ زندگی اور موت وہ دونوں کی حدود سے باہر ہے۔

آج بھی روز کی طرح صبح ٹہلنے گیا اور روزمرہ کے معمولات پورے کیے۔ چائے پی داڑھی بنائی اور کام میں لگ گیا۔

۲۶ر جنوری ۶۶ء

اس وقت رات کا ایک بج رہا ہے۔ راجندر سنگھ بیدی کے بیٹے نریندر کا ولیمہ تھا۔ میں آج کل پیتا نہیں اس لیے بہت دیر کسی پارٹی میں نہیں ٹھہرتا مگر بیدی کی وجہ سے بیٹھا رہا۔ پرتھوی راج میرے کرسی پاس بیٹھے تھے۔ فلمی زندگی کے پرانے قصے سناتے رہے۔ کجن بائی کی بہت تعریف کر رہے تھے۔ سن اینڈ سینڈ ہوٹل میں دعوت تھی۔ پینے کے بعد کچھ لوگوں میں جھگڑا ہو گیا۔ میں اٹھ کر چلا آیا۔

۲۸ر جنوری ۶۶ء

کل رات دیر سے سویا تھا صبح سیر کو نہیں جا سکا۔ اتم کمار کے یہاں جانا تھا۔ پرکاش اور مجید خاں انھیں لے کر ایک فلم بنانا چاہتے ہیں۔ واپسی پر احمد عباس سے ملنے چلنے گیا۔ چند روز پہلے جس ٹیکسی میں وہ جا رہے تھے۔ اس کا حادثہ ہو گیا تھا۔ ڈرائیور مر گیا تھا اور عباس کی کئی پسلیاں ٹوٹ گئی تھیں۔ ابھی تک بستر سے لگے ہوئے ہیں۔

آج کی سیاست اور ملک کی حالت کو دیکھتے ہوئے مجھے "بیچےسن" کی کتاب "empire of nabals" "ایمپائر آف نبابز" کا خیال آگیا۔ "بیچےسن" نے ہندوستان کی تحریک آزادی کا تجزیہ کرتے وقت اس کتاب میں لکھا ہے کہ وہ بچولیے اور دلال جن کے ہاتھوں ہندوستان کا کچا مال انگریزوں کے کارخانوں کو زندہ رکھنے کے لیے جاتا تھا اور وہاں سے بنے ہوئے مال کی شکل میں آتا تھا۔ انھیں اس منافع کا اندازہ ہو گیا تھا جو برطانوی سرمایہ دار اور کارخانے دار کھاتے تھے۔ انھیں خیال آیا کہ منافع انگریزوں کو کیوں ملے ہمارے پاس کیوں نہ آئے۔ اور انھوں نے ہوم رول کی تحریک شروع کر دی اور جب تحریک کامیاب ہوئی اور ہندوستان آزاد ہوا تو

سب کچھ ان ہی دلالوں کو ملا۔ عوام جیسے تھے ویسے ہی رہ گئے۔

۲۹ر جنوری ۶۷ء

کل رات دیر سے سویا تھا مگر صبح وقت پر اٹھ گیا۔ ٹہلنے گیا۔ چائے پی اور ضروریات سے فارغ ہو کر نیچے ناصر حسین کے دفتر میں گیا۔ اس لیے کہ نو بجے ناصر حسین کے دفتر میں راجندر سنگھ بیدی، ناصر حسین، سردار جعفری، آرزو اور صدیق آنے والے تھے۔ سلسلہ یہ تھا کہ بہار کی اردو اکیڈمی نے الیکشن میں اردو کے نام پر کچھ نمائندے کھڑے کیے تھے۔ اس کے لیے فلم انڈسٹری کے لوگوں سے چندہ اکٹھا کرنا تھا۔ میں نیچے پہنچا تو بیدی کے علاوہ سب آ چکے تھے۔ میں نے اوپر شیلا کو فون کیا چائے بنائے اور سب اٹھ کر میرے یہاں آ گئے۔ ابھی چائے سے فارغ بھی نہیں ہوئے تھے کہ راجندر سنگھ بیدی آ گئے اور سب مل کر چندے کے لیے نکلے۔ پہلے دلیپ کمار کے یہاں گئے۔ وہ کہیں باہر گئے ہوئے تھے۔ نسیم بانو نے دو سو روپے دیے۔ پھر آر۔ کے نیر اور سادھنا کے یہاں گئے۔ انھوں نے روپیہ دینے کا وعدہ کیا۔ وہاں سے سنیل دت کے مکان پر گئے وہ مدراس شوٹنگ کے لیے گئے ہوئے تھے۔ نرگس ملیں انھوں نے بھی وعدہ کیا۔ وہاں سے ایس مکرجی کے یہاں گئے۔ وہ تھے نہیں۔ پھر گوئل کے یہاں گئے۔ انھوں نے روپیہ دینے کے بجائے بحث شروع کر دی۔ کہنے لگے وہ اس کے قائل نہیں۔ اردو سے زیادہ اہم مسائل ملک کے سامنے ہیں۔ میں نے کہا یہ تصور کہ سارے ملک کی ایک ہی زبان ہو مہاجنی رویہ ہے۔ اس ملک میں جتنی زبانیں بولی جاتی ہیں وہ سب ہندوستانی زبانیں ہیں۔ کسی کو اس بات کا حق نہیں پہنچتا کہ ایک زبان کو دوسری پر فوقیت دے۔ گوئل تھوڑے ٹھنڈے پڑے مگر روپیہ نہیں دیا۔ وہاں سے ہم اوم پرکاش کے یہاں گئے۔ وہ شہر سے باہر گئے ہوئے تھے۔ پھر سبودھ مکرجی کے یہاں گئے۔ انھوں نے سو روپے دیے۔ اس کے بعد بی آر چوپڑہ کے یہاں گئے۔ وہ پوجا میں مصروف تھے۔ فارغ ہو کر

آئے تو روپیہ دینے کا وعدہ کیا۔ کتنا؟ یہ کل معلوم ہوگا۔ وہاں سے میں نے میوزک ڈائریکٹر روی کو فون کیا۔ انھوں نے پانچ سو روپیہ دینے کا وعدہ کیا۔ وہاں سے نکل کر میں نے سردار، آرزو اور صدیق کو کرشن چندر کے مکان پر چھوڑا اور میں گھر آگیا شہلا کو ڈرامہ دیکھنے کے لیے نیشنل کالج جانا تھا۔ اسے وہاں چھوڑا۔ اس کے بعد رضیہ اور تصدیق آگئے۔ وہ آٹھ بجے تک بیٹھے باتیں کرتے رہے۔ اس کے بعد کالج سے شہلا کو واپس لایا۔ اب کھانا کھا کر تھوڑی دیر ڈاکٹر رفیق زکریا کی لکھی ہوئی کتاب رضیہ بیگم ختم کی اور سو گیا۔

۵ر فروری ۶۷ء

پونے بارہ بج رہے ہیں۔ پچھلے کچھ دن سے شام لال بمبئی آئے ہوئے ہیں۔ وہ ابھی تک ٹائمز آف انڈیا کے ساتھ ہیں۔ ایڈیٹر ہیں۔ میں مصروفیت کے سبب مل نہیں سکا تھا۔ آج انھیں باقر مہدی اور راجندر سنگھ بیدی کو مل بیٹھنے کے لیے بلایا تھا۔ سب ابھی ابھی اٹھ کر گئے ہیں۔

آج دن میں بھی مصروفیت رہی فلم "آدمی اور انسان" کے جو مکالمے لکھے تھے آج ان پر ردو قدح ہوئی۔ کل پھر نشست ہے۔

۶ر فروری ۶۷ء

آج حسب معمول اٹھا۔ چائے پی اور اپنے کتے لومی کو نیچے ٹہلانے لے گیا اور واپس آکر کام پر چلا گیا۔ آج کل شام کو شراب پینی چھوڑ دی۔ اس کی جگہ پڑھتا ہوں پچھلے دنوں لوئی آراگاں کی کتاب "جادہ تقدیر کے مسافر" لے کر آیا تھا وہ پڑھ رہا ہوں۔ بلازا سینما میں کوئی تصویر لگی ہوئی۔ سلطانہ بیدی کی لڑکی کے ساتھ دیکھنے گئی تھیں۔ انھیں چھوڑ کر آیا تھا۔ اب لے کر آیا ہوں، آجکل رات کو اکثر کھانا بھی نہیں کھاتا۔ چائے پی کر سو جاتا ہوں۔

۸ر فروری ۶۷ء

صبح حسب معمول اٹھا۔ سیر سے واپس آکر پومی کو نیچے لے گیا۔ واپس آیا تو چائے تیار تھی۔ پی کر ڈاڑھی بنائی اور گڈو، رخشندہ اور اسماء کو اسکول چھوڑا۔ آج شہلا نہیں گئی۔ ساڑھے نو بج گئے۔ خان صاحب کی طرف گیا۔ انکم ٹیکس کے سلسلے میں کچھ رقموں کا حساب نہیں مل رہا تھا۔ وہاں سے بی آر چوپڑہ کے یہاں گیا اور کہانی پر کام کیا اور "آدمی اور انسان" کے مکالمے پڑھے۔ آج اختر مرزا نہیں آئے تھے۔ ایک بجے کام ختم ہوگیا۔ وہیں کھانا کھایا اور دفتر چلا گیا۔ آج ۱۰ر تاریخ تھی۔ تنخواہ لینی تھی۔ مجھے بارہ سو روپیہ مہینہ ملتا ہے۔ اس مہینے چوپڑہ صاحب نے دو ہزار روپیہ مہینہ کر دینے کا وعدہ کیا تھا۔ میں نے انھیں گاڑی میں یاد دلایا۔ انھوں نے ہچر مچر کی۔ میں بددل ہوگیا اور دفتر آکر بیشتر وقت خاموش رہا۔ فلم ایڈیٹر پران آیا۔ اس کے ساتھ جاکر ایڈیٹنگ روم میں بیٹھ گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد چوپڑہ آئے اور کہنے لگے انھوں نے میری تنخواہ بڑھادی۔ شاستری کو ہدایت دے دی گئی ہے۔ روپیہ میں نے لے لیا مگر جی خوش نہیں ہوا۔ جس کام کے کرنے میں نفاست کو ملحوظ خاطر نہ رکھا جائے گراں گزرتا ہے۔ واپس گھر آیا۔ سلطانہ کو مہینہ کا سامان خریدنا تھا۔ انھیں لے کر بازار گیا۔ واپس آیا تو یونیورسٹی کے ایک صاحبزادے بیٹھے کمار آئے ہوئے تھے۔ وہ مجھے اپنی ایک نشست کا صدر بنانا چاہتے تھے۔ میں نے ان سے پوچھا اپنے جلسے میں انھوں نے اور کس کو بلایا ہے۔ انھوں نے کہا قمر جلال آبادی اور شکیلہ بانو بھوپالی۔ مجھے احساس ہوا اس جلسے کا کوئی ادبی مقصد نہیں۔ میں نے معذرت کی اور انھیں ٹال دیا۔

۱۰ر فروری ۷۶ء

اوپر میں نے اپنی ڈائری کے کچھ صفحات اس لیے نقل کر دیے کہ میرے کام اور کاروبار زندگی کی ایک جھلک مل جائے۔ اس زمانے میں فلم کا کام بھی میں نے بہت کیا اور ادبی کام بھی۔ میرے ان دو مشغلوں میں ٹکراؤ کبھی پیدا نہیں ہوا۔ عام طور پر جو شاعر

فلم کی زندگی اختیار کرتے ہیں وہ گانے لکھتے ہیں۔ میں نے بہت آغاز ہی میں طے کر لیا تھا میں فلموں کے لیے گانے نہیں لکھوں گا۔ جوش کہا کرتے تھے اگر شاعر فلم کے لیے گانے لکھنے لگے تو اس کی شاعری کا معیار پچاس فیصد گر جاتا ہے۔ میرے ذہن میں ایسا کوئی تصور نہیں تھا۔ میں شاعری کو شاعری کی جگہ رکھنا چاہتا تھا اور مکالمہ نگاری کو پیشہ بنانا چاہتا تھا اور میں نے وہی کیا۔ فلم کی زندگی کو گرم رکھنے کے لیے میں نے باہر کی فلمیں بھی لکھیں اور مستقل طور پر بی آر فلمز سے بھی متعلق ہو گیا۔ ایسا ہی کوئی سلسلہ میں ادبی کام کے لیے بھی کرنا چاہتا تھا۔ میراجی بھی میرے ذہن میں تھے اس لیے کہ بمبئی آنے کے بعد سے وہ مستقل میری ذمہ داری بن گئے تھے۔ میرے ایک دوست تھے شام کشن نگم۔ میں انھیں دلی سے جانتا تھا۔ جن دنوں میں بارہ دری شیر افگن خاں میں رہتا تھا وہ پڑوس کی گلی میں رہتے تھے۔ انھوں نے بمبئی میں آکر پریس کا کام شروع کیا۔ میری ان سے یہاں بھی ملاقات ہوتی رہتی تھی۔ میراجی کو مصروف رکھنے کے لیے میں نے ان کے تعاون اور شرکت میں " خیال" نام کا ایک ماہنامہ نکالا اور میراجی کو اس کا مدیر بنا دیا۔ مشاورتی کمیٹی میں ظ انصاری اور مدھو سودن بھی تھے۔ وہ پرچہ غالباً ترقی پسند حلقہ کو خطرے کی گھنٹی محسوس ہوا۔ حیدرآباد کانفرنس میں ترقی پسند میراجی کو رجعت پسند کے خطاب سے نواز چکے تھے۔ اور ان کے ساتھ ہر ادبی تعاون سے بچتے تھے بمبئی آنے سے پہلے حلقۂ ارباب ذوق کے نام سے میراجی ایک کامیاب ادبی مہم چلا چکے تھے۔ ایک طرح سے حلقۂ ارباب ذوق اور ترقی پسند ایک دوسرے کے مدمقابل تھے۔ ادب کی طرف حلقہ کے لوگوں کا رویہ کیا تھا۔ اور ترقی پسندوں کا کیا یہ میں مختصراً پچھلے صفحات میں بتا چکا ہوں۔ مگر دراصل ایسا تھا نہیں یہ صرف ترقی پسند حلقہ والوں کا خیال بلکہ وہم تھا۔ " خیال" کے مشکل سے چھ پرچے نکلے ہوں گے کہ انھوں نے اس کے خلاف ایک محاذ بنا لیا اور صابو صدیق انسٹی ٹیوٹ میں ایک بہت بڑا جلسہ کیا۔ جس میں مجھے بطور مجرم کے بلایا۔ میں جانے سے انکار بھی کر سکتا تھا۔ مگر نہیں کیا۔ اس میں سردار جعفری پیش پیش تھے۔ انھوں نے بڑی دبنگ آواز میں پوچھا میں نے

میراجی کو "خیال" کا ایڈیٹر کیوں بنایا۔ میں نے ان سے بالکل سیدھے سادے لفظوں میں پوچھا آپ صاحبان کون ہیں؟ پرچہ میرا، روپیہ میرا، ادارہ میرا، نظم و نسق میرا، آپ یہ سوال کس حیثیت سے کر رہے ہیں۔ مقصد یہ کہ وہ مہم ٹیں ٹیں فش ہو کر رہ گئی۔ چھ پرچے نکال لینے کے بعد میراجی کا انتقال ہو گیا۔ اور اپنی فلمی زندگی کے سبب میں بھی "خیال" کو زندہ نہیں رکھ سکا۔ میرے ساتھ بڑا مسئلہ یہ تھا کہ جہاں میں ترقی پسندی کے خلاف نہیں تھا اس نعرے سے بچنا بھی چاہتا تھا جو اس وقت کے بیشتر لکھنے والے ادب کے نام پر لگا رہے تھے۔ میرے خیال کے مطابق وہ اپنی بات کہنے کا بہتر طریقہ نہیں تھا۔

مثبت اور ترقی پسند دونوں زاویوں کو ذہن میں رکھ کر میں نے شاعری کرنے کی کوشش کی اور اس پر آج تک قائم ہوں۔ اچھی بات کہنے کا ایک ہی طریقہ نہیں ہوتا یہ میرا ایمان ہے اور لٹھ مار بات دھماکا تو پیدا کر سکتی ہے موثر نہیں ہوتی۔ بیشتر ترقی پسند جاگیردار اور بورژوا طبقہ سے تعلق رکھتے تھے۔ اور اپنے ادب میں وہی قدریں لے کر آئے۔ جنھیں وہ آگے بڑھانا چاہتے تھے مگر ان قدروں کے اور ان جذبات کے پاؤں نہیں تھے۔ ان لکھنے والوں نے مقبول ہونے کے لیے سب کچھ کیا۔ مگر اپنے آپ کو ڈی کلاس نہیں کیا۔ میرے ان کے اس رویّہ نے کبھی جھگڑے کی صورت اختیار نہیں کی تھی۔ بس اپنی تنقیدوں اور تحریروں میں یہ میرا ذکر نہیں کرتے تھے۔ مگر سب کے ساتھ میرے مراسم اسی طرح قائم تھے۔ ایک روز سردار جعفری کا ٹیلیفون آیا۔ بیروت میں افریقی ایشیائی ممالک کے نمائندوں کی کانفرنس ہو رہی ہے تم بھی جا رہے ہو۔ دعوت نامہ ایک دو روز میں مل جائے گا۔ تیاری کر لو تیاری کیا کرنی تھی جلدی جلدی ایک دو بند گلے کے کوٹ سلوائے۔ ایک دو پتلونیں بنائیں۔ سفر کا غذات کا جائزہ لیا۔ اس سلسلے میں ایک دو بار دلی بھی جانا پڑا۔ جن ملکوں کے ویزا مل سکے وہ حاصل کیے اور بیروت کے لیے روانہ ہو گیا۔

رات کے نو بج رہے ہیں۔ صبح بمبئی سے ۷ بجے کے قریب بیروت کے لیے روانہ ہوا تھا۔ ڈھائی بجے بیروت پہنچا۔ کھانا جہاز میں کھایا۔ آتے ہی کانفرنس میں چلے گئے۔ ابھی ابھی واپس آئے ہیں اب نیند آرہی ہے۔

۲۵ مارچ ۶۷ء

رات اتنی دیر سے پلٹے کہ آتے ہی سو گیا۔ آج کا سارا دن بس میں بیٹھے بیٹھے گزر گیا۔ یہاں رومیوں کی بنائی ہوئی کوئی جگہ ہے جسے "بال بیک" کہتے ہیں۔ صبح وہاں جانے کا پروگرام تھا۔ مگر برف پڑنے لگی اور راستہ بند ہو گیا۔ دوپہر کا کھانا کمال جملات کے مکان پر مختارا میں تھا۔ یہ دروز قبیلہ کے پیشوا ہیں۔ یہ سوشلزم کے بہت حامی ہیں اور یہاں کے رہنما اور جنرل سکریٹری ہیں۔ دیر حمر تک پہنچے تھے کہ برف پڑنے لگی۔ راستہ میں ایک پرانا قلعہ تھا وہ بھی نہیں دیکھ سکے۔ مختارا پہنچتے پہنچتے ساڑھے تین بج گئے۔ کمال جملات نے معافی چاہی موسم خراب ہونے کی وجہ سے ہم وہاں کا لطف پورا نہیں اٹھا سکے۔ سجاد ظہیر نے ہندوستان کے ایک اچھے شاعر کی حیثیت سے جملات سے میرا تعارف کرایا اور ہم دونوں نے ان کے ساتھ تصویریں کھنچوائیں جملات نے معذرت کی اگر موسم اچھا ہوتا تو وہ ہمیں وہاں کے لوک گیت سنواتے۔

ہوٹل سے مختارا کو جو راستہ جاتا ہے۔ بہت خوبصورت ہے۔ راستہ سمندر کے ساتھ ساتھ بنا ہوا ہے۔ بیروت اور گرد و نواح کی تعریف میں یہ کہانی کافی ہے کہ جب حضرت عمر کی فوجوں نے لبنان پر حملہ کیا تو فتح کے بعد بہت سے عرب فوجی وہیں ٹک گئے۔ کہنے لگے رسولؐ نے ہم سے جنت کا وعدہ کیا تھا جہاں حسین عورتیں ہوں گی۔ اور نہریں ہوں گی۔ ہمیں وہ جنت یہیں مل گئی۔ اب کہیں نہیں جائیں گے۔ بیبلوس ایک پرانا شہر ہے۔ جس کے بارے میں کہا جاتا ہے یہ دنیا کا سب سے پرانا آباد شہر ہے وہاں ایک کتبہ ملا ہے جسے میں نے ابھی دیکھا نہیں یہاں کے عجائب گھر میں رکھا ہے۔ اس کے بارے میں خیال ہے اس پر جو حروف کندہ ہیں ان سے

موجودہ ابجد اور حروفِ تہجی کا آغاز ہوا ہے۔ بائیبل کا لفظ بھی اسی کا مرہونِ منت ہے۔ یہاں ایک طرح کا کاغذ یا چھال ہوتی ہے جس پر پہلی بار بائیبل لکھی گئی تھی۔ بستی کے نام کی مناسبت سے کتاب کا نام بائیبل پڑ گیا۔

واپس آنے کے بعد کچھ دیر اپنے کو گرم کرتے رہے۔ ساڑھے نو بجے روسی نمائندوں سے ملنے گئے۔ عظیم وقاف اس کے پیشوا ہیں۔ ترسون زادہ دست راست۔

۲۷ / مارچ سنہ ۶۷ء

کل کا دن ٹھیک سے شروع نہیں ہوا جب سے یہاں آیا ہوں۔ صبح کی سیر نہیں ہو رہی۔ ساڑھے نو بجے کے قریب انٹرنیشنل ہوٹل گئے۔ جلسہ وہیں ہوتا ہے۔ دوپہر کا کھانا کھا کر پھر جلسہ میں چلے گئے۔ رات کو کیسینو کا پروگرام تھا۔ سب کھانا کھانے کی تیاری کر رہے کہ کلیم اللہ اور ڈاکٹر ملک راج آنند میں جھڑپ ہو گئی۔ کلیم اللہ افریقی ایشیائی انجمن کے یہاں مستقل نمائندہ ہیں۔ انھوں نے کہیں کہہ دیا کام ہم کرتے ہیں نام دوسروں کا ہوتا ہے۔ ملک راج اس بات پر خفا ہو گئے اور دونوں میں کافی دیر تکرار ہوئی۔ دن کا پروگرام یہ تھا کہ ہر ملک کا نمائندہ اپنے ملک کے مسائل کی ایک رپورٹ تیار کر کے لایا تھا۔ ہندوستان کی طرف سے یہ کام ڈاکٹر آنند اور سجاد ظہیر نے بچن کے سپرد کر دیا۔ اس رپورٹ میں وہاں کے سیاسی، معاشی اور ثقافتی کاموں کی پوری تفصیل ہوتی تھی۔ بچن نے جو رپورٹ کے طور پر لکھا اس نے کسی پر کوئی اثر نہیں چھوڑا۔ اس میں ہندوستان کے سیاسی معاشی اور ثقافتی مسائل کا بھی کوئی ذکر نہیں تھا۔ دوسرے جن ملکوں کی مذمت اور افریقی ایشیائی لوگوں کے کاموں اور جدوجہد کی جو تعریف کرنی چاہیے تھی اس کا کہیں دور دور پتا نہیں تھا۔ ویت نام کی لڑائی کا جن لفظوں میں ذکر کرنا چاہیے تھا وہ سرے سے غائب تھا شاید انگریزوں کے خیال سے۔ مزید براں تقریر ہندی میں تھی جس کا ترجمہ ملک راج نے انگریزی میں کیا تھا اور وہ ترجمہ اپنی جیب میں رکھ لیا تھا۔ جب بچن نے اپنی تقریر پڑھی وہ بھی پاس

آکر کھڑے ہوگئے اور ہندی کے ساتھ انگریزی میں پڑھنے لگے اور بڑا خلط مبحث ہوا۔

رات کو کیسینو گئے۔ وہاں سکرین اور اسٹیج کو اس خوبصورتی سے ملایا ہوا تھا کہ بیک وقت سکرین اور اسٹیج کا لطف آتا تھا۔ منظر اس طرح بدلتے تھے جیسے سکرین پر بدلتے ہیں۔ غرض جس طرح بھی جو پیش کیا جارہا تھا بہت ہی قابل تعریف تھا۔ مناظر اور ان کی... پیشکش کے علاوہ ایک چھ گھوڑوں کی بگھی بھی تھی جو سٹیج پر اسی رفتار سے دوڑائی گئی تھی جس طرح سکرین پر دکھاتے ہیں۔ اس کے علاوہ اور بہت آئٹم تھے خاص طور پر ننگی اور نیم برہنہ لڑکیاں جن کے جسم بہت خوبصورت تھے۔ مگر کراہت کا کہیں احساس نہیں ہوتا تھا۔ کیسینو سے بیروت شہر کا منظر بہت اچھا ہے۔ بڑا لبھانے والا۔

۲۹ مارچ ۶۷ء (صبح)

کل کا سارا دن انتظامیہ کمیٹی کی نذر ہوگیا۔ جتنے نمائندے آئے تھے وہ تین کمیٹیوں میں تقسیم ہوگئے تھے۔ ایک وہ جو ایشیائی افریقی انجمن کو چلانے کے لیے جو قرار دیں پیش ہوں گی انھیں عمل میں لانے کے لیے لائحہ عمل پیش کرے گی۔ دوسری اس کے نکلنے والے جریدے اور کتب خانہ کے قیام پر کام کرے گی۔ اس کتب خانہ اور جریدے کا کام ہوگا کہ بچھڑی ہوئی اقوام جیسے "گھانا" اور "کینیا" اور اس کے آس پاس کے دوسرے علاقوں کے لوگوں کے ادب کو منظر عام پر لائے گی اور ان کی اشاعت کرے گی۔ تیسری کمیٹی اس کے ثقافتی پہلوؤں اور ان کی افزائش و ترقی میں ہاتھ بٹائے گی۔ میں اس تیسری کمیٹی میں تھا۔ آٹھ بجے اختوشینکو اپنی نظمیں سنانے والے تھے وہاں چلا گیا۔ اختوشینکو سے ملا بھی اور نظمیں بھی سنیں۔ نظموں کے ترجمے عربی میں تھے۔ نظمیں انھوں نے اپنی زبان میں پڑھیں۔ میرے لیے دونوں کا سمجھنا مشکل تھا۔ بیچ سے اٹھ کر چلا آیا۔ اور سوگیا۔ صبح پراگ جی نے بتایا رات ہندوستانی سفارت خانے کے کچھ لوگ آئے تھے۔ انھوں نے کوئی مشاعرہ منعقد کیا تھا پہلے بچن کو ڈھونڈتے رہے۔ بچن نہیں ملے تو مجھے تلاش کرنے لگے۔

میں سو گیا تھا۔ پھر معلوم نہیں کیا ہوا۔

۲۹ مارچ ۱۹۶۷ء (صبح)

اس وقت رات کے ساڑھے دس بج رہے ہیں۔ ابھی ابھی روسی سفارت خانہ سے واپس آئے ہیں۔ کاک ٹیل پارٹی تھی۔ میں نے بھی دو گلاس شربت کے پیے۔ صبح ہندوستانی سفارت خانہ میں جا کر پاسپورٹ میں روس، شام، انگلینڈ، روم، فرانس اور جرمنی وغیرہ کا اندراج اور اضافہ کرایا۔ ایک مہینہ کی مدت اور بڑھوائی۔ بڑا سکون ملا۔ ایک ہفتہ ماسکو اور لینن گراڈ کی سیر کرنے کے بعد لندن جاؤں گا۔ میں کاک ٹیل پارٹی میں دوسرے نمائندوں سے اس موضوع پر باتیں بھی کرتا رہا سیاست اپنی جگہ اس ادیبوں اور شاعروں کی کانفرنس میں کوئی دوسری بات کیوں نہیں ہوتی کسی ملک کے ادیب نے نہ اپنی کہانی سنائی نہ نظمیں سنائی گئیں۔ یہ کوئی ادیبوں کا اجتماع نہیں کہلایا جا سکتا۔ افریقی ایشیائی مسائل پر تو پہلی دو نشستوں میں کافی کچھ کہہ سن لیا گیا تھا۔ پھر اس اجتماع کا مقصد کیا تھا کچھ نمائندوں نے میری بات سے اتفاق کیا۔

۲۹ مارچ ۱۹۶۷ء (رات)

صبح دمشق چلا گیا تھا۔ اب واپس آیا ہوں۔ وہاں ایک دعوت کھائی۔ دنبے کے شکم میں چاول اور میوہ بھر کے اسے دم پخت کیا ہوا تھا۔ تیار ہونے کے بعد دنبے کو لٹکا دیا گیا تھا اور کھانے والے اسی میں سے نکال نکال کر کھا رہے تھے۔ اس کے بعد شہر کی سیر کو چلے گئے۔ کچھ تاریخی عمارتیں دیکھیں۔ اب تفصیل یاد نہیں رہی۔ دمشق کے بازار پر مجھے دلی کے چوک کا دھوکا ہوا۔ ماحول اور فضا کم و بیش ویسی ہی تھی۔ لوگ پانی کے مشکیزے کاندھوں پر لٹکائے کٹورے بجا بجا کر شربت بیچ رہے تھے۔ میرا خیال ہے ہندوستان والوں نے کٹورے بجانے کی یہ رسم عربوں سے لی ہے دلی تو ایک

زمانے میں عربوں، ترکوں اور مغلوں کا بڑا گڑھ رہا ہے۔ بعد میں ان پناہ گزینوں کا کیمپ دیکھنے گئے جنھیں فلسطین سے نکال دیا گیا تھا۔ ظاہر ہے بہت بری حالت میں ہیں کیمپ کیچڑ میں پٹے ہوئے ہیں۔ مگر مجھے ان کی یہ حالت دیکھ کر تعجب یوں نہیں ہوا کہ بمبئی اور دوسرے بڑے شہروں میں ہندوستان کے غریب لوگ اپنی مرضی سے ایسی گندی جگہوں میں رہتے ہیں۔ ملک راج بڑے زندہ دل آدمی ہیں۔ ہر نئی لڑکی سے اپنا تعارف کرانے کے بعد فوراً اپنی تخلیقات کا ذکر کرنے لگتے ہیں۔ سجاد ظہیر کہہ رہے تھے دنیا کے ہر بڑے شہر میں ان کی ایک محبوبہ ہے اور ایک ناشر بھی۔

۳۰ر مارچ ۶۷ء

کل بیروت سے دمشق جاتے ہوئے جو چاروں طرف کے پہاڑ، برف سے ڈھکے ہوئے، راستہ میں دیکھے وہ ابھی تک آنکھوں میں پھر رہے ہیں۔ ایسا لگتا تھا بے برگ و گیاہ پہاڑوں کے اوپر برف منڈھ دی گئی ہے۔ بیروت سے نکلنے کے بعد سے چند میل دور شام تک پوری وادی برف کی بنی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔ یہاں کے لوگ کہہ رہے تھے، اس سال یہاں معمول سے زیادہ برف پڑی ہے۔

آج کا دن تھوڑا سُست رفتاری سے گزرا۔ دوپہر کا کھانا ہندوستانی سفیر خوب چند کے یہاں تھا۔ وہاں سے پلٹا تو ابراہیم بلوچ آ گئے۔ کانفرنس میں آئے ہیں۔ ہندوستان پاکستان اور دوسرے ایشیائی افریقی ادب سے بہت اچھی طرح واقف ہیں۔ مجھ سے ترجمہ کرنے کے لیے نظمیں مانگ رہے تھے۔ وہ عربی میں ترجمہ کرنا چاہتے ہیں۔

۳۱ر مارچ ۶۷ء

آج ہم بیروت کے بازاروں کی سیر کرتے رہے۔ پورا شہر بہت صاف ستھرا ہے اور لوگ خوشحال نظر آتے ہیں۔ وہ چھوٹے چھوٹے بچے بھی جو سڑکوں پر چیونگ گم

اور دوسری چیزیں بیچتے ہیں۔ بہت خوشحال اور صاف ستھرے نظر آتے ہیں۔ سمندر کے کنارے کنارے جس طرح شہر آباد ہے بہت اچھا لگتا ہے۔ دوپہر کا کھانا ہم نے ایک ہندوستانی ریسٹوراں میں کھایا۔ کھانا اچھا تھا مگر مرچیں ضرورت سے زیادہ تھیں۔ واپس آکر لیٹ گیا۔ ابراہیم میرے ساتھ تھے۔ شام کو ہندوستانی ایسوسی ایشن نے چائے پر مدعو کیا تھا۔ وہاں چلے گئے۔ وہاں سے شری نواسن کی کاک ٹیل پارٹی میں چلے گئے جب سے پینا چھوڑا ہے میرا وزن پچیس تیس پونڈ گر گیا۔ کاک ٹیل سے واپس آیا تو ابراہیم آ گئے۔ ابھی ابھی اٹھکر گئے ہیں۔

۱؍ اپریل ۶۷ء

آج کا دن کسی خاص مصروفیت میں نہیں گزرا۔ ساڑھے نو بجے کے قریب نزار اور ان کی بہن ہدا آ گئے۔ میں اور بالو پوریا خرید و فروخت کی نیت سے نکلے انھیں اپنے بچوں کے لیے کپڑے خریدنے تھے۔ میں نے پوری خریداری لندن پر اٹھا رکھی ہے۔ ایک بجے کے قریب واپس آئے۔ نزار چلے گئے۔ میں نے کھانا کھایا اور سو گیا۔ پانچ بجے اٹھا۔ منھ دھویا کپڑے بدلے اور نیچے چلا گیا۔ نزار کے یہاں جانا تھا۔ وہ چھ بجے کے قریب آئے میں سجاد ظہیر اور بالو پوریا نزار کے یہاں گئے۔ نزار کے والد حسن مروہ یہاں کے معروف ادیبوں میں ہیں۔

وہاں سے ہم آٹھ بجے کے قریب واپس آئے۔ نزار کے یہاں ایک فلسطین کے شاعر معین سیسو سے ملاقات ہوئی۔ دیر تک اختوشنیکو کی شاعری پہ بات ہوتی رہی۔ واپسی میں ساتھ آئے۔ میں، وہ، ابراہیم ہوٹل تک پیدل آئے۔ مجھے ہوٹل پہنچا کر دونوں واپس چلے گئے۔ اب سوتا ہوں۔ صبح ماسکو کے لیے روانہ ہونا ہے۔

۲؍ اپریل ۶۷ء

بیروت سے ۲؍ بجے روانہ ہو کر ہم ۶ بجے ماسکو پہنچے۔ یہاں کی گھڑی میں اس

وقت ۷ بج رہے تھے۔ معلوم ہوا ماسکو ایک گھنٹے آگے ہے۔ بڑی سخت دھند تھی اور چاروں طرف برف جمی ہوئی تھی۔ بڑی سخت سردی تھی اور کمرہ بھی ٹھنڈا تھا۔ کہتے ہیں یہاں ان دنوں برف پگھل جایا کرتی ہے مگر اس سال دیر ہوگئی۔ ہماری ترجمان ایک لڑکی ہے۔ ایلنیا اسے مشرقی زبانوں کا بہت شوق ہے۔ مزید تعلیم کے لیے دلی جانے والی ہے۔ ابھی ہم سب نیچے ہال میں بیٹھے تھے۔ میں نے تھوڑا شوربا پیا اور چائے پی۔ ہال میں ناچ ہو رہا تھا۔ ایلنیا نے بتایا یہ دراصل یہودی ناچ ہے۔ ماسکو میں جانے کیوں مقبول ہے۔ میں نے کہا شاید اس لیے کہ اس میں ایک جنگلی پن ہے۔ آج کا انسان ساری پابندیاں توڑ دینا چاہتا ہے۔

ملک راج اسی جہاز سے واپس جا رہے ہیں۔ ایلنیا انھیں چھوڑنے جا رہی ہے۔

۳ اپریل ۶۷ء

اس وقت ۱۲ بج چکے ہیں۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے بالشویک تھیٹر سے آیا ہوں۔ یہاں پس منظر اور مناظر کی تبدیلی سے اس کے ساتھ ہی روشنی کے استعمال سے ایک معمولی سی کہانی کو کس حسن کے ساتھ پیش کیا تھا۔ اس طرح اہل روس نے اپنے پہلے کی روایت کو بھی باقی رکھا اور کام کرنے والے لوگوں کے زندہ رہنے کے امکانات بھی پیدا کر دیے۔

صبح روسی ادیبوں کی کانفرنس میں بیروت کانفرنس پر بیانات ہوتے رہے میں جہاز میں جنوبی افریقہ کے ادیب لاگوما اور چینگ کے بعد جاپان کے ادیب ٹفتا سے باتیں کرتا رہا مگر امید افزا بات کوئی نہیں ہوئی۔ میری کوشش تھی ایک چھوٹا سا حلقہ بنا کر ہر ملک کا نمائندہ ادب پیش کیا جائے۔

ہر ملک کا نمائندہ ادب کیا ہے اس کا فیصلہ کون کرے گا؟ روس کی طرف سے مریم ہر جگہ پیش پیش ہوتی ہے ـــ معلوم ہوتا ہے اس کانفرنس کا بھی کوئی نتیجہ نہیں نکلنے والا۔

۴ اپریل ۶۷ء

ہندوستانی سفارت خانے میں پارٹی تھی۔ ابھی آیا ہوں۔ وہاں مختلف لوگوں سے ملاقات ہوئی جن میں علی یاور جنگ اور فاروقی بھی تھے۔ فاروقی آجکل دلی یونیورسٹی میں شعبہ اردو کے صدر ہیں۔ علی یاور جنگ علی گڑھ یونیورسٹی میں پرو وائس چانسلر ہیں

آج میں لینن گراڈ جارہا ہوں۔ میرا ترجمان ساشا دس بجے آئے گا۔ آج صبح ہم ریڈیو اسٹیشن بھی گئے تھے۔ میں نے وہاں ایک چھوٹی سی تقریر کی اور ایک نظم "سبزۂ بیگانہ" ریکارڈ کرائی۔ روسی ادیبوں کی انجمن نے کھانے پر بلایا تھا۔ ۲ بجے وہاں گئے۔ روسیوں کا یہ دستور کہ کھانے کی میز پر وقفہ وقفہ سے مہمان کے بارے میں تعریفی جملے کہتے جاتے ہیں۔ اور اس کا جام صحت پیتے جاتے ہیں۔ اچھا لگتا ہے۔ پارٹی میں مرزا ترسون زادہ، رسول حمزہ، ابراہیم اوت مرزا چنگیزی اور بہت سے ادیب تھے۔ تعریف جام صحت اور کھانا سب مل کر تین چار گھنٹے کا پروگرام ہوگیا تھا۔ ۶ بجے ہندوستانی سفارت خانے جانا تھا ابھی آکر اپنا پاسپورٹ لیا ہے اور ساشا کا انتظار کر رہا ہوں۔

۶ر اپریل ۶۷ء

میں آج ہی لینن گراڈ سے واپس آیا ہوں۔ ۶ر اپریل کی رات کو گیا تھا۔ بہت خوبصورت شہر ہے۔ اس قدر عمدگی اور ترتیب کے ساتھ بسا ہوا شہر میں نے آج تک نہیں دیکھا تھا۔ عمارتیں اور سڑکیں بہت عمدہ اور وسیع ہیں۔ مصوری کے فن کا لینن گراڈ میں بہت بڑا ذخیرہ ہے۔ ارمی تاژ، پیٹروگراڈ کا محل، ایک پرانا گرجا، سب نہایت ہی قابل دید جگہیں ہیں۔ ان میں بڑے بڑے مصوروں کی تصویریں اور ان کے کام کا بہت بڑا ذخیرہ ہے۔ سامنے ایک پرانا اسکول ہے۔ لینن اس میں رہا کرتے تھے۔ وہاں ایک ہال ہے۔ جس میں جلسے ہوا کرتے تھے۔ اور لینن تقریریں کیا کرتے تھے۔ جس کمرہ میں لینن رہا کرتے تھے۔ وہاں ان کا پلنگ اور صوفہ ابھی تک پڑا ہے۔ وہاں ان کے ہاتھ کی تحریریں اور فرمان بھی ہیں۔ ٹیپ ریکارڈ کی ہوئی آواز بھی ہے میں نے سنی وہاں وہ کمرہ اور ہال بھی ہے جہاں بہت سے ہنگامے ہو چکے تھے۔ زار روس کا وہ

محل بھی دیکھا جہاں ۱۹۰۵ میں کسانوں پر گولی چلی تھی۔ اس لیے کہ انھوں نے روٹی مانگی تھی۔ رات کو وہاں ایک ناچ تھا۔ وہ پروگرام دیکھا۔ جس رات واپس آرہا تھا۔ ایک ڈرامہ بھی دیکھا۔ تیسرے ایکٹ سے اٹھ کر آگیا۔

۹ اپریل ۶۷ء

اس وقت رات کے ۱۰ بجے رہے ہیں۔ کٹھ پتلی کا تماشا دیکھ کر ابھی ابھی واپس آیا ہوں۔ جس طرح ہندوستان میں ہوتا ہے۔ یہاں یہ تماشا اس طرح نہیں ہوتا اس کی باقاعدہ ایک فن اور ڈرامہ کی حیثیت ہے۔ جو تماشا آج تھا وہ آدم حوا، گندم کے دانے سے متعلق تھا۔ انسان اور پتلے دونوں کو ملا کر ڈرامہ کا کردار بنایا گیا تھا۔ آدم اور حوا پتلیاں تھیں اور شیطان اور انسان، آدمی۔ علامتی کردار بنا کر پیش کیا گیا تھا اور اچھا دلچسپ تھا۔ روسی زبان میں تھا۔ اس لیے بات سمجھ میں نہیں آئی مگر جو پیش ہوا وہ سب کچھ سمجھ میں آگیا۔

میرا ترجمان میرے ساتھ تھیٹر نہیں جا سکا۔ اسے سجاد ظہیر اور سبھاش مکھو پادھیائے کو چھوڑنے ہوائی اڈے پر جانا تھا۔ میں نے اپنے ترجمان سے کہا مجھے تھیٹر میں کسی ایسے آدمی سے ملوا دینا جو انگریزی یا اردو جانتا ہو۔ وہاں گئے تو اس کی پہچان کی ایک لڑکی مل گئی۔ اس نے مجھے اس لڑکی سے ملوایا۔ وہ روسی کے علاوہ کوئی دوسری زبانیں نہیں جانتی تھی۔ لطیفہ یہ ہوا کہ اس نے مجھے ایک اور لڑکی سے ملوایا۔ وہ بھی روسی کے علاوہ دوسری زبان نہیں جانتی تھی اور ڈرامہ دیکھتے وقت میری زبان نہ جاننے کے باوجود مجھے مطلب سمجھانے کی کوشش کرتی رہی۔ ایک لڑکی کے پاس ایک دوربین تھی۔ جب اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آتا۔ دوربین میری آنکھوں سے لگا دیتی تھی۔ دوسری لڑکی کے ساتھ ایک صاحب اور تھے جو چپ چاپ یہ سب دیکھتے رہے اور میں اس صورتحال پر دل ہی دل میں ہنستا رہا۔ کھیل ختم ہونے کے بعد پہلی لڑکی مجھے میرے ہوٹل چھوڑنے آئی۔ راستہ میں اپنا نام بتایا۔ شاید ساگا تھا۔ اب ٹھیک سے یاد نہیں رہا۔

۱۰ اپریل ۶۷ء

اگلا دن اس طرح گزارا ریڈیو سے روبل ملے تھے۔ ارما محمد علی اور اس کے بچوں کے لیے کچھ خریدا۔ رخشندہ کے لیے ایک گھڑی خریدی اس کے بعد لینن کا مزار پر پہرہ گیا۔ وہاں جس چیز نے بہت متاثر کیا وہ لینن کے مزار پر پہرہ بدلنے کا سماں تھا لینن کے مزار پر ہر وقت دو باوردی سپاہی مستعد کھڑے رہتے ہیں۔ بندوقوں پر ہاتھ رکھے ہوئے۔ یہ پہرہ ایک ایک گھنٹے بعد بدلتا ہے۔ چار فوجی ایک ساتھ آتے ہیں۔ ان میں سے دو بڑھ کر پہلے پہرہ داروں کی جگہ لے لیتے اور جو پہلے سپاہی پہرہ پر ہوتے ہیں، آنے والے فوجیوں کے ساتھ مل جاتے ہیں۔ اور پھر چاروں مل کر واپس چلے جاتے ہیں۔ شام کو لیوتھ پیلس دیکھنے گیا۔ وہ بند تھا۔

۱۱ر اپریل ۶۷ء

میں کل ۱۲ بجے کے قریب ماسکو سے لندن پہنچا۔ یہاں میرے بڑے سالے محمد علی منصوری رہتے ہیں۔ وہ ایک زمانے سے لندن میں ہیں۔ ایک جرمن لڑکی ارما سے شادی کر لی ہے۔ اس سے دو بیٹیاں ہیں۔ میں جب لندن پہنچا وہ ہوائی اڈے پر نہیں تھے۔ تھوڑی دیر بعد ارما کا ٹیلیفون آیا۔ اس نے بتایا وہ میرا انتظار ٹرمینل پر کر رہے ہیں۔ میں بس لے کر ٹرمینل پر پہنچا وہ وہاں تھے ہم نے وہاں سے ایک ٹیکسی اس کے بعد ٹرین لی۔ اس کے بعد دوسری ٹرین لی۔ پھر وہاں سے کچھ دور پیدل چلے اور ان کے مکان پر بائرن روڈ پہنچے۔

ارما اچھی ہے مگر ہر وقت اپنی ناداری کا رونا روتی ہے۔ لندن میں میرے کالج کے ایک ساتھی عباس احمد عباسی بھی رہتے تھے۔ میں نے انھیں ٹیلیفون کیا وہ فوراً آ گئے۔ شام کو ان کے گھر چلا گیا۔ آج بھی تمام دن عباسی ہی کے ساتھ رہا۔ بی بی سی پر کچھ ریکارڈنگ کرائی اور انٹرویو دیا۔ اس کے بعد عباسی مجھے ایک خاتون سے ملانے لے گئے۔ جن کے شوہر دلی میں ایک مشہور دل کے ڈاکٹر تھے لطیف نام تھا۔ اب حیات نہیں۔ بیگم لطیف اب کوئی کاروبار کرتی ہیں۔ ان کا ایک

لڑکا ہے مومن۔ تھوڑی دیر میں ایک اور صاحب اپنی بیوی کے ساتھ آ گئے اور مومن کو لے کر کسی جلسے میں چلے گئے جہاں اغلام اور امرد پرستی پر بحث تھی۔ لندن میں امرد پرستی جرم نہیں۔

آمنہ لطیف کوئی فلم بنا رہی ہیں جس میں میری مدد لینا چاہتی ہیں۔ کہانی عباس احمد عباس کی ہے۔ آج صرف ادھر ادھر کی باتیں ہوتی رہیں۔ اس کی کہانی کل سنوں گا۔ آمنہ لطیف سے مل کر مجھے پروتما داس گپتا کا خیال آیا۔ ویسی ہی بے تکلف اور زندہ دل سی ہیں۔ سر کے بال سفید ہیں نہیں رنگتی ہیں۔ اور ہر وقت جھٹکے پر ڈالے رہتی ہیں۔ چہرہ بالکل جوان ہے۔ کہانی سننے کے بعد معلوم ہوگا۔ وہ مجھ سے کیا مدد لینا چاہتی ہیں۔ اس بہانے کچھ روپیہ مل گیا تو بچوں کے لیے کچھ خرید لوں گا۔

۱۲ر اپریل ۶۷ء

آج کا دن لندن کے مشہور مقامات دیکھنے میں گزرا۔ محمد علی کی چھٹی تھی۔ وہ یہاں ایک ادارے میں کام کرتے ہیں۔ جو اپاہج اور ذہنی مفلوج بچوں کے لیے ہے۔ میں اور محمد علی پہلے عباس کے یہاں گئے۔ ان کے ساتھ اگلا پروگرام بنا کر عجائب گھر چلے گئے اور مصری ممیاں اور دوسرے لوادر دیکھتے رہے۔ اس کے بعد آکسفورڈ اسٹریٹ چلے گئے۔ میں نے شہلا، اسما اور گڈو کے لیے ایک ایک قلم خریدا۔ سلطانہ کے لیے بھی گڈو کے لیے ٹکٹوں کا البم بھی۔ پھر ادھر ادھر گھومنے کے بعد ایک جگہ چائے پی۔ اس کے بعد ایک فلم دیکھی جس کا نام تھا "Who is afraid of Virginia Wolf" وہاں سے نکلنے کے بعد سیدھے گھر آئے۔ پھر وہ البم دیکھتے رہے جو ایک زمانہ پہلے سلطانہ نے محمد علی کیلئے بھیجی تھی۔ اس میں ہماری اور بچوں کی پرانی تصویریں تھیں۔
محمد علی اکثر ہندوستان جانے کی باتیں کرتے رہتے ہیں۔ ارما باتوں میں ہر وقت بہار کے قحط کا ذکر کرتی ہیں۔ جیسے ہندوستان رہنے کی جگہ نہیں۔ غالباً وہ ہندوستان جانا نہیں چاہتی۔ اس کے ذہن میں شاید ہندوستان سے متعلق کوئی خوف بھی ہوگا۔

آج لندن سے پیرس اور وہاں سے آگے کے ٹکٹ کا بندوبست کرنے کے بعد ایرانڈیا کے دفتر جانے کا ارادہ تھا اب کل پر ملتوی کر دیا۔

۱۲ اپریل ۶۶ء

کل جو گیلری دیکھی تھی اس کا نام میڈیم تسوڈ یا تساڈ کی گیلری ہے اس میں بڑے بڑے لوگوں کے موم کے پتلے بنا کر رکھے گئے ہیں۔ بڑے لوگوں کے ساتھ جرائم پیشہ لوگوں کے بھی پتلے ہیں۔ شاید میڈم تساڈ ان پتلوں کی زبان میں یہ کہنا چاہتی ہیں کہ انسان کے اندر جرم کا شائبہ نہ ہو تو وہ بڑا بن ہی نہیں سکتا۔

صبح عباس کے یہاں گیا۔ وہیں دوپہر کا کھانا کھایا اور آمنہ لطیف کے یہاں چلا گیا۔ شام کو میں آمنہ اور عباس کی بیوی ڈاکٹر ژواگو دیکھنے چلے گئے اور اس طرح دن تمام ہو گیا۔

۱۴ اپریل ۶۶ء

آج ۱۲ بجے ایک صاحب جن کا نام برنی ہے پیڈنگٹن اسٹیشن کے باہر ملنے والے تھے۔ وہ یہاں لندن میں کوئی فلم بنا رہے ہیں اور اس پر میرا مشورہ چاہتے تھے۔

۲ بجے ہم نے ایک ہندوستانی ہوٹل میں کھانا کھایا۔ اس کے بعد پیرس اور وہاں سے قاہرہ کے لیے اپنا ٹکٹ کرایا۔ میرا جنیوا جانے کا بھی خیال تھا مگر ملتوی کر دیا۔ قاہرہ میں کلیم اللہ ہیں۔ ان سے بیروت ہی میں طے ہو گیا تھا۔ میں واپس قاہرہ ہوتا ہوا جاؤں گا۔ اور ان کے پاس قیام کروں گا۔ مجھے اہرام دیکھنے کا بہت شوق تھا۔

ہوٹل سے نکل کر ہم آرٹ گیلری گئے۔ میں اور محمد علی چھ بجے تک آرٹ گیلری میں رہے۔ اساتذہ کی نایاب تصویریں دیکھیں۔ آرٹ گیلری سے نکل کر ٹریفالگر سکوائر گئے۔ وہاں ایک کیفے میں چائے پی۔ پھر پیدل ویسٹ منسٹر ایبے اور

ڈاؤ ننگ اسٹریٹ ہوتے ہوئے ٹیمز دریا پر گئے۔ یہ دریا لندن کے بیچوں بیچ بہتا ہے۔ پھر ٹیمز کنارے ایک کیفے میں چائے پی۔ وہاں سے زمین دوز ریل میں بیٹھ کر محمد علی کے گھر نارتھ ویمبلے آ گئے۔ اور تھوڑی دیر ٹی وی دیکھ کر سو گیا۔

۱۵/ اپریل ۶۷ء

آج کا آدھا دن گھر میں گزرا۔ ہم دوپہر کے کھانے کے بعد گھر سے نکلے۔ ارما راستے میں ایک باغ میں رک گئیں۔ دونوں لڑکیوں کو ساتھ لے کر گئی تھیں۔ محمد علی کے ایک انگریز دوست ہیں۔ انھوں نے چائے پر بلایا تھا۔ ہم وہاں چلے گئے۔ ان کے یہاں سے شام کے ۶ بجے نکلے اور ادھر اُدھر ٹہلتے ہوئے آٹھ بجے گھر پہنچے۔ لندن کے دیہات اور مضافات جیسے خوبصورت ہیں، ایسے ہی ہندوستان کے مضافات بھی ہو جائیں تو لوگ گاؤں چھوڑ کر شہروں میں منتقل ہونا چھوڑ دیں۔ جیسے ہی ہم گھر پہنچے عباس بیوی بچوں کے ساتھ آ گئے۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے اٹھ کر گئے ہیں۔ مُصر تھے میں ساتھ چلوں۔ میں نے کہا صبح آؤں گا۔

۱۶/ اپریل ۶۷ء

آج کا سارا دن ضائع ہو گیا۔ نہ کوئی جگہ دیکھ پائے نہ کوئی دوسرا کام ہوا۔ آمنہ لطیف کے یہاں تجارتی باتوں میں خراب ہو گیا۔ جو کوئی خاص تجارتی بھی نہیں تھیں۔ مجھے اپنے اوپر بہت غصہ آیا۔ خیال تھا اس کام میں ڈھائی سو پونڈ پیشگی مل جائیں گے اب صرف سو پونڈ مل رہے ہیں۔ اگر ان صاحب سے بیروت میں روپیہ مل جاتا جنھوں نے بمبئی میں وعدہ کیا تھا تو یہاں کیوں زحمت ہوتی۔ سوا سات بجے ہم آمنہ لطیف کے یہاں سے نکلے۔ اور عباس اور میں تھیٹر دیکھنے چلے گئے۔ ڈرامہ کا نام "اولڈ کپل" (Old Couple) تھا۔ ڈرامہ امرد پرستی سے متعلق تھا۔ ان دنوں لندن میں یہ بحث بہت عام ہے۔

۱۷/ اپریل ۶۷ء

واپس آیا تو سلطانہ کا خط ملا۔ وہ بہت پریشان ہیں۔ بوا کی طبیعت خراب ہے۔ سلطانہ اپنی والدہ کو بوا کہتی ہیں۔

۱۷ اپریل ۶۷ء

آج میں صبح سویرے ہی نکل گیا۔ عباس کے یہاں گیا۔ انھیں ساتھ لے کر نکلا تو گھر میں ایک طرح کی بدمزگی ہوگئی۔ میاں بیوی میں بنتی نہیں۔ ایک نے غصہ لڑکے پر نکالا۔ دوسرے نے لڑکی پر۔ ان کے دو بچے ہیں جو بہت ضدی ہیں۔ لڑکا کپڑے بدلتے بدلتے وہیں کھڑے کھڑے پیشاب کر دیتا ہے۔ لڑکی بھی بات بات پر ہٹ کرتی ہے۔ دونوں بچوں سے اگر کوئی پیار جتائے تو بہت خوش ہوتے ہیں بلکہ چمٹنے لگتے ہیں۔ ظاہر ہے دونوں کو ماں باپ کی محبت اور شفقت نہیں ملی۔

وہاں سے آمنہ لطیف کے یہاں گئے۔ کچھ دیر ان کی کہانی پر کام کیا اور اسے ایک شکل دی۔ وہاں سے نکل کر میں اور عباس ایک فلم دیکھنے چلے گئے۔ فلم کا نام " مارا سا د" تھا۔ مارا وہ شخص ہے جس نے انقلاب فرانس میں بہت نمایاں حصہ لیا تھا۔ اور ساد وہ شخص ہے جس کے نام پر نفسیات کی اصطلاح "سادیت" بنی ہوئی ہے یہ فلم آرٹ تھیٹر میں چل رہی تھی۔

فلم کے اندر بڑے مزاحیہ انداز میں کچھ باتیں کہی گئی تھیں۔ جن لوگوں کو گلوٹین کیا جاتا تھا۔ ان کا خون ایک بالٹی میں بھر دیا جاتا تھا۔ اس میں بادشاہ کا خون نیلا تھا سیاستداں کا خون سفید اور ایک عام آدمی کا خون سرخ تھا۔

۱۸ اپریل ۶۷ء

آج صبح آمنہ لطیف کے یہاں بیٹھ کر معاہدہ ٹائپ کرایا اور کچھ روپیہ لیا۔ طے یہ پایا جب ہم کہانی پر بات کرنا چاہیں گے۔ وہ مجھے ٹیلیفون کریں گی۔ میں مکالمہ لکھ کر ڈاک سے بھجواؤں گا۔ وہاں سے نکل کر ساوائنس کے یہاں گئے۔ وہ لندن میں بی۔ آر فلمز کے

ڈسٹری بیوٹر ہیں۔ سوچا تھا ان سب کو "وقت" دکھادوں مگر انتظام نہیں ہو سکا۔ اس کے بعد ہم ایک فلم دیکھنے چلے گئے۔ نام تھا "Man for all sea sons.") یہ جارج کرام ویل، اور لوٹ بیا کے مصنف کا تھے مس مور کا قصہ ہے۔ مور کا کردار بہت اچھا دکھایا گیا تھا۔ وہاں سے نکل کر ایک جگہ آکر کافی پی اور میں سب سے رخصت ہو کر گھر آگیا۔

۱۹ر اپریل ۱۹۶۷ء

میں آج صبح ۹ بجے کے جہاز سے پیرس آگیا۔ جہاز میں میرے برابر ایک انگریز لڑکی بیٹھی تھی۔ اس سے باتیں ہوتی رہیں۔ کوکنی انگریزی بولتی تھی۔ خاصی بے تکلف سی تھی۔ کہہ رہی تھی پیرس کی سیر ساتھ مل کر کریں گے مگر اتا پتا اس کا بھی کچھ نہیں تھا میرا بھی نہ تھا پھر ملاقات نہیں ہوئی۔ پیرس میں کہاں ٹھہرنا تھا اس کا انتظام محمد علی نے لندن ہی میں کر دیا تھا۔ یہ ایک نیم سرکاری ہوٹل تھا۔ پیرس پہنچتے ہی میں نے شہر دیکھنے کا پلان بنایا یہ نیم سرکاری اور سرکاری ہوٹل کی بسیں ہوتی ہیں جو ہوٹل سے لے جاتی ہیں اور واپس چھوڑ جاتی ہیں۔ میں نے ایسی ہی ایک بس میں اپنا انتظام کیا اور چلا گیا۔ ہوٹل میں کمرہ لیتے وقت آپ کو بتانا پڑتا ہے غسل خانے والا کمرہ چاہیے یا بغیر غسل خانے کے غسل خانے والے کمرے کے دام زیادہ ہوتے ہیں۔

شہر کے گلی کوچوں کے سب نام تو یاد نہیں رہے البتہ ناترے دم کا گرجا اور پیگال ضرور یاد ہیں۔ لوور بڑے بڑے مصوروں کی تصویروں کا خزانہ ہے۔ یہاں بہت سے نایاب مجسمے بھی ہیں جو مختلف مقامات پر ملے ہیں اور یونانیوں اور رومیوں کے عہد سے متعلق ہیں لوورے میں اور تصویروں کے علاوہ لیو نارڈو ڈاونچی کی مشہور زمانہ تصویر مونالزا بھی دیکھی۔ اس کے علاوہ آئفل ٹاور اور ان کے ساتھ سب ہی دنیا کے بڑے بڑے مصوروں کے فن کا کمال نظر سے گزرا تقریباً آدھا دن لوور میں گزر گیا جو بہت کم تھا۔

واپس آکر سوچا کچھ کھالوں۔ ایک ہوٹل میں گیا۔ اس نے کہا کھانا شام کو ۷ بجے۔

میں نے ایک سنڈوچ لیا۔ اس میں ادھ کچرا گوشت بھرا ہوا تھا۔ وہ میں نے پھینک دیا۔ اس کے بعد دو پیالی کافی پی اور ایک پنیر کا سینڈوچ کھایا۔ ۸ بجے کیسینو دیکھنے گیا۔ یہ بیروت کے کیسینو سے اچھا نہیں لگا مجھے۔

۲۱، ۲۲ اپریل ۶۷ء

آج کا دن بھی پیرس دیکھنے میں گیا۔ صبح ہم مختلف بازاروں سے ہوتے ہوئے پہلے Revolution square گئے۔ اس کا یہ نام انقلاب فرانس کے بعد پڑا تھا۔ شاہ فرانس اور میری این توائنت کو یہیں گلوٹین کیا گیا تھا۔ اس کے بعد نپولین کی قبر پر گئے۔ وہاں سے ایفل ٹاور" آرک آف ٹرائمف اور مختلف بازاروں سے گزرتے ہوئے ماؤنٹ مارتر پر آ گئے۔ یہاں ایک گرجا ہے۔ وہاں سے سارا پیرس دکھائی دیتا ہے۔ پیرس بہت خوبصورت شہر ہے۔ لینن گراڈ کے بعد یہ دوسرا خوبصورت شہر ہے۔

دوپہر بعد ورسائی گئے۔ یہ شاہان فرانس کا حلقہ ہے۔ پیرس سے دو ڈھائی میل باہر۔ محل دکھاتے وقت ایک جگہ گائیڈ لڑکی بولی یہاں کھڑے ہو کر میری این توائنیت نے کہا تھا۔ "تمھارے پاس روٹی نہیں تو کیک کیوں نہیں کھاتے"۔ میرا خیال ہے وہ غلط بتا رہی تھی۔ یہ بات روس کی ملکہ زارینہ نے کہی تھی۔ تھوڑی دیر کھڑا اس بالکنی کو دیکھتا رہا جہاں میری این توائنیت کے اس جملے پر تاریخ نے فیصلہ دیا تھا "اس کی گردن مار دی جائے"۔

محل کے نیچے حوض اور شہر کا منظر بہت خوب صورت ہے اور محل کی چھتوں اور دیواروں کو کہیں مصوری کے اعلیٰ نمونوں سے مزین کیا گیا ہے اور کچھ قالینوں اور خاص طور پر بنائے ہوئے محل سے اکثر جگہ تصویروں میں عورتوں کے سینے کھلے ہوئے ہیں غالباً یہ بات اس وقت کے فرانس کے کلچر کا حصہ تھی۔ واپسی میں شان زے لی زے پر گاڑی رکی۔ میں نہیں اترا۔

شہر کے بیچ سے دریائے سین گزرتا ہے۔ ورسائی جاتے وقت گاڑی دور تک

دریائے سین کے ساتھ ساتھ جاتی ہے۔ پیرس کے گرد و نواح میں جنگل خاص طور پر اگایا گیا ہے اور بہت اچھا لگتا ہے۔

اب سوتا ہوں صبح قاہرہ کے لیے روانہ ہونا ہے۔

۲۲ راپریل ۱۹۶۷ء

۱۱ بجے کے قریب پیرس سے روانہ ہو کر جہاز، لگ بھگ ایک گھنٹہ کے قریب یونان کے ہوائی اڈے ایتھنز پر رکا۔ اتر کر ہم وہاں کی دکانوں پر گئے۔ میں یونان سے کوئی یادگار چیزیں خریدنا چاہتا تھا۔ ایک دکان پر ایک چھوٹے سے لکڑی کے ٹکڑے پر گرجا بنا ہوا دکھائی دیا۔ مجھے اچھا لگا مگر خریدا نہیں۔ سقراط اور افلاطون کے وطن سے میں گرجا نہیں خریدنا چاہتا تھا۔ جدھر نظر جاتی تھی گلیاں سنسان اور بازار بند نظر آ رہے تھے۔ وہاں نئی حکومت آئی تھی۔ اور اس نے کسی مصلحت کی بنا پر بازاروں، گلیوں میں کھلے بندوں پھرنے پر پابندی لگا رکھی تھی۔

ATHENS بالکل سمندر کے کنارے آباد ہے۔ سمندر بھی بہت گہرا نیلا تھا اور بہت خوبصورت مگر خوفناک نظر آ رہا تھا۔ میں نے بند گلے کا کوٹ اور پتلون پہن رکھی تھی۔ جب ہم ہوائی اڈے پر چیزیں خریدتے پھر رہے تھے، کچھ بچے لڑکے اور لڑکیاں، مجھے دیکھ کر ایک دوسرے کو ہاتھ جوڑ جوڑ کر نمستے کر کے ایک دوسرے کو یہ بتا رہے تھے، میں اس ملک کا رہنے والا ہوں جہاں اس طرح ہاتھ جوڑ کر ایک دوسرے کو آداب کورنش کرتے ہیں۔

ایتھنز سے روانہ ہو کر ڈیڑھ پونے دو گھنٹے میں ہم قاہرہ پہنچ گئے مقامی وقت ۶ بجے کا تھا۔ مجھے راستہ بھر افسوس رہا۔ میں جنیوا کیوں نہیں گیا۔ میرے پاس ٹکٹ تھا۔ وہ ضائع ہو گیا۔ قاہرہ پہنچ کر جی بہت خوش نہیں ہوا۔ پیرس کے مقابلے میں یہ جگہ اتنی خوبصورت نہیں تھی۔ کلیم اللہ مجھے لینے ہوائی اڈے پر آ گئے تھے۔ ان کے ساتھ پروگرام یہ بنا کہ کل صبح یہاں کا عجائب گھر دیکھوں گا۔ اور دوپہر کو اہرام

اور دوسری تاریخی جگہیں۔ اگلی روز رات کے جہاز میں جگہ مل گئی تو واپس چلا جاؤں گا۔

۲۴ر اپریل ۶۷ء

آج ۱ر بجے تک قاہرہ کا عجائب گھر دیکھتا رہا۔ کتنی صدیوں کی تہذیب ایک جگہ اکٹھی کر دی گئی ہے۔ اتنا بڑا تہذیبی ذخیرہ ایک دن میں توجہ سے دیکھنا ممکن نہیں تھا۔ میں نے یہ کہہ کر دل کو تسلی دے لی میں کوئی تحقیق کا طالب علم تو نہیں جو ہر چیز کو باریک بینی سے دیکھوں اور ایک طرف سے جو سامنے آیا دیکھتا چلا گیا۔ پھر بھی چار گھنٹے لگے۔ پتھر کے پورے پورے سالم مجسمے اور حسین اتنے کہ بیان ممکن نہیں۔ سب سے بڑا ذخیرہ توت آنخ آموں کا تھا۔ یہ بادشاہ شہزادگی ہی کے زمانے میں مر گیا تھا۔ کوئی سولہ سترہ سال کی عمر میں اس کے لیے جو ضرورت کی چیزیں تھیں سب اس کے ساتھ دفن کر دی گئی تھیں۔ زیورات، سونے کے برتن، لباس، کنیزوں غلاموں سمیت اور بھی جو لوازمات شاہی تھے سب اس کے ساتھ دفن تھے۔

دوپہر کو واپس آ کر کلیم اللہ کا انتظار کرتا رہا۔ پھر ہم دونوں نے ایک ہوٹل میں جا کر کھانا کھایا۔ اس دن قاہرہ میں گوشت نہیں ہوتا تھا۔ کھانا بھی میرے مزاج اور ذائقہ کا نہیں تھا۔ ۴ر بجے نکل کر ہم ہوٹل سے اہرام پہنچے۔ کلیم اللہ ساتھ تھے۔ اہرام سے متعلق ایک عجیب سا رومانی تصور میرے ذہن میں تھا۔ وہاں جا کر معلوم ہوا وہ بڑے بڑے پتھروں سے بنا ہوا ایک مخروطی ڈھانچہ ہے جنھیں ایک کے اوپر ایک رکھ کر چن دیا گیا ہے۔ اہرام کی چوٹی پر ایک گڑھا ہوتا تھا۔ جن میں فراعنہ دفن کیے جاتے ہیں۔ اہرام کے اوپر جو پتھر تھے وہ بہت قیمتی تھے۔ غالباً اس پتھر کا نام کہربا تھا سلطان محمد علی نے وہ پتھر توڑ کر نکلوا لیے تھے۔ اور ان سے مسجد کے ستون بنوائے تھے۔ ابوالہول اور اہرام کو اچھی طرح دیکھنے کے بعد اور اندر وہ جگہیں دیکھنے کے بعد جو فراعنہ کی قبریں تھیں۔ سب سے بلند اہرام پر چڑھ گئے اندر گیا۔ وہ بھی ایک بادشاہ کی دفن گاہ تھی۔

دراصل فراعنہ کے عقیدے کے مطابق زندگی کی ضرورتیں مرنے کے بعد بھی ویسی ہی رہتی تھیں جیسی ان کی زندگی میں ہوتی تھیں۔ اس لیے ان بادشاہوں کی ضرورت کا سارا سامان ان کے ساتھ ہی دفن کر دیا جاتا تھا۔ جنھیں ان کے مزاروں اور قبروں کے متولی ایک مدت گزرنے کے بعد نکال لیتے تھے۔ اہرام سے واپسی میں سلطان صلاح الدین کا قلعہ اور سلطان محمد علی کی مسجد تھی دیکھی اور ان پتھروں کے ستون جنھیں وہ اہرام سے نکال کر لایا تھا۔ اس کے بعد سلطان حسن کی مسجد دیکھی جسے کلیم اللہ غلطی سے حضرت امام حسن سمجھتے رہے تھے۔ پھر گاڑی میں دور تک فصیل شہر کے ساتھ چلتے رہے۔ یہ رومیوں کی حکومت کا نشان اور ان کی قلعہ کی بنیاد تھی جو رو بہ زوال ہے بہت ایک دیوار کھڑی ہے جس میں کہیں کہیں رخنے پڑ گئے ہیں۔ اس دیوار اور ان آثار کو دیکھ کر ہم قلوپطرہ اور انطونی کی محبت کا ذکر کرتے رہے اور رومیوں کی فتوحات اور ان کے عشق کی داستان دہراتے رہے۔ جواب صرف لفظوں میں باقی رہ گئی تھیں۔ قاہرہ کی زمین پر اس کا کوئی نشان سوا چند پتھروں کے نہیں رہ گیا تھا۔ ہوٹل میں واپس آنے کے بعد بیٹھے ادھر ادھر کی باتیں کرتے رہے۔ پھر ایک ہندوستانی کیفے میں جا کر چائے پی میں نے سموسے بھی کھائے اس کے بعد ساڑھے نو بجے ایک عربی فلم "عقد لولو" دیکھی جو بہت معمولی تھی۔ واپس آیا تو معلوم ہوا میرے کمرے کے برابر ایک نائٹ کلب ہے جہاں ایک یونانی رقاصہ ناچتی ہے۔ مگر پیرس اور بیروت کے کلب دیکھ چکا تھا۔ میں نہیں گیا۔

۲۵ اپریل ۶۷ء

قاہرہ میں آخری دن میں آسودہ کے اہرام یا قبریں دیکھنے گیا۔ میرے ساتھ ایک انگریز اور امریکی جوڑا بھی تھا۔ گاڑی نے پہلے مجھے میرے ہوٹل سے لیا پھر امریکی جوڑے کو پھر انگریز جوڑے کو۔ امریکی نے گاڑی سے داخل ہوتے ہی اپنا تعارف کرایا۔ اور بے تکلف ہو گیا۔ مگر انگریز جوڑا بہت دیر تک بے تعلق رہا۔ پھر وہ بھی دوست

بن گیا اور ہم سب نے مل کر قاہرہ کی سیر کی۔ میمفس میں ریمیس دوئم کا مجسمہ دیکھا۔ اس کے بعد آسور آ گئے۔ اور ابو الہول کے بعد ایک مصری رئیس کا مقبرہ بھی دیکھا جس کا نام مرارکا تھا۔ مرارکا اپنے وقت میں ایک بت تراش اور مصور تھا اور جگہ جگہ اس نے دیواروں پر اس وقت کی زندگی نقش کی تھی۔ کہیں لوگ ندی میں مچھلیاں پکڑ رہے ہیں۔ کہیں بازار میں خرید و فروخت ہو رہی ہے کہیں مرارکا ان لوگوں کو سزائیں دے رہا ہے جنھوں نے لگان نہیں دیا تھا اور کہیں عام لوگ روزمرہ کے کام کرتے نظر آتے ہیں۔ اس سے پہلے روز ہم نے فراعنہ کے مقبرے دیکھے تھے ان کا نام چسپ یا فوفو تھا۔ اور دوسرا مقبرہ خفری یا جبرن کا تھا۔ واپس آ کر میں نے کلیم اللہ کے ساتھ ایک ہندوستان کینٹے میں کھانا کھایا۔ یہ ہندوستانی سرکار کا ہوٹل ہے جو چائے کو مقبول کرنے کے لیے بنایا گیا ہے۔ یہاں سبزی ترکاری، دال روٹی، پوری بھاجی بھی ملتی ہے۔ کھانے کے بعد میں نے تھوڑی دیر آرام کیا پھر اٹھ کر اور پنا ہندوستانی لباس کرتا پاجامہ پہن کر ہوائی اڈہ کے لیے روانہ ہو گیا۔

قاہرہ کے بارے میں جو رائے پہلے دن قائم کی تھی اسے بدلنا پڑا۔ یہ بھی خوبصورت شہر ہے اور جس طرح فرانس اور لندن کے بیچ سے دریائے سین اور ٹیمز بہتا ہے۔ قاہرہ کے بیچ و بیچ دریائے نیل بہتا ہے اور اسے دو حصوں میں تقسیم کرتا ہے۔

۲۶ اپریل ۶۷ء

صبح ساڑھے چار بجے ہندوستان پہنچا اور ایک مہینہ کی تگ و دو کے بعد بیروت دمشق، ماسکو، لندن، فرانس اور قاہرہ کا سفر ختم ہو گیا اور میری روزمرہ کی زندگی شروع ہو گئی۔ ۹ بجے بی آر چوپڑہ کو فون کیا۔ اس کے بعد پریم جی اور غفار ناڈیاڈ والا کو ٹیلیفون کیا۔ دفتر جا کر ایک فلم کا سین لکھا۔ واپسی میں راستے سے کچھ خربوزے خریدے اور گھر آ گیا۔

۲۷ اپریل ۶۷ء

باب ۱۴

شاید ان دنوں میرے پاؤں میں گردش تھی۔ افریقی ایشیائی کانفرنس سے پلٹے ابھی چند روز ہوئے تھے اور جو کام میں ادھورا چھوڑ گیا تھا جیسے راج کھوسلہ کی فلم "میرا سایہ" جسے وہ پریم جی کے لیے بنا رہے تھے اور رشی راج اور بی آر کی تصویریں جنھیں دن رات ایک کرکے پورا کرنے میں لگا ہوا تھا کہ ایک نئے فلم ساز میرے پاس آئے اور کہا، وہ افریقہ کے پس منظر میں ایک فلم بنانا چاہتے ہیں اور مجھ سے لکھوانا چاہتے ہیں۔ میں نے کہا ضرور لکھوں گا، مگر یہ سارا پس منظر جو آپ فلم میں دکھانا چاہتے ہیں، میں نے خود کبھی نہیں دیکھا۔ اس کے علاوہ وہ کہانی کیا ہے جسے آپ افریقہ میں بنانا چاہتے ہیں۔ انھوں نے کہا: کہانی آپ لکھیں گے پس منظر آپ کو میں دکھا دوں گا۔

اس پروڈیوسر کا نام پنچھی تھا اور یہ اپنے خاندان سمیت برسوں سے افریقہ میں رہتے تھے۔ چنانچہ طے ہوا کہ ان کے ساتھ میں فلم کا ڈائرکٹر اور فوٹوگرافر جائیں گے اور جہاں جہاں فلم کی شوٹنگ کرنی ہے وہ تمام جگہیں دیکھ لیں گے۔ اس کے بعد ان سے لین دین کی بات طے ہو گئی اور وہ مجھے کچھ پیشگی رقم دے کر چلے گئے۔ دو روز بعد انھوں نے ٹیلیفون پر بتایا فلم کے ڈائرکٹر دلال گوہا ہیں۔ اور کیمرہ مین جی سنگھ۔ پروگرام کے مطابق ۲ رمارچ ۶۸ء کو صبح ۱۰ بجے ہم ایسٹ افریقن ایرویز سے روانہ ہوکر نیروبی پہنچے۔ دو ہوٹلوں میں الگ الگ جگہ ملی۔ ایک میں پنچھی اور میں ٹھہرے، دوسرے میں دلال گوہا اور جی سنگھ۔ دراصل جانا تو ہمیں اروشا تھا۔ کمرے وہیں طے کیے ہوئے تھے مگر جب نیروبی پہنچے تو بارش ہو رہی تھی۔ اروشا کے لیے فوراً روانہ ہونا مصلحت کے خلاف سمجھا گیا۔ نیروبی سے اروشا کا فاصلہ ۱۷۹ میل تھا۔ ایک بجے دن میں کراچی پہنچے تھے۔ ویزا نہ ہونے کے سبب میں یہاں عزیزوں اور دوستوں سے بھی نہیں مل سکا۔

صبح ہوتے ہی کو لمبیا ہوٹل، جہاں میں اور پنچھی ٹھہرے تھے، اسے خیر باد کہا اور "اِن ورتھ" ہوٹل پہنچے۔ دلال گوہا اور رجی سنگھ وہاں تھے۔ وہاں سے ہم سب پنچھی کے بہنوئی کے یہاں گئے ان سے میں ایک بار بمبئی میں مل چکا تھا۔ کچھ دیر وہاں بیٹھ کر روانہ ہو گئے اور نیروبی کے بازاروں سے گزرتے ہوئے اروشا کے لیے نکل پڑے۔ نیروبی کینیا کی ریاست میں ہے اور اوشا تنزانیہ کی ریاست میں نیروبی سے نکلنے کے بعد ہی جنگل شروع ہو گیا۔ تھوڑی دیر کے لیے راستہ میں ایک ہوٹل پر رُکے اور کوکو کولا وغیرہ پیا۔ اروشا جاتے ہوئے جگہ جگہ نیل گائیں، ہرن، زیبرے اور ژرافت راستہ بھر ملتے رہے۔ ۲½ ا بجے کے قریب اروشا پہنچے۔ چھوٹا سا مگر اچھا خوبصورت شہر تھا۔ ارد گرد چھوٹی چھوٹی پہاڑیاں تھیں، جن میں گھری ہوئی یہ جگہ بہت اچھی لگ رہی تھی۔ اروشا پہنچ کر ہم ہارٹلے نام کے ایک انگریز سے ملے، جس کا پیشہ چڑیا گھروں کو جنگلی جانور مہیا کرنا تھا۔ پھر ان کے ساتھ ایک سفاری کے یہاں گئے، جس کا نام براؤن تھا۔ جان اس کا نائب تھا۔ ان دونوں سے سفر میں ساتھ لے جانے کا معاملہ کیا۔

ہارٹلے کا ایک بہت بڑا اصطبل یا باڑہ تھا جہاں اس کے پکڑے ہوئے یا خریدے ہوئے جانور بند تھے۔ ہارٹلے، براؤن اور جان تینوں ہی انگریز تھے۔ اور تینوں بڑے زندہ دل قسم کے آدمی تھے۔ خاص طور پر براؤن۔ وہ بہت ہی کھلاڑی طبیعت کا تھا۔ جہاں اروشا میں قیام کیا اس کا نام اروشا ہوٹل تھا۔ رات اروشا ہوٹل میں گزری اور صبح ہوتے ہی ہم سب اور جان اور براؤن اپنے سفر پر نکل گئے، افریقہ کے جنگل کی سیر اور فلم کے لیے مناظر کی تلاش میں۔ پہلی جگہ جہاں ہم اروشا سے نکل کر پہنچے، اس کا نام میناڑا جھیل تھا۔ اس کے کنارے ارد گرد ۲۴ ا میل میں پھیلا ہوا ایک گھنا جنگل تھا جس میں کثرت سے شیر، چیتے، جنگلی بھینسے زیبرے، نیل گائیں، ہاتھی اور طرح طرح کے جانور تھے۔ براؤن برسوں سے سفاری کے پیشے میں تھا۔ وہی جیپ چلا رہا تھا۔ جان اس کے پاس بیٹھا تھا۔ راستہ میں موٹر یا جیپ سے اتر کر پیدل چلنے کی اجازت نہیں تھی۔ اس میناڑا جھیل کے علاوہ راستہ میں اور بہت سی چھوٹی چھوٹی جھیلیں یا جوہڑ تھے۔ جن میں طرح طرح کے پرندے اور آبی گھوڑے تھے۔ جنگل سے میرا بہت بڑا ناطہ رہا تھا۔ جن دنوں سنگھ بستی میں رہتا تھا۔ اور لوٹریہ کے اسکول

میں بڑھتا تھا۔ ان دنوں روز جنگل سے گزرتا تھا۔ سگھ بستی کے نکال پر ایک بہت بڑا باغ تھا۔ واپسی میں اکثر وہاں بیٹھ جاتا تھا۔ باغ کے کنارے پر ایک جوہڑ تھا جہاں بھینسیں پانی میں پڑی رہتی تھیں۔ ایک بار میں نے دیکھا جوہڑ میں ایک بچہ ڈوب رہا ہے۔ میں اضطراری طور پر جوہڑ میں کود گیا۔ جب ڈوبنے لگا ایک بھینس کی دُم پکڑ لی۔ گھبرا کر بھینس باہر نکلی اور اس کے ساتھ میں اور بچہ بھی باہر آ گئے۔ مگر یہ مینارا جھیل اور اس کا جنگل تو بے پناہ چیز تھی۔ حدِ نظر تک پھیلا ہوا۔ اور سرسبز و شاداب۔ سگھ بستی کا جنگل اور باغ اور مینارا جھیل کا گرد و پیش سب ایک دوسرے میں گڈمڈ ہو گئے اور مجھے یہ سب دیکھ کر بڑا لطف آ رہا تھا کہ اچانک دو بھینسے ایک دوسرے کا تعاقب کرتے ہوئے پیش منظر میں آ کر کھڑے ہو گئے۔ کیا حسین جانور تھے دونوں کا عنفوانِ شباب تھا۔ شاید یہ ان کے وصال کا موسم بھی تھا۔ بیس تیس منٹ بعد ایک ہاتھیوں کی قطار نے راستہ روک لیا۔ اور تھوڑی دیر رُک کر آگے نکل گئے۔ اروشا سے نکل کر دور تک ایک خوبصورت وادی اور جنگل تھا۔ راستہ میں ڈھیر سارے شتر مرغ، لکڑ بگھے، تیندوے بھیڑیے اور گیدڑ دکھائی دیے۔

مینارا جھیل کے بعد ہم انگورنگورو پہنچے۔ یہ ایک بہت بڑی غار نما جگہ تھی۔ اس کے نشیب میں بھی ایک جھیل تھی اور ارد گرد، اونچائی پر کشادہ زمین کا ایک ٹکڑا جس پر خیمے لگے ہوئے تھے۔ اور ایک معمولی سا ہوٹل بنا ہوا تھا۔ اس جگہ کے بارے میں ہمیں الگ الگ دو باتیں بتائی گئیں۔ پہلی یہ کہ کبھی یہاں پر بہت بڑے آتش فشاں تھے جو پھٹ گئے تھے۔ اور ان کا لاوا اس وادی میں پھیل گیا تھا۔ اور اب آہستہ آہستہ ایک وسیع میدان اور جنگل بن گیا تھا۔ ہم رات کو وہیں اس ہوٹل میں قیام کرنے والے تھے۔ خیموں کے علاوہ یہاں کمرے بھی بنے ہوئے تھے جن میں ابھی بجلی نہیں آئی تھی۔ اس جگہ کا کیمبا کیمپ نام تھا۔ انگورنگورو کے غار دو ہزار فٹ کی نیچائی میں تھے۔

براؤن بہت اچھا ڈرائیور اور سفاری تھا۔ جب ہم نیچے وادی میں پہنچے تو جگہ کے پھیلاؤ اور خوبصورتی کا اندازہ ہوا جسے لفظوں میں بیان کرنا مشکل ہے۔ وادی کا رقبہ ہمیں ۱۲۰ مربع میل بتلایا گیا۔ وادی میں جانور بھیڑ بکریوں کی طرح بکھر رہے تھے۔ ہم نے سات گینڈے، نو شیر، سیکڑوں

ہرن اور طرح طرح کے جانور دیکھے۔ جیسے نیل گائیں، شتر مرغ، لکڑ بگھے، جنگلی مرغیاں اور ڈھیر سارے دوسرے پرندے۔ حکومت نے یہاں شکار کی ممانعت کر رکھی ہے۔ وادی پہنچ کر پہلا سامنا ایک مادہ گینڈے سے ہوا۔ اس کے ساتھ اس کا بچہ بھی تھا۔ براؤن نے تھوڑی دیر مادہ گینڈے سے چھیڑ کی۔ جب گاڑی جان کر اس کے قریب لے جاتا تھا اور جب وہ گاڑی پر حملہ کرتی تھی تیز بھگا کر دور لے جاتا تھا۔ براؤن نے ہمیں بعد میں بتایا کہ وہ ہمارے اوپر حملہ نہیں کر رہی تھی، اپنے بچے کی مدافعت میں ہمارے پیچھے بھاگ رہی تھی۔ براؤن نے یہ بھی بتایا کہ وہ جنگل کے کم و بیش سب جانوروں کی عادتوں سے واقف تھا۔

ہم شام کے چار بجے تک وادی میں گھومتے رہے۔ ایسے سہانے مناظر، اتنے پھیلاؤ میں فطرت کی اس گلکاری کے ساتھ میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھے تھے۔ وادی کی گھاس ایسی نرم تھی جیسے مخمل بچھا دی گئی ہو۔ آگے بڑھے تو کچھ چھوٹی جھیلیں بھی دیکھیں جن میں آبی گھوڑے اور دوسرے طرح طرح کے پرندے اور جانور بھی تھے۔ جو وہاں کے سوا شاید اور کہیں دیکھنے کو نہیں ملیں گے بیچ میں ہلکی سی بارش بھی ہوئی۔ ہم نے ایک ہوٹل میں رک کر کھانا بھی کھایا۔ اس کے بعد کا باقی وقت بھی وادی ہی میں گزارا اور شام ہوتے ہوتے واپس ہوٹل میں آ گئے۔

واپس آکر، ہاتھ منھ دھو کر چائے پی رہے تھے کہ ہوٹل میں ایک انگریز لڑکیوں کا پرا اترا۔ برٹش ایرویز کی میزبان لڑکیاں تھیں جنھیں عرف عام میں ایر ہوسٹس کہا جاتا ہے۔ براؤن اور جان ان میں سے اکثر لڑکیوں سے واقف تھے۔ دنیا بھر کے سیلانی اکثر یہاں آتے رہتے ہیں۔ براؤن نے ہم سب کا تعارف ان لڑکیوں سے کرایا۔ براؤن بڑا مسخرہ تھا، نہایت زندہ دل آدمی۔ میرا تعارف SOME BLOODY PRINCE OF INDIA کہہ کر کرایا۔ ہندوستان کے بارے میں کچھ ایسا تصور عام ہے یوروپ اور امریکہ کے لوگوں میں کہ وہاں یا ہاتھی، بہت ہیں یا شہزادے۔

براؤن نے میرا تعارف جن دو خواتین سے کرایا، ان میں ایک ماں تھی ایک بیٹی۔ ماں ابھی اترتی عمر کی خاتون تھیں اور بیٹی شباب کی آخری منزلوں میں تھیں۔ براؤن اور جان تو اپنی اپنی لڑکیوں کو لے کر کمرے میں چلے گئے۔ براؤن نے جاتے جاتے مجھ سے کہا، HELP YOURSELF اس کے جانے کے بعد میں نے ان دونوں خواتین کو اپنی میزبانی کا ثبوت بھی دینا چاہا اور

ان کے لیے بیئر منگائی۔ کچھ کھانے کو بھی منگایا۔ لڑکی مجھے اچھی بھی لگی تھی۔ اس سے بہت دیر تک ہندوستان کی تعریف کرتا رہا۔ اسے اپنا پتہ دیا اور اصرار کیا کہ تمھارا کبھی بمبئی جانا ہو تو آنا، بمبئی بھی بہت اچھا شہر ہے، بالکل انگلینڈ اور امریکہ کا مدّ مقابل۔ سرور کم آئے یا زیادہ آتا تو بیئر سے بھی ہے۔ ہم تھوڑے بے تکلف ہوگئے۔ اسے یہ بھی بتایا، میں بہت مشہور فلم اسکرپٹ رائٹر اور شاعر بھی ہوں۔ یہ جاننے کے بعد وہ میرے بارے میں باتیں کرنے لگیں۔ لڑکی کا نام لزلی تھا۔ میں نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر کہا "لزلی تم بہت پیاری لگ رہی ہو" وہ مسکرائی پھر کھڑی ہوگئی اور اپنے کمرے میں جاتے جاتے کہا "YOU GO WITH MAMA" مجھے بڑے زور کی ہنسی آگئی مگر میں نے دبالی اور والدہ محترمہ کا ہاتھ پکڑ کر انھیں ان کے کمرے کے دروازے پر لے جاکر یہ کہہ کر چھوڑ دیا "آپ بھی آرام کیجیے، رات بہت ہوگئی"۔ اور اپنے بستر پر لیٹ کر بہت دیر تک ہنستا رہا۔ ہنسی کا ایسا ہی ایک اور سبب تھا۔

میں بی۔ آر فلمز کی ایک فلم لکھ رہا تھا۔ اس فلم کے ڈائرکٹر رِیش راج چوپڑہ تھے۔ اس میں دو نئی ہیروئنیں تھیں۔ نئی ہیروئن ایک بنگالی لڑکی تھی فلم کی شوٹنگ دلی میں تھی۔ بی آر فلمز کے ساتھ میرا شروع ہی سے ایک زبانی سمجھوتہ تھا کہ جہاں بھی شوٹنگ ہوگی میں یونٹ کے ساتھ جاؤں گا۔ سین میں کسی ردّو بدل کی ضرورت ہوگی وہ بھی کروں گا اور آرٹسٹوں کو یہ بھی بتاؤں گا یہ مکالمہ کیسے ادا کرنا ہے۔ اس زبانی معاہدے سے بہت مرتبہ الجھنیں پیدا ہوئیں مگر فلم کے ڈائرکٹر نے میرا ساتھ دیا۔ الجھن کی تفصیل آگے کسی مناسب موقعے پر بیان کروں گا۔ فی الحال اس لطیفے سے نپٹ لوں جو اس فلم میں پیش آیا۔

یہ نئی بنگالی ہیروئن اچھی پڑھی لکھی لڑکی تھی اور اس بات سے بھی واقف تھی کہ میں کون ہوں اور کون کون سی فلمیں لکھی ہیں۔ شوٹنگ شاید اشوکا ہوٹل میں تھی۔ ہمارا قیام بھی اشوکا ہوٹل ہی میں تھا۔ اس لڑکی کا کمرہ میرے کمرے سے پہلے یا شاید بعد میں تھا۔ صبح کو جب شوٹنگ کے لیے نکلے تو اس نے پیچھے سے آکر بڑی بے تکلفی سے میرا ہاتھ پکڑ لیا "میں آپکے ساتھ چلوں" لہجے میں بنگالی پن تھا۔ میں نے کہا "ضرور چلو، مگر تمھارے لہجے سے احساس ہوتا ہے کہ تمھیں بہت محنت کرنی پڑے گی۔"

"کروں گی۔ جب ہی تو پہلے آپ کا ہاتھ پکڑا ہے"۔

"سمجھ دار تو لگتی ہو۔ تمھاری بنگالی فلمیں دیکھی ہیں میں نے"۔ غرض کمرے سے شوٹنگ اسپاٹ تک کا راستہ ہنستے ہنساتے گزرا۔ دن بھی اچھا گزرا۔ شوٹنگ بھی خاطر خواہ ہوئی۔ میں نے اسے جگہ جگہ ٹوکا "لہجے میں بنگالی پن ہے اس کا خیال رکھو۔ فن کار تم بہت اچھی ہو، بنگالی فلم میں بہت اچھی لگی تھیں"۔

"وہ میری زبان ہے۔ مگر کوئی بات نہیں، یہاں آپ ہیں"۔

میں دل میں یہ سوچ کر ہنسا کیسی ہوشیار لڑکی ہے، موقع محل دیکھ کر بات کرتی ہے۔

غرض شام ہوگئی۔ سب اپنے اپنے کمروں کی طرف چلے آئے۔ وہ واپس بھی میرے ساتھ ہی آئی۔ میرے کمرے کے پاس پہنچ کر اس نے بڑی محبت سے میرا ہاتھ دبایا۔ اور بولی "you with my ma" ہو۔ بعد میں وہ بڑی مقبول ہیروئن بن گئی تھی۔ اُس وقت بھی ایک دو فلموں میں ساتھ ہوا۔ اب اس میں بڑی سنجیدگی آگئی تھی۔ مگر اس انگریز ماما اور بنگالی ماما کا واقعہ ابھی تک میرے ذہن میں ہے۔ اور صبح کا وہ حسرت بھرا منظر بھی جہاں لڑکی اور لڑکی کی ماما کے پچھلی رات کے بیئر سے بھرے گلاس رکھے تھے اور اب ہمارے اٹھنے سے پہلے ہی برٹش ایرویز کا قافلہ اپنے مہمانوں اور میزبانوں کو لے کر اگلی اڑان پر جا چکا تھا ع

خوش باش کہ وقت ما خوش کردی

جب میں بیروت گیا تھا جانے کیوں پینی ترک کر دی تھی۔ روس میں بہت سخت سردی تھی، وہاں بھی نہیں پی۔ بمبئی واپس آنے کے کچھ دن بعد تک بھی ادھر دھیان نہیں گیا۔ ایک رات ایک محفل میں فیض کا ساتھ ہو گیا۔ وہ کسی کام سے بمبئی آئے ہوئے تھے محفل کے بعد کسی نے اپنے گھر مدعو کیا ہوا تھا۔ جب میں رخصت ہونے لگا تو بولے "آؤ ساتھ نہیں چلو گے" میں نے کہا۔

"وہاں پینا پلانا ہوگا اور میں آجکل پیتا نہیں"۔

بولے "آؤ تھوڑی دیر بیٹھ کر چلے جانا"۔

میں نے بھی عذر نہیں کیا۔ میرا ان کا بہت پرانا خاموشی کا رشتہ تھا۔ جب وہ فوج میں میجر تھے، میر درد روڈ پر رہتے تھے۔ اور میں علی گڑھ یونیورسٹی چلا گیا تھا۔ جب دلی آتا تھا

ان سے ضرور ملتا تھا اور ہم اکثر کناٹ پلیس پر خاموش ٹہلا کرتے تھے۔ نہ وہ کسی سے ادبی جھگڑا بازی کرتے تھے، نہ میں اس کا عادی تھا۔

ہم صبح کو ڈلہن لاج سے روانہ ہو کر ایک بجے کے قریب ڈوبٹو جھیل پہنچے، جہاں ہمیں رُکنا تھا۔ یہیں وہ کیمپ تھا جہاں ہمارے ٹھہرنے کا بندوبست کیا گیا تھا۔ سامان کیمپ میں رکھ دیا۔ اور ہم سرنگیٹی کا میدان دیکھنے کی نیت سے نکل گئے۔ میدان میں پہنچ کر دیکھا ہر طرف جانور ہی جانور ہیں۔ جس طرح جنگل میں بھیڑ بکریاں چرتی پھرتی ہیں، اس طرح یہاں شیر، چیتے ہرن اور بارہ سنگھے اور دوسرے جانور، جو ایک دوسرے کے دشمن سمجھے جاتے ہیں، ایک دوسرے سے بے خوف، اپنا پیٹ بھرنے میں لگے تھے۔ ہم نے شوق میں آکر گننے شروع کر دیے۔ ایک جگہ آٹھ شیر دکھائی دیے۔ ان کی تصویریں کھینچتے رہے۔ اس کے بعد ایک شیرنی دیکھی جو شکار کی ٹوہ میں تھی۔ کچھ دور اس کے دو بچے انتظار میں بیٹھے تھے۔ اس کے بعد جنگل اور دوسرے جانوروں کی تصویریں لیں۔ بعد میں دوپہر کا کھانا ڈوبٹو کیمپ میں کھایا اور سرونرا کیمپ چلے گئے۔ یہ جگہ ڈوبٹو کیمپ سے بھی اچھی لگی۔ رات کو وہیں ٹھہرے۔ اگلے روز پھر گردو نواح کی سیر کو نکل گئے۔ شیر کہیں دکھائی نہیں دیے۔ شام کو ایک گُلدار ملا۔ کیسے خوبصورت پھول تھے اس کے کوٹ پر۔ وہ ہمیں دیکھ کر کھڑا ہو گیا۔ ہم نے گاڑی روک کر اس کی بھی تصویر لی۔ سارا میدان پانی سے بھرا ہوا تھا۔ غنیمت ہے کہیں گاڑی نہیں پھنسی، ورنہ اسی طرح دھکا دینا پڑتا جس طرح انگورنگورو کریٹر کی جھیل میں دینا پڑا تھا۔ مجھے اچانک ایک امریکی فلم "ہٹاری" کا خیال آیا۔ فلم میں تو نہ کہیں پانی تھا، نہ گھاس۔ میں نے پوچھا تو پتہ چلا کہ جب یہاں گرمی پڑتی ہے تو جنگل کا ایک حصہ سوکھ جاتا ہے دوسری طرف ہرا رہتا ہے۔ اس موسم کو "ہجرت" کہتے ہیں۔ جنگل کے تمام جانور خشک علاقے سے سبز و شاداب علاقے کی طرف ہجرت کر جاتے ہیں۔ ہجرت کے اس منظر کو دیکھنے کے لیے لوگ دور دور سے آتے ہیں۔

یہاں کے بعد ہمیں اکوما جانا تھا مگر نہیں گئے۔ ہمیں بتایا گیا راستہ میں پڑنے والے دریاؤں میں پانی بھرا ہو گا اور وہ قابلِ اعتبار نہیں ہوتے۔ پانی کم زیادہ ہوتا رہتا ہے۔ پنچھی نے کہا اکوما اگست میں دیکھ لیں گے۔ اگست میں شوٹنگ کا پروگرام بنایا ہے۔ اکوما دیکھنے کے

شوق میں کامیڈی کہیں ٹریجڈی میں نہ بدل جائے۔ دریاؤں کا پانی بے اعتبار ہے آج کل۔

اکوما کے علاوہ شوٹنگ انگوردلی انگوردلی، سرنگیٹی، میتارجھیل، اور نیشنل پارک میں ہونے والی تھی۔ سرونیرا کیمپ سے ہم واپس اروشا آگئے۔ سرنگیٹی اور سرونرا میں جو دیکھا تھا وہ اور اس کی بہنائی ابھی تک ذہن میں گھوم رہی تھی۔ آکر نہائے پھر ناز ہوٹل میں جاکر کھانا کھایا۔ ان دنوں میں عام طور پر رات کا کھانا نہیں کھاتا تھا مگر منھ کا مزہ بدلنے کے لیے تھوڑے سے چاول شوربے سے کھا لیے۔ صبح اٹھ کر مرانگو جانا تھا جہاں سے کلے منجارو پہاڑ کی چوٹیاں نظر آتی تھیں پھر میلا کے لیے روانہ ہوگئے۔ راستے میں خیال آیا آج عیدالاضحیٰ ہے۔ پنچھی بولے آپ پہلے بتاتے تو آپ کو عید کی مبارکباد دیتے۔ اس پر ہم دونوں ہنسے اور اس طرح ہنستے ہنساتے میلا کے ڈاک بنگلہ پہنچ گئے۔ یہی وہ جگہ ہے جہاں امریکی فلم کی شوٹنگ ہوئی تھی۔ اس کے بعد ہمارا مرچیس آبشار دیکھنے کا ارادہ تھا مگر دلال گوہا پر واپسی کا بھوت سوار ہوگیا۔ بمبئی میں ان کی کسی دوسری فلم کی شوٹنگ تھی۔ مجبوراً اروشا آنا پڑا۔

وہاں آکر معلوم ہوا اس روز کوئی جہاز جانے والا نہیں تھا۔ اتفاق سے دارالسلام سے ایک جہاز آگیا۔ پنچھی نے وہ اور ایک اور جہاز جو پہلے سے ہوائی اڈے پر تھا دونوں چارٹر کرلیے اور ہم نیروبی آگئے۔ دلال گوہا ایسی جلدی میں تھے کہ ایک غلط جہاز میں سوار ہوگئے۔ جو ہانگ کانگ یا سنگاپور جارہا تھا۔ ہم ان کے لیے ادھر پریشان ہوتے رہے کہ وہ کہاں غائب ہوگئے۔ جب اس جہاز کے روانہ ہونے کا اعلان ہوا تب اتر کے بھاگے اور اسی بھاگ دوڑ میں ہم بمبئی پہنچ گئے۔

کہانی کا خاکہ میں نے پنچھی کو وہیں افریقہ میں سنا دیا تھا۔ واپس آکر منظرنامہ بھی ان کے حوالے کردیا۔ پھر کیا ہوا مجھے نہیں معلوم ہوا۔ شاید فلم بننے کی نوبت ہی نہیں آئی۔ کچھ ایسا ہوا کہ پنچھی کی دھرم اندر کی بہن سے شادی ہوگئی اور تھوڑے دن بعد اس لڑکی کا انتقال ہوگیا۔ اس بیچ میرے پاس ایک اور صاحب آئے۔ نام جیمل سنگھ تھا۔ ان سے کچھ برس پہلے پہچان ہوئی تھی ایک فلم بنانا چاہتے تھے "نیلی آنکھیں" وہ مجھ سے لکھوائی تھی۔ اس وقت سے ان سے جان پہچان تھی۔ کبھی کبھی مل جاتے تھے۔ بڑے ہنسوڑ اور زندہ دل قسم

کے آدمی تھے۔ شراب خوب پیٹ بھر کے پیتے تھے اور ایک کے بعد ایک ابلے ہوئے انڈے کھائے جاتے تھے۔ میں ان کے صرف اسی ردیف سے واقف تھا۔ بہت دن بعد ایک روز آئے۔ شراب ساتھ لائے اور بہت دیر تک بیٹھے پیتے اور لطیفہ بازی کرتے رہے جاتے وقت مشورہ دیا کہ میں ڈائرکٹر بن جاؤں یا فلم ڈائریکٹ کرنے کا وعدہ کروں تو وہ فلم بنانے کے لیے تیار ہیں۔

فلم کی زندگی میں ڈائرکٹر کا بڑا اہم مقام ہے مگر شاعری کے علاوہ میں کسی دوسرے شعبے میں سنجیدگی سے الجھنا نہیں چاہتا تھا۔ ڈائرکٹر بننے کی پیش کش مجھے اس سے پہلے بھی کئی بار ہوئی تھی۔ بی آر فلمز ہی میں پروڈکشن کنٹرولر سی وی کے شاستری نے مجھے اپنی ایک فلم کی ڈائرکشن کے لیے کہا تھا مگر میں نہیں مانا تھا۔ جس پر وہ مجھ سے ناراض بھی ہو گئے تھے۔ ان کے علاوہ اور کئی ایجنٹوں نے مجھے ڈائرکٹر بننے کی ترغیب دی تھی۔ جب پونا سے بمبئی آیا تھا۔ تو شاعر ہونے کے ناطے لوگوں نے گانوں کی فرمائش کی تھی۔ میں نے گانے بھی نہیں لکھے۔ شاعری صرف شاعری کے لیے الگ رکھی تھی۔ ایسی شاعری جو مجھے پسند ہو۔ مگر جمیل سنگھ کے جھانسے میں آگیا اور اس کے لیے ایک فلم بنائی جس کا نام پہلے "درد" رکھا پھر جمیل سنگھ کے اصرار پر بدل کر "لہو پکارے گا" کر دیا۔ اس فلم کا انجام کیا ہوا، نہ پوچھیں تو بہتر ہے جمیل سنگھ زندہ ہوتے تو مجھے الزام دیتے، میں انھیں کوس رہا ہوں فلم بہت اچھی بنی تھی مگر جمیل سنگھ کی نیت میں کھوٹ تھا۔ لہو پکارے گا، جب آدھی کے قریب ہو گئی اور فلم کے خریداروں کو دیکھ کر پسند آئی تو جمیل سنگھ نے اصرار کرنا شروع کر دیا کہ فلم کی جو شوٹنگ باقی رہ گئی ہے۔ اسے پورا کرنے سے پہلے میں فلم کا انجام قلم بند کر دوں۔ پہلے میں نے انکار کیا اور اس پر اصرار کیا کہ باقی فلم بھی پوری ہو جانی چاہیے۔ مگر جمیل سنگھ نے جب زیادہ ضد کی تو میں نے خواہش کے مطابق انجام بھی پورا کر دیا۔ مجھے یہ شبہ کبھی نہیں ہوا تھا کہ جمیل سنگھ میرے ساتھ کوئی مکاری کرے گا۔ پھر میں نے اپنے فلم کے ایڈیٹر کو یہ ہدایت کر دی تھی کہ میری مرضی کے بغیر فلم ایڈیٹنگ روم سے باہر نہ جائے اور ایڈیٹر پران مہرہ نے اس کا پورا خیال رکھا مگر دل کا دورہ پڑنے سے پران مہرہ کا اچانک انتقال ہو گیا۔ میں اس وقت بمبئی سے باہر گیا ہوا تھا۔ جمیل سنگھ نے فلم اس جگہ سے نکال لی اور میرے واپس آنے سے

پہلے اس میں جو ایڈیٹنگ کا کام تھا وہ کسی دوسرے ایڈیٹر سے پورا کرا کے فلم نمائش کے لیے دے دی۔ وہ فلم پوری تو ہوئی نہیں تھی ادھوری تھی، لوگوں کی سمجھ میں نہیں آئی۔ نتیجہ یہ کہ فیل ہوگئی۔ مگر اس میں جیل سنگھ کو تیس چالیس لاکھ روپے کا فائدہ ہوگیا۔ اور دلّی جاکر بیٹھ گیا۔ میں واپس آیا تو حقیقت جان کر بڑا دکھ ہوا۔ مگر باز پرس کس سے کرتا۔ انھیں دنوں لکھنے کے لیے دو فلمیں مل گئیں "چاندی سونا" اور "اپرادھ" پہلی فلم سنجے خان کی تھی دوسری ان کے بھائی فیروز خان کی۔ "چاندی سونا" ماریشس میں بنی اور "اپرادھ" جرمنی میں۔ اس تبدیلی آب و ہوا سے میرے ذہن پر اچھا اثر پڑا۔ اور میں تھوڑی دیر کے لیے جیل سنگھ کی زیادتیوں کو بھول گیا

ماریشس اچھی خوبصورت جگہ ہے مگر اس کی کوئی تفصیل میرے ذہن میں نہیں رہی سوا اس کے کہ ماریشس کے ساحل بہت خوبصورت ہیں۔ اور وہ لوگ جو بہار سے لے جاکر وہاں بسائے گئے تھے۔ بہاری بھوجپوری زبان کے ساتھ ساتھ فرانسیسی بھی بولتے ہیں۔ اس لیے کہ یہ جزیرہ فرانسیسیوں کے قبضہ میں رہا تھا۔ جب فرانسیسیوں نے ماریشس پر قبضہ کیا۔ اس وقت اس جزیرہ میں ایک پرندہ بڑی کثرت سے پایا جاتا تھا جس کا نام ڈوڈو تھا۔ وہ بہت اڑ نہیں پاتا تھا۔ کچھ ہی مدت بعد وہ پرندہ دنیا سے ناپید ہوگیا۔ جزیرے کے باشندے پکڑ پکڑ کر کھا گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

جرمنی میں فیروز خان کی شوٹنگ میں اچھا وقت گزرا۔ شوٹنگ تو جرمنی کے مختلف شہروں اور جگہوں پر تھی۔ جیسے نیورن برگ اور فرینک فرٹ۔ ایک دو جگہیں اور تھیں جن کا نام اس وقت ذہن سے نکل گیا۔ فرینک فرٹ سے کوئی تیس چالیس میل دور ایک قصبہ ہے جس کا نام مائنز ہے رہنے کا بندوبست وہاں کیا گیا تھا۔ نیورن برگ موٹر کی دوڑ کے لیے بہت مشہور ہے۔ فیروز کی فلم میں ایک موٹروں کی دوڑ کا مقابلہ تھا۔ وہ منظر وہاں فلمایا گیا۔ شوٹنگ کے بعد ہم مائنز آجاتے تھے یوروپ کے کسی ملک میں بھی جائیں کھانے کا مسئلہ ضرور درپیش ہوتا ہے۔ مائنز میں بھی تھا۔ میرے ساتھ دو مشکلیں تھیں یا ہیں۔ میں سور کبھی نہیں کھاتا اور بڑے کے گوشت سے بھی پرہیز کرتا ہوں۔ اور یوروپ اور دوسرے ملکوں میں یہی گوشت زیادہ کھائے جاتے ہیں۔ مچھلی مرغ بھی زیادہ پسند نہیں۔ مگر کتنا ہی بچاؤ کر لیجیے آخر میں یہی پتہ چلتا ہے کہ جو رات کھایا تھا یا ایک

دن پہلے نوش جان فرمایا تھا' وہ بڑے کا گوشت تھا یا دوسرے کسی ناپسند جانور کا۔

میں ایک مہینہ کے قریب اس علاقے میں رہا۔ مائنز میں بہت جرمن لڑکے لڑکیوں سے اچھا ملنا ہوگیا۔ شوٹنگ میں آسانی کے لیے فیروز نے مقامی کالج اور یونیورسٹی کے لڑکے ملازم رکھ لیے تھے۔ جب نیورن برگ فرینک فرٹ اور مضافات کا کام ختم ہوگیا تو برلن چلا گیا۔ یہی میرا اور فیروز خان کا معاہدہ تھا۔ اپنی یونٹ سے رخصت کے بعد جب میں جرمن یونٹ سے ملا اور رخصت چاہی تو ساتھ ہی یہ بھی کہا میں برلن جارہا ہوں۔ ان لڑکوں میں سے ایک لڑکے کی خالہ برلن میں رہتی اور وہاں ایک مسافر خانہ چلاتی تھی۔ اس نے اپنی خالہ کا پتہ دیا اور ایک خط خالہ کے نام لکھا۔ میں برلن کے ہوائی اڈہ پر اتر کر پتہ پوچھتا ہوا سیدھا وہیں گیا۔ وہ ایک بزرگ خاتون تھیں۔ مہربان اور کم گو فطرت کی۔ انھوں نے ہر طرح میرا خیال بھی رکھا اور برلن کی سیر کیسے کرنی ہے' وہ بھی بتایا۔ میں نے مشرقی اور مغربی برلن بڑی تفصیل سے دیکھے اور وہ دیوار بھی جس نے جرمنی کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا تھا اور جو اس وقت تھی ' اب نہیں ہے۔

وہ حصہ جو روس کے قبضے میں چلا گیا تھا اور لڑائی میں برباد ہوگیا تھا' از سر نو تعمیر ہوا تھا اور بالکل ویسا ہی بنایا گیا تھا جیسا منہدم ہونے سے پہلے تھا۔ اس میں تمام وہی پتھر اور اور وہی مسالا اور مواد استعمال کیا گیا تھا جو اصل عمارت میں لگا ہوا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یہاں کبھی کوئی لڑائی ہوئی ہی نہیں تھی۔ مغربی برلن کم و بیش ویسا ہی تھا۔ جیسا لڑائی سے پہلے ہوگا۔ کچھ دن برلن میں گزار کر میں جنیوا چلا گیا۔ جنیوا میں رہنے کا میں نے پہلے سے کوئی بندوبست نہیں نہیں کیا تھا۔ بس تن بہ تقدیر جنیوا کے ہوائی اڈے پر پہنچ گیا اور جہاز سے اتر کر ایک ٹیکسی ڈرائیور سے کہا مجھے کسی درمیانی درجہ کے ہوٹل میں لے چلے۔ ہر جگہ ہر ہوٹل میں میرا استقبال خندہ پیشانی سے ہوتا تھا۔ اس لیے کہ میرے پاسپورٹ میں پیشے کے خانہ میں " شاعر" درج تھا جنیوا کے ہوٹل کی مالک دو تین لڑکیاں تھیں۔ شاید بہنیں۔ انھوں نے مجھے ایک اچھا سا کمرہ دیا اور جنیوا کی سیر میں مدد کی۔ جنیوا سے کئی ملکوں کی سرحدیں ملتی ہیں۔ غالباً روم' جرمنی اور فرانس کی مگر ان سرحدوں کو پار کرنے میں کہیں کوئی قباحت نہیں ہوئی۔ اور بہت سی جگہوں اور مکانوں کے

ساتھ نپولین کی محبوبہ "جوزے فین" کا مکان بھی دیکھا۔ اپنے ماضی اور اس کی تاریخ کو سنبھال کر رکھنے کا یورپ اور امریکہ کے لوگوں کو بڑا سلیقہ ہے۔ جوزے فین کی رہائش گاہ میں داخل ہو کر احساس ہوا جیسے وہ ابھی ابھی اٹھ کر گئی ہے۔ وہاں اتنا کچھ دیکھا مگر اب کوئی تفصیل یاد نہیں رہی۔

ہوٹل کے کاؤنٹر پر ایک روز ہوٹل کی میزبان یا ہوسٹس نے ایک صاحب سے ان لفظوں میں میرا تعارف کرایا۔ "اپنے دشمن سے ملیے۔"

وہ پرتگال کا رہنے والا تھا۔ اس نے میری طرف ہنستے ہوئے ہاتھ بڑھا کر کہا:

"دشمن نہیں، میں بھی دوست ہوں۔"

وہیں کاؤنٹر پر ایک روز دو ہندوستانی ملے۔ ادھر اُدھر کی سیر کرتے ہوئے جنیوا بھی آئے تھے۔ مجھ سے مل کر انھوں نے پہلے یہ پوچھا کہ میں ہندوستانی ہوں یا کسی اور جگہ کا باشندہ۔

"ہندوستانی" میرا جواب تھا۔

پھر پوچھا، میں کھانا کہاں کھاتا ہوں۔

"سامنے کے ہوٹل میں۔"

وہ ایک چینی ریستوراں تھا۔ میں کھانا کھانے ہی جا رہا تھا۔ وہ میرے ساتھ آ گئے۔ انھوں نے بتایا وہ صرف سبزی خور ہیں۔ میں نے ہوٹل کے بیرے سے کہا ان کے لیے کوئی ایسا کھانا لاؤ جس میں صرف سبزی ہو۔ ہوٹل کا مالک بڑا خوش طبع سا آدمی تھا۔ میں نے یہی بات اس سے بھی کہہ دی تھی۔ اس نے تھوڑی دیر بعد ان کے لیے مٹر پلاؤ بھیجا مگر اس میں چھوٹے چھوٹے گوشت کے ٹکڑے بھی تھے۔ میں نے وہ پلاؤ واپس کر دیا۔ مٹر پلاؤ کی جو دوسری پلیٹ آئی اس میں انڈے کے ٹکڑے تھے۔ انھوں نے وہ بھی واپس کر دی اور ویٹر سے کہا صرف مٹر کے چاول لاؤ۔ ہوٹل کے مالک نے پریشان ہو کر کہا:

"تو کیا انھیں گھاس کھلا دوں۔"

جنیوا بہت خوبصورت اور دل لبھانے والی جگہ تھی، مگر اس خوبصورتی میں فطرت سے

زیادہ انسان کا ہاتھ تھا۔ بہت بار لوگوں کو کشمیر اور سوئزرلینڈ کا مقابلہ کرتے سنا تھا اور انھوں نے سوئزرلینڈ کو فوقیت دی تھی مگر جنیوا آکر ایسا محسوس ہوا یہ خوبصورت ضرور ہے مگر اس کے پیڑوں اور ہوا میں وہ خوشبو نہیں جو کشمیر کے برگ و بار میں ہے۔ وہ رومان نہیں تھا جو کشمیر کے مناظر میں تھا۔ جنیوا میں کشمیر کا خیال آیا تو ایک شدید احساس زیاں کا بھی احساس ہوا۔ کتنے لوگ تھے جو ایک بہت بڑے خسارے کی طرح میری یاد سے لپٹے ہوئے ہیں۔ جن کے گھروں میں جاکر میں مکئی کی روٹی اور کرم کا ساگ بنواتا تھا۔ کشمیری کھانوں کی فرمائش کرتا تھا۔ ایک بار ایک مشاعرہ میں جاکر کشمیر میری زندگی کا حصہ بن گیا تھا۔ جنیوا میں جنیوا کا سب تھا، کشمیر کا کچھ نہیں تھا۔ نہ نشاط باغ، نہ پہلگام، نہ گل مرگ، نہ جھیل کے مناظر اور شکارے اور نہ وہ ہوا اور فضا۔

میرا اگلا پڑاؤ روم تھا۔ دو تین دن اور جنیوا میں ٹھہر کر روم چلا گیا۔ روم اپنے عروج کے زمانے میں بہت بڑا تہذیب اور ثقافت کا مرکز رہا تھا۔ جہاں تک آب و ہوا کا تعلق تھا تھوڑی بہت ہمارے ملک کی آب و ہوا سے بھی مماثلت تھی مگر میرے لیے آب و ہوا سے زیادہ اس کے ماضی کی تاریخ زیادہ اہم تھی۔ میں نے دو تین دن رک کر اس کی تاریخی عمارتیں دیکھیں بازاروں میں گھومتا رہا۔ شام کو کسی بار یا کیفے کے برآمدے میں بیٹھ کر شام کا منظر دیکھتا رہا۔ ایک روز ایک کیفے کے برآمدے میں بیٹھا تھا کہ کچھ مراکو کے لڑکے آگئے۔ کالجوں کے طالب علم تھے۔ کچھ انقلابی قسم کے۔ اکیلا دیکھ کر مجھ سے باتیں کرنے لگے۔ جب معلوم ہوا میں ہندوستان سے آیا ہوں تو بے تکلف ہو گئے۔

"آیئے آپ کو روم کی سیر کرائیں" ایک لڑکے نے بے تکلفی سے کہا۔ میں ساتھ ہو لیا اور اِدھر اُدھر گھومتے ہوئے وہ مجھے ایک جگہ لے گئے جہاں بہت سی مختلف عمروں کی لڑکیاں تھیں۔ شاید وہ لڑکے اکثر وہاں آتے رہتے ہوں گے۔ ایک چھریرے بدن کی سانولی سی رومی لڑکی تھی۔ اس نے میرا نام پوچھا اور مجھے خوش کرنے کے لیے میرے نام کی گردان شروع کر دی۔ اس کی اس حرکت سے مجھے بڑی الجھن ہوئی اور میں بہانہ کر کے وہاں سے نکل آیا۔ عورت کو کسی ناگوار ماحول میں دیکھ کر مجھے بڑا افسوس اور تکلیف ہوتی ہے۔

بہت دن کی بات ہے۔ ایک روز عصمت چغتائی کا ٹیلیفون آیا۔

"اختر! عورت کے بارے میں تمھاری کیا رائے ہے؟" وہ شاید اس موضوع پر کچھ لکھ رہی تھیں۔ میں نے کہا "زندگی میں توازن پیدا کرتی ہے۔"

مگر رائے اپنی جگہ پر ہے اور زندگی میں عورت کے ساتھ برتاؤ الگ چیز ہے۔ مرد اور عورت کو ایک ساتھ رہتے ہوئے قرنہائے قرن گزر گئے مگر کبھی وہ خود بیچارگی کا شکار ہوتی ہے کبھی آدمی اس کے ہاتھوں بے چارگی کا شکار ہے۔ سماج اور معاشرہ میں ایک دوسرے کی ٹھیک جگہ کیا ہے، ابھی تک اس کا تعین نہیں ہوا۔ ایک دوروز زرروم میں رہ کر بمبئی واپس آگیا۔

کہنے کو گھوم گھام کر واپس تو آگیا مگر سفر ختم نہیں ہوا۔ کچھ دن بعد پھر جنوبی ہند کی طرف نکل گیا۔ کچھ فلم کی شوٹنگ کے سلسلے میں، کچھ مشاعرے میں شرکت کی غرض سے جنوبی ہند میں بننے والی دو فلمیں میرے پاس تھیں۔ ایک "آنند بھون" دوسری "آدمی"۔ آنند بھون کے لیے اوٹی اور کوڈے کینال گیا، اور آدمی کے لیے مدراس اور کوڈے کینال۔ قاضی سلیم کی دعوت پر اورنگ آباد بھی گیا۔ اور دوسری بار ایلورا، اجنتا دیکھے۔ اس سفر میں سلطانہ بھی میرے ساتھ تھیں۔ اسی سفر میں اجنتا جاتے ہوئے شفیق فاطمہ شعریٰ کا بھی ساتھ ہوگیا۔ شعریٰ کم گو سی ہیں مگر بات کرتی ہیں تو اچھی لگتی ہیں۔ ان کی شاعری رسائل اور کتابوں میں پڑھ چکا تھا۔ مگر آرام سے بیٹھ کر بات کرنے کا اتفاق اب ہوا تھا۔

مشاعرے کی اہمیت میری نظر میں ادبی کبھی نہیں رہی تھی، خوش فکر لوگوں کے وقت گزارنے کا ایک طریقہ تھا مگر جب شاعری رسائل اور کتابوں میں چھپی تو بلانے کا سلسلہ بھی شروع ہوا۔ اکثر جگہ تو میں انکار ہی کر دیتا تھا۔ اور اب تک بھی یہی رویہ ہے۔ اس لیے کہ آج کی شاعری اگر توجہ سے اچھی طرح پڑھی نہ گئی ہو تو سننے سے سمجھ میں نہیں آتی۔ مگر دکن میں نئے لکھنے والوں میں کچھ ایسے نوجوان آگئے تھے جو شاعری کے بدلتے ہوئے انداز کو سراہتے لگے تھے مرکزی شہر حیدرآباد تھا۔ جن دنوں میں علی گڑھ یونیورسٹی میں زیر تعلیم تھا انھیں دنوں سے میرا حیدرآباد آنا جانا تھا۔ یہ نظام دکن کی حکومت کا زمانہ تھا۔ ان کی سواری نکلتی تھی تو شہر کے راستے بند ہو جاتے تھے اور جب تک سواری نکل نہ جائے بند رہتے تھے۔ حیدرآباد شہر مجھے بہت پسند آیا تھا۔ بہت کھلا کھلا، چوڑی چوڑی سڑکیں، دکنی زبان، باشندوں کا دعا سلام کا طریقہ، بیٹھنے

اٹھنے کے آداب، ڈھنگ اور ڈھب مجھے اچھا لگا تھا۔

ایک زمانے میں ادب کے دو بڑے مرکز تھے۔ لکھنؤ اور دلّی۔ بعد میں تیسرا مرکز لاہور بن گیا تھا۔ مگر آہستہ آہستہ حیدرآباد نے چوتھے مرکز کی شکل اختیار کرلی تھی۔ نظام دکن خود بھی طبع آزمائی کرتے تھے۔ باقاعدہ ان کے اساتذہ مقرر تھے۔ ایک زمانے میں فانیؔ اور اس کے بعد جوشؔ بھی رہے۔ جب شاعری کے پرانے چلن اور مزاج میں تبدیلی آئی تو مجھے بھی حیدرآباد کے مشاعروں میں بلایا گیا۔ اور بہت سے نئے پرانے شعراء سے ملاقات ہوئی جیسے شاہد صدیقی مخدوم محی الدین، سلیمان اریب، شاذ تمکنت، عزیز قیسی، وحید اختر، بشر نواز، راشد آذر ان کے علاوہ اور بہت سے نام ہیں جو اس وقت ذہن میں نہیں۔ یہاں مجھے ان شعراء کی نجی زندگی کا بہت ذکر نہیں کرنا ہے۔ البتہ جو مجھ سے زیادہ قریب ہوئے جیسے شاہد صدیقی، شاذ تمکنت سلیمان اریب، عزیز قیسی، راشد آذر اور وحید اختر۔ ان کے بارے میں کچھ چلتے چلاتے کہنا ہے۔ وحید اختر تعلیم سے فارغ ہوکر علی گڑھ یونیورسٹی چلے گئے۔ اب وہاں فلسفہ پڑھاتے ہیں۔ ان کی شادی ایک ایرانی لڑکی سے ہوئی تھی۔ جو شادی کے ایک زمانے بعد ایران جاتے ہوئے ہوائی حادثے کا شکار ہوگئی۔ شاذ تمکنت فلم کے گانے لکھنا چاہتے تھے۔ مگر میں نے اصرار کیا۔ پہلے تعلیم پوری کرلو۔ انھیں کچھ مالی مشکلات پیش آگئی تھیں۔ مگر جوں توں کرکے ایم اے کرہی لیا۔ اور ایک کالج میں اردو کے استاد ہوگئے۔ اب وہ بھی حیات نہیں۔ کثرت شراب نوشی کی نذر ہوگئے۔ عزیز قیسی فلموں کے لیے لکھنے لگے تھے۔ کینسر کے مرض سے ان کا بھی انتقال ہوگیا۔ مخدوم محی الدین اور شاہد صدیقی بھی اللہ کو پیارے ہوگئے۔ شاہد اور مخدوم دونوں بہت زندہ دل انسان تھے۔ اریبؔ بھی کثرت شراب نوشی کی نذر ہوگئے۔

یہ دراصل میرا پورے دکن ہی کا سفر تھا۔ اوٹی سے واپسی میں بیدل کے راستے آیا۔ ایک فلم کے گروہ کے ساتھ تھا۔ انھیں راستے میں کچھ مناظر کی شوٹنگ کرنی تھی۔ اس ضمن میں میسور اور بنگلور سے بھی گزرنا ہوا اور وہاں کے ادیبوں اور شاعروں سے بھی ملاقات ہوئی۔ زیادہ تر لکھنے والے بنگلور میں تھے۔ صمد شاہین اور ممتاز شیریں سے ملا۔

محمود ایاز سے بھی وہیں تعارف ہوا۔ عزیز اللہ بیگ اور خلیل مامون سے اب ملاقات ہوئی ہے۔ میرا پچھلے دنوں کئی بار بنگلور جانا ہوا تھا۔

باب ۱۵

یہ خودنوشت جو آباد خرابے کے عنوان سے لکھی گئی ہے اس کا نام "چلتے چلاتے" آپ بیتی" ایک جہاں گرد کی کہانی" یا کچھ اور بھی ہو سکتا تھا مگر محمود ایاز نے سوغات کے اجرا رکے لیے کچھ چھاپنے کو مانگا تو میں نے نثر کے کچھ صفحات دے دیئے جسے انھوں نے "اس آباد خرابے میں" کا نام دیا۔ یہ انھوں نے میری ایک نظم " یادیں" کے ایک مصرعہ سے لیا۔ ع

دیکھو ہم نے کیسے بسر کی اس آباد خرابے میں

اس کتاب کا لکھا جانا بھی ایک کہانی ہے۔ اب تو میں " ڈائیلیس " کے سبب تھوڑا مجبور ہوں۔ چلنا پھرنا محدود ہو گیا مگر پہلے کافی اِدھر اُدھر جاتا تھا اور ادبی ہنگاموں اور جلسوں، مشاعروں میں شریک ہوتا تھا۔ ایک نشست میں شہریار نے کسی بات پہ کہا :
"اختر بھائی اپنی سوانح کیوں نہیں لکھتے آپ" بہت دن بعد کہیں ایک اور ایسا اجتماع تھا کہ وارث علوی نے یہی بات دہرائی۔ بنگلور جانا ہوا تو محمود ایاز نے اسی طرح کی بات کی۔ ایک بار کچھ لکھنے کی رو آئی تو میں نے قلم برداشتہ کچھ نثر کے صفحات لکھے۔ پھر یہ سوچ کر قلم روک لیا، سرگزشت تو اہم لوگوں کی ہوتی ہے"میرا ایک مصرع ہے

زندگی بھیک ہے جو جبرِ مشیت سے ملی

بھکاری کی سرگزشت کیا۔ ایک شاعری ہے جس میں عمر کھپا دی۔ معلوم نہیں اس کا بھی کیا حشر ہوتا ہے۔

اپنی پیدائش کے سلسلے میں کہیں قلعہ پتھر گڑھ کا ذکر کیا ہے میں نے۔ اب تو یہ ایک بے نام سی بستی ہے۔ منہدم قلعہ پر آثار قدیمہ کا بورڈ لگا ہے مگر میری پیدائش سے کافی پہلے یہ بڑی سیاسی اور فوجی سرگرمیوں کا گڑھ تھا۔ نجیب خاں ایک روہیلا پٹھان تھا بہت

زیرک اور بہادر۔ کہیں افغانستان کی طرف سے آیا تھا۔ یہ اس کے توڑ جوڑ کا نتیجہ تھا کہ احمد شاہ ابدالی نے دلی پر حملہ کا ارادہ ترک کرکے پانی پت کے میدان میں مراٹھوں سے ٹکرایا اور ان کا زور ختم کردیا۔ نجیب خاں ہندوستان کی تاریخ میں نجیب الدولہ کے نام سے جانا جاتا ہے۔ ۱۷۵۵ء قلعہ پتھر گڑھ اسی نے بنوایا تھا۔ نجیب آباد شہر بھی اسی نے آباد کیا تھا۔ انگریز نجیب الدولہ سے بہت خائف تھے۔ اس پر پے در پے حملے کرائے گئے جھینک راؤ سندھیا اور ملہار راؤ مراٹھے نے چانڈی کے متصل گنگو مکھیہ گھاٹ سے اتر کر قلعہ پتھر گڑھ اور نجیب آباد پر حملہ کیا۔ قلعہ پر توپیں چلائیں اور نجیب آباد کو لوٹا۔ شاہ عالم کے وقت میں نجف خاں سندھیا اور تکوجی مراٹھے نے نجیب الدولہ کے بیٹے ضابطہ خاں پر چڑھائی کی۔ قلعہ پتھر گڑھ اور نجیب آباد کو برباد کیا۔ ۱۷۷۴ء میں شجاع الدولہ نے اس قلعہ کو اپنے قبضہ میں لے لیا۔ ۱۸۰۱ء میں یہ جگہ انگریزوں کے قبضہ میں آگئی۔ یادگار کے طور پر اب یہاں نجیب الدولہ کے بھائی جلال الدین کا مقبرہ ہے۔ نوبت خانے کے کھنڈرات میں نواب معین الدین کا لگایا ہوا باغ ہے۔ مبارک بنیاد کے نام سے ایک عمارت ہے۔ جس روز جلال الدین کے بھائی کے یہاں بیٹا پیدا ہوا تھا اسی دن اس عمارت کی بنیاد رکھی گئی تھی۔ یہاں اور کچھ عمارتیں اور مسجدیں ہیں جو گزرے وقت کی یاد دلاتی ہیں۔ یہاں ۱۸۶۶ء میں پہلی میونسپلٹی قائم ہوئی تھی۔ یہ سارا علاقہ بجنور کے ضلع میں شامل ہے بجنور اور نجیب آباد کے درمیان غالباً پچیس تیس میل کا فاصلہ ہے۔ بجنور کا سلسلہ مؤرخین راجہ چندر گپت سے جوڑتے ہیں۔ یہ ان کی قلمرو میں شامل تھا۔ راجہ بھرت جن کے نام پر ہندوستان کا نام بھارت پڑا ان کی ماں کیکئی بجنور ہی کی رہنے والی تھیں ــــــــــــــــــ

ــــــــــــــــــ اس علاقہ میں جو تاریخ کی دست برد سے بچ گیا وہ میرے بچپن کی یادوں میں شامل ہے۔

ادب اور قلم کے اعتبار سے میرے لیے ۱۹۶۰ء سے ۱۹۸۵ء کا دور بہت اہم ہے اس دوران میں نے کئی شعری مجموعے شائع کیے "یادیں" ۱۹۶۰ء میں چھپی تھی اس پر مجھے ساہتیہ اکادمی کا انعام ملا۔ میری پہلی کتاب "گرداب" ۱۹۴۲ء میں دلی میں چھپی تھی۔ ساقی بکڈپو نے شائع کی تھی۔ اس کے بعد تھوڑے تھوڑے وقفے سے "تاریک سیارہ" اور "آب جو" چھپیں۔ یہ دونوں

کتابیں مکتبہ اردو لاہور اور مکتبہ جدید نے چھاپی تھیں۔ اس کے بعد "سب رنگ" "یا دیں" "بنت لمحات" "نیا آہنگ" "سرو سامان" اور "زمین زمین" شائع ہوئیں۔ ان سب ہی کتابوں پر کسی نہ کسی اردو اکادمی اور ادبی اکادمی نے انعامات دیے جن میں اردو اکادمی لکھنؤ، میرا کادمی لکھنؤ، غالب اکادمی دہلی، اردو اکادمی دہلی شامل ہیں۔ ان کے علاوہ مہاراشٹر اردو اکادمی اور مدھیہ پردیش اردو اکادمی نے بھی مجھے انعامات سے نوازا۔ مدھیہ پردیش ہی نے مجھے "سرو سامان" پر اقبال سمان سے سرفراز کیا جو ایک لاکھ روپے کا تھا۔ مہاراشٹر کی حکومت نے بھی مجھے اسٹیٹ ایوارڈ دیا۔ جو ایک لاکھ روپے کا تھا۔

میری شعری زندگی کا آغاز میری کالج کی زندگی کے آخری سالوں میں ہوا۔ میں کالج کی زندگی کا بھرپور ذکر پچھلے کسی باب میں کر چکا ہوں مگر ایک واقعہ ایسا ہے جسے میں یہاں ضرور بیان کروں گا۔ میں اپنے زمانے کا ابھرتا ہوا شاعر اور بہترین مقرر مشہور تھا۔ میں تقریریں لکھ کر اور رٹ کر نہیں بولتا تھا فی البدیہہ بولتا تھا۔ مقابلہ شروع ہونے سے پہلے صدر سے درخواست کرتا تھا مجھے شروع میں نہ بلائیں۔ دو چار مقرروں کے بعد بلائیں۔ میں ان مقرروں کو سن کر اپنی تقریر ذہن میں تیار کر لیتا تھا اور دھواں دار بولتا تھا۔ اس زمانہ کا ایسا کوئی کالج میرے ذہن میں نہیں جہاں سے مجھے پہلا انعام اور اکثر ٹرافی بھی نہ ملی ہو۔ لکھنؤ یونیورسٹی، علی گڑھ یونیورسٹی، اس لیے کہ ان دنوں میں اینگلو عربک کالج میں پڑھتا تھا۔ کانپور کالج، لاہور گورنمنٹ کالج، دلی ہندو کالج اور لا کالج دلی۔ غرض ایسی کوئی جگہ نہیں تھی جہاں سے مجھے پہلا انعام نہ ملا ہو۔ آگرہ یونیورسٹی میں مجھے جب تھرڈ پرائز ملا میں نے یہ کہہ کر واپس کر دیا، "آپ تقریر کے فن سے واقف نہیں۔ یہ کسی ضرورت مند کو دے دیجیے۔"

میری ایک نظم تھی جس کا عنوان مجھے یاد نہیں رہا اس کا ایک مصرعہ تھا جو تھوڑی تھوڑی دیر سے نظم میں دہرایا جاتا تھا۔ ع

سچ بتا کیا زندگی سے بھاگ کر آیا ہے تو

یہ نظم میرے مجموعے میں کہیں شامل نہیں۔ وہ نظم میں نے چھپنے کے لیے ادبی دنیا میں بھیجی۔ میرا جی اس کے ایڈیٹر تھے۔ خاص طور پر نظم کے۔ وہ نظم انھوں نے واپس کر دی اور ایک چھوٹی سی تحریر اس کے ساتھ نتھی کر دی۔

"جس عالم میں آپ نے یہ نظم کہی ہے اس عالم میں اس پر نظرثانی کیجیے۔"

انھیں دنوں میرے کالج کا سالانہ جلسہ تھا جس میں ہندوستان کے ان تمام کالجوں سے لڑکے آئے تھے جہاں جہاں میں جاتا تھا۔ کالج کے اس جلسہ میں لیڈی ہارڈنگ کالج اروین کالج کی لڑکیاں بھی بہت تعداد میں شریک ہوئی تھیں اس جلسہ کے صدر جو صاحب تھے وہ مجھے پسند نہیں کرتے تھے۔ جب مجھ سے نظم پڑھنے کی فرمائش کی گئی میں نے وہی نظم

سچ بتا کیا زندگی سے بھاگ کر آیا ہے تو

پڑھ دی۔ اس نظم کا ایک بند تھا جس کا ایک مصرع تھا ؏

جس طرح اک فاحشہ عورت کو شوہر کا خیال

صدر صاحب چلائے:

"بند کرو یہ فحش نظم ہے"

مگر ہال میں بیٹھے ہوئے لڑکے لڑکیوں نے شور مچایا نظم فحش نہیں وہ سنیں گے۔ جب صدر نے اپنی بات پہ اصرار کیا تو میں اسٹیج چھوڑ کر اتر آیا اور اسی بات کو لے کر اگلے روز کالج میں ایک لمبی ہڑتال شروع ہو گئی جس کی تفصیل میں پچھلے صفحات میں دے چکا ہوں۔

میری فلمی زندگی کا آغاز ۴۴-۱۹۴۳ء میں پونا سے ہوا۔ شالیمار فلم کمپنی میں تین سال کام کیا۔ پھر ہندوستان کا بٹوارہ ہو گیا اور میں کام کی تلاش میں بمبئی آ گیا۔ یہاں پر دو چار اس کی فلمیں لکھیں۔ نجم نقوی اور یوسف کی فلمیں لکھیں اس کے بعد گریٹ انڈیا ایکسپریس اور نخشب جارچوی کی فلمیں لکھیں۔ فلمستان کی کچھ فلمیں لکھیں۔ پریم جی اور راج کھوسلہ کی فلمیں لکھیں۔ اور پھر بی آر فلمز سے متعلق ہو گیا اور یہ سلسلہ اگلے اٹھارہ سال تک چلا۔ بی آر فلمز کی پہلی فلم جو میں نے لکھی اس کا نام "قانون" تھا۔ اس فلم میں کوئی گانا نہیں تھا۔ یہ اپنے ڈھب کی پہلی فلم تھی جو صرف مکالموں پر کامیاب ہوئی۔ جب بی آر فلم سے ایک مستقل رابطہ قائم ہوا تو میرا کام فلمیں لکھنے کے علاوہ ایک یہ بھی تھا کہ میں ایکٹر ایکٹرسوں کو مکالموں کی ریہرسل بھی کراؤں۔ اس سلسلے میں بہت سے لڑکوں اور لڑکیوں سے ملاقات ہوئی۔ جن میں سے دو ایک تو میرے ساتھ کئی کئی فلموں میں شریک رہے اور ایک بڑا قربت کا رابطہ قائم ہو گیا۔ ان میں دو قابل ذکر ہیں انیتا اور صوفی۔ انیتا کی ماں بنگالی تھی اور باپ نیپالی۔ اسے

اچھے مکالمے بولنے اور زبان سیکھنے کا بہت شوق تھا۔ وہ بڑی خوش شکل اور زندہ دل تھی ان ملاقاتوں کی تفصیل کی ضرورت میں نہیں سمجھتا۔ جب کبھی فرصت ملتی تھی ہم باتیں کرتے تھے۔ انیتا اپنی تنہائی کا رونا بہت روتی تھی۔ اس کا میرا کئی فلموں میں ساتھ رہا۔ دو فلموں کی ہیروئن تو وہی تھی جو ایک کے بعد ایک بنی تھیں۔ یہ کم و بیش ڈھائی تین برس کی مدت ہو جاتی ہے۔ میری لڑکیاں اسے میری گرل فرینڈ کے نام سے پکارتی تھیں۔ آخری ملاقات ہی کہہ لیجئے اسے مہدی حسن بمبئی آئے ہوئے تھے، سلطانہ اور اپنی منجھلی لڑکی اسماء کے ساتھ میں بھی انھیں سننے گیا۔ وہاں انیتا بھی تھی اسماء نے کہا آپ کی گرل فرینڈ پیچھے کھڑی ہے پلٹ کر دیکھا تو انیتا تھی بڑی گرم جوشی سے اس نے میرا ہاتھ پکڑا اور ہم بڑی دیر تک کھڑے باتیں کرتے رہے، اس وقت تک جب تک مہدی حسن نے گانا شروع نہیں کیا۔ اس رات وہیں مہدی حسن سے بھی ملاقات ہوئی۔

صنوفی انیتا کے مقابلہ میں چھوٹی تھی۔ اس نے بھی ایک کے بعد میری تین چار فلموں میں کام کیا۔ جس فلم کے لیے میں جرمنی گیا تھا وہ اس فلم میں بھی تھی۔ نیو برگرنگ، فرینک فرٹ مائز اور جرمنی کے دوسرے شہروں کی سیر میں وہ برابر میرے ساتھ رہی۔ جس طبقہ سے وہ آئی تھی اس کا ایک لطیفہ یہ ہے کہ ایک نوجوان پروڈیوسر اس پر عاشق ہوئے اور اس سے شادی کرنے کے ارادے سے اس کی ماں یعنی صنوفی کی ماں سے ملنے گئے۔

صنوفی کی ماں نے ان کی بڑی آؤ بھگت کی اور گھر کے بچوں کو آواز دی۔ کوئی آٹھ دس بچے آکر لائن میں کھڑے ہو گئے۔ ماں نے کہا شادی شوق سے کیجیے۔ پہلے ہمارا شجرہ سمجھ لیجیے یہ سب بچے ایک باپ کی اولاد نہیں۔ کسی کا باپ ہوٹل کا مالک ہے کسی کا بڑا سرکاری افسر ہے اور کسی کا بمبئی کا بڑا سیٹھ۔ گھر کا پس منظر معلوم ہوتے ہی ساری عاشقی ہوا میں اڑ گئی۔ صنوفی اپنی ذات سے بہت اچھی اور پیاری تھی۔ حلیم الطبع سی لڑکی۔ فلمی زندگی سے دور چلے جانے کے بعد اس طرح کے لوگوں سے ملاقات مشکل ہو جاتی ہے۔ وحتی ایک لڑکی تھی افسوس ہے۔ وہ اس دنیا میں نہیں رہی۔ وہ میری فلم 'ہمراز' کی ہیروئن تھی۔ اس نے پہلے کبھی فلم میں کام نہیں کیا تھا۔ چوپڑہ نے اسے یہ کہہ کر میرے حوالے کر دیا۔ اسے جو سکھانا ہے آپ سکھائیے۔ وہ بڑی کم گو قسم کی لڑکی تھی۔ فلم کے دوران میرا ایک مرتبہ کلکتہ جانا ہوا۔ ایک مشاعرہ میں وہ مجھ سے ملنے آئی اور جب تک میں کلکتہ میں رہا۔ برابر آتی رہی۔ وہ کلکتہ ہی میں

رہتی تھی۔

بی آر فلمز میں شریک ہونے سے پہلے نجم نقوی نے "رنگیلی" کے نام سے ایک فلم بنائی تھی جو میں نے ہی لکھی تھی۔ اس میں ریحانہ کے ساتھ ایک نیا لڑکا لیا تھا۔ بڑا اچھا خوش مزاج سا اچھا قد آور نوجوان تھا۔ وہ فلم نہیں چلی۔ اس کے بعد اس نے ایک اور فلم میں کام کیا جس کا نام "ابشار" تھا وہ بھی نہیں چلی۔ اس دوران میں بی آر فلمز میں چلا گیا تھا۔ وہاں میں ایک فلم پر کام کر رہا تھا جس کا نام "وقت" تھا۔ اس میں ایک لڑکے کی ضرورت تھی۔ میں اپنے اس دوست کو لے گیا اور چوپڑہ سے ملا دیا۔ سب لوگوں نے انھیں پسند کیا اور انھیں "وقت" میں لے لیا گیا۔ وہ فلم "وقت" بے انتہا کامیاب ہوئی اور ان کا شمار بڑے اداکاروں میں ہونے لگا۔ اس فلم وقت کے مکالمے بھی بہت مشہور ہوئے، اتنے کہ زبان زد عام ہو گئے لوگ تھیٹر میں تالیاں بجاتے تھے اور پیسے پھینکتے تھے۔ ایک مکالمہ بہت زیادہ مقبول ہوا

"جن کے اپنے گھر شیشے کے ہوں وہ دوسروں پر پتھر نہیں پھینکتے"

جہاں جہاں بھی فلم کی نمائش ہوتی تھی اور اس فلم کے اداکار اس میں شامل ہوتے تھے۔ ان سے اسٹیج پر اس مکالمے کی فرمائش ہوتی تھی۔ فلم میں یہ جملہ میرے ان دوست ہی نے بولا تھا جن کا میں نے ذکر کیا۔ ایک روز لوگوں کی فرمائش پر وہ چڑھ گئے اور چلائے فلم میں میں نے بھی کچھ کیا ہے کہ سب مکالمہ ہی مکالمہ ہیں۔ اس کے بعد وہ دوسری فلموں میں مصروف ہو گئے۔ میں بھی نہیں مل سکا۔ ان کی میں نے کوئی فلم لکھی بھی نہیں۔ کچھ دن پرانی بات ہے ایک روز ہوائی جہاز میں مل گئے۔ میں دہلی جا رہا تھا۔ کچھ دیر بیٹھے ہنستے ہنساتے رہے پھر دلی آ گیا اور ہم اتر کر اپنے اپنے راستے چلے گئے۔

یہ سب بیان کرنے کا مقصد یہ ہے کہ پروگرام بنا کر کوئی کسی بھی قسم کی کامیابی حاصل نہیں کر سکتا۔ کامیابی اتفاقی چیز ہے۔ ان کا اس فلم "وقت" میں اتفاقاً کام کرنا ان کے لیے نیو کا پتھر بن گیا۔ اگر انھیں اس وقت میری کوشش سے وہ فلم نہیں ملتی تو پھر خدا جانے کب وہ فلم ملتی جو انھیں اوپر لے جاتی اور ان کا شمار اچھے اور بڑے اداکاروں میں ہونے لگتا۔ میں فلم کی کسی بات یا کسی واقعہ کو قاعدہ کلیہ نہیں بنا رہا۔ صرف یہ کہہ رہا ہوں کہ ہر کام میں محنت کو شاں ضرور ہے اور بنیادی ذہانت بھی ضروری ہے مگر کامیاب لفظ کا بہت کم لوگوں

پرا طلاق ہوتا ہے اور کبھی کامیابی ہر ممکن کوشش کے باوجود بھی نہیں ملتی۔

بی آر فلمز کی میں نے "قانون" اور "وقت" ہی نہیں اور بہت فلمیں لکھیں۔ جن میں گمراہ، اتفاق، آدمی اور انسان، ہمراز اور ضمیر شامل ہیں۔ اس کے علاوہ باہر کے پروڈیوسروں کی کامیاب فلمیں لکھیں جن میں نغمہ، پتھر کے صنم، پھول اور پتھر، میرا سایہ، اکیڑس اور دھرم پتر شامل ہیں۔ وقت اور دھرم پتر پر مجھے فلم فیئر ایوارڈ بھی ملا تھا۔

یہ فلیٹ بل ویو جس میں ان دنوں رہتا تھا اس میں میرا بہت جی نہیں لگا۔ یہاں وہ خاموشی نہیں تھی جس کی مجھے عادت تھی یا جو زیویر ولا میں میسر تھی۔ مجنوا اسٹوڈیو کے بالکل سامنے ایک احاطہ تھا جس میں تین چار عمارتیں تھیں۔ یہ مکان سب نئے بنے تھے۔ میرا فلیٹ بالکل اسٹوڈیو کے سامنے والی عمارت میں تھا۔ اس فلیٹ کے اوپر نیچے کے گھروں میں تین چار فلم کمپنیوں کے دفتر تھے۔ جہاں ہر وقت لوگوں کی آمد جارگی رہتی تھی۔ اس احاطے میں جتنی عمارتیں تھیں اس کے لڑکے لڑکیاں مل کر شام میں بل ویو کے احاطے میں بیڈمنٹن کھیلا کرتے تھے۔ میری لڑکیاں شہلا، اسما بھی کھیلا کرتی تھیں۔ یہ ان کے اسکول کا آخری سال تھا۔ کس کالج میں بھیجوں یہ ابھی میں فیصلہ نہیں کر پایا تھا کہ ایک روز ایک واقعہ پیش آیا۔

میرے فلیٹ کے سامنے والی عمارت میں ایک صاحب رہتے تھے جن کا نام ذکریا خاں تھا۔ پشاور کے رہنے والے تھے اچھے مشہور اداکار تھے اور فلموں میں جینت کے نام سے جانے جاتے تھے۔ ان کے دو لڑکے تھے امتیاز خاں اور امجد خاں۔ دونوں باندرہ ہی کے ایک کالج میں پڑھتے تھے۔ ایک روز ان کی والدہ قمر جہاں آئیں اور اپنے چھوٹے بیٹے امجد خاں سے شہلا کے رشتے کی بات کی۔ شہلا کی ابھی شادی کی عمر نہیں تھی۔ اس نے صرف اسکول کی تعلیم ختم کی تھی۔ میں نے قمر جہاں سے شہلا کے پیام کا شکریہ ادا کیا اور کہا میں نے ابھی لڑکیوں کی شادی کے بارے میں کچھ سوچا نہیں۔ ابھی ان کی تعلیم بھی پوری نہیں ہوئی۔ میں اس بات پر تھوڑا غور کرلوں پھر بتاؤں گا آپ کو۔ وہ چلی گئیں۔ مگر میں دبدا میں پڑ گیا۔ اس پیغام میں شہلا کی مرضی کو بھی دخل تھا۔ وہ میں نے جاننا مناسب نہیں سمجھا۔ اس کی واقعی شادی کی عمر نہیں تھی۔ دوسرے لڑکیوں کے بارے میں میری ہمیشہ سے یہ رائے رہی تھی کہ انھیں اتنا تعلیم یافتہ ضرور ہونا چاہیے آگے چلکر کوئی مشکل آپڑے تو خود کفیل ہوسکیں۔ زیویر ولا

جہاں یہ بچے بڑے ہوئے تھے وہاں گوان عیسائیوں اور مراٹھی بولنے والوں کی اکثریت تھی ان کی دوست یا گوان لڑکیاں تھیں یا مراٹھا لڑکیاں۔ ان کے ذہن اور سوچ پر کبھی میں نے کوئی پابندی نہیں لگائی تھی۔ مگر یہ اتنی آزاد بھی نہیں تھیں من مانی کرتی پھرتیں۔ اس آخری بات کا میری ذات یا میری سوچ سے بھی تعلق تھا۔ میں آج کے زمانے کا آدمی ضرور ہوں مگر بہت سی باتوں کو میں نے عقلاً تسلیم کیا ہے عملاً نہیں۔ انسان کے بارے میں مجموعی طور پر میری رائے ہے کہ اس کی کوئی اخلاقی قدر ابدی یا پائیدار نہیں۔ جیسے جیسے اس کو کائنات اور اپنے گرد و پیش کا علم بڑھتا جاتا ہے۔ اس کی سوچ میں بھی تبدیلی آتی چلی جاتی ہے۔ وہ بندر سے انسان بنا ہے یہ نظریہ بھی اب کمزور پڑنے لگا ہے۔ اس لیے کہ بندر کے علاوہ اس میں اور بہت سے جانوروں کے خواص ہیں۔ شیر، کتا، بھیڑیا، گیدڑ اسے کچھ بھی کہا جا سکتا ہے۔ وہ آدم خور بھی ہے۔ اس کی ساری قدریں اس کی ضرورت سے جڑی ہوئی ہیں۔ اس کی کوئی نفسیات نہیں اور جانوروں کی طرح وہ صرف جبلت پر بھی نہیں جیتا۔ خیر یہ تو موضوع ہی دوسرا ہو گیا۔ میں لڑکیوں کی تعلیم اور ان کے مستقبل سے متعلق بات کر رہا تھا۔

علی گڑھ یونیورسٹی میری نظر میں ہمیشہ سے ایک قابل قدر ادارہ رہا ہے۔ بہت سوچنے کے بعد میں نے طے کیا دونوں لڑکیوں کو علی گڑھ بھیج دوں میرے وہاں بہت دوست بھی تھے اور اساتذہ بھی۔ سلطانہ نے میری اس رائے کی تائید نہیں کی مگر میں اپنی بات پر اڑا رہا۔ دونوں کو علی گڑھ لے جا کر یونیورسٹی میں داخل کر دیا اور قمر جہاں کو کہلا بھیجا شہلا، اسما تعلیم سے فارغ ہو لیں گی تو ان کی شادی کے بارے میں سوچوں گا۔ اس بیچ فلمی قلم کار کی حیثیت سے میری اچھی خاصی مانگ ہو گئی تھی۔ بی آر فلمز کے علاوہ باہر کی بھی بہت سی فلمیں میرے پاس تھیں۔ اس دوران پروتما مجھ سے برابر ملتی رہی وہ کوئی اگلی فلم بنانا چاہتی تھی مگر فلم کیا بناتی اس کی مالی حالت ہی ٹھیک نہیں رہی تھی۔ ایک روز آئی اور ایک بجلی کا بل مجھے دیا۔ بہت معمولی رقم تھی۔ مجھے اس کا وہ زمانہ یاد آ گیا جب میں اس سے پہلی بار ملا تھا وہ ورلی پر سمندر کے کنارے جس مکان میں رہتی تھی اس کا نام راحت ولا تھا۔ نیچے کی منزل میں لیلا ڈلیسائی رہتی تھی۔ وہ بھی اپنے زمانے کی مشہور ہیروئن رہی تھی۔ دوسری منزل پر پروتما اور تیسری پر کشوری نام کی ایک عورت رہتی تھی۔ اس کے نقوش بڑے تیکھے اور چہرے پر بڑا

پیچ تھا۔ اکثر پروتما ہی کے یہاں ملاقات ہوتی تھی۔ بعد کے زمانے میں ایک پولس انسپکٹر کے قتل کے جرم میں اسے سزا ہوگئی تھی۔ میں اس زمانے کے پروتما کے گھر کے ماحول کو جنت نگاہ کہہ سکتا ہوں ڈیوڈ ان دنوں ایک مشہور اداکار تھا۔ شالیمار پکچرس کی پہلی فلم "غلامی" جو میں نے لکھی تھی اس میں بھی اس نے کام کیا تھا۔ اسی نے بمبئی میں میری ملاقات پروتما سے کرائی تھی۔ ان دنوں رات کو بھی اکثر شوٹنگ ہوتی تھی اور فلم کی کہانی پر کام کرنے کا طریقہ یہ نہیں تھا کہ شوٹنگ سے پہلے لکھنے کا سارا کام مکمل ہو جائے۔ نہیں! ساتھ ساتھ لکھتے جاتے تھے اور شوٹنگ کرتے جاتے تھے۔

میں شالیمار کے بند ہو جانے کے بعد سخت بے روزگاری کے دور سے گزرا تھا۔ اب یہ پروتما کا کام ملا تھا۔ ۲ رمئی ۱۹۴۷ء کو میری شادی ہوئی تھی اور سلطانہ بھی بمبئی آگئی تھیں مجھے خوش ہونا چاہیے تھا۔ خانہ آبادی بھی ہوگئی اور کام بھی مل گیا مگر میں خوش ہونے کی جگہ ایک دھرم سنکٹ میں پڑ گیا۔ پروتما چاہتی تھی میں ہر وقت اس کے ساتھ رہوں تاکہ اس کی فلم تیزی سے بن سکے اور ازدواجی زندگی کا تقاضا تھا میں زیادہ سے زیادہ وقت سلطانہ کے ساتھ گزاروں وہ ابھی دلہن ہی کہلانے کی منزل میں تھی ابھی شادی ہوئی تھی مگر میں نے رسم اور جذبات پر ضرورت کو ترجیح دی۔ اس کی فلم کی جلدی تکمیل کے پیش نظر اکثر شامیں پروتما ہی کے ساتھ گزرتی تھیں۔ کبھی کبھی رات بھی۔ سلطانہ آج تک اس رویہ کے لیے مجھے مورد الزام ٹھہراتی ہیں۔ مگر وہ بھی کچھ غلط نہیں کہتی تھیں۔ اور میں بھی حق بجانب تھا۔

کچھ دن بعد ہل ویو کا فلیٹ بند کر کے میں بینڈ اسٹینڈ والے گھر میں منتقل ہو گیا۔ یہ ہل ویو سے بڑا مکان تھا۔ اسے میں نے دو فلیٹ ملا کر ایک بنایا تھا۔ وہ ابھی زیر تعمیر ہی تھا۔ لڑکیاں چھٹیوں میں علی گڑھ سے آئیں تو خوش نظر آتی تھیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا۔ انھوں نے علی گڑھ کی زندگی کو قبول کر لیا۔ ان کی عادات و اطوار میں بھی فرق آگیا تھا۔ بمبئی کی فضا کا اثر کم ہو گیا تھا۔ بول چال بھی زیادہ صاف ہوگئی تھی۔ مختصر یہ کہ وہ زیادہ مشرقی ہوگئی تھیں۔ جب بینڈ اسٹینڈ والا فلیٹ تیار ہوگیا تو دونوں لڑکیوں نے اصرار کیا میں ہل ویو سے اس فلیٹ میں آجاؤں میں نے یہ فلیٹ اس نیت سے خریدا تھا اسے کرایہ پر اٹھا دوں گا اور کچھ مزید آمدنی کا سلسلہ ہو جائے گا۔ مگر ان کے اصرار پر میں ہل ویو چھوڑ کر یہاں آگیا۔ یہ فلیٹ پانچویں منزل پر تھا۔ فلیٹ کے ہر

کمرے سے سمندر نظر آتا تھا۔ صبح صبح سمندر کے کنارے کشتیاں بہت اچھی لگتی تھیں۔

دونوں لڑکیوں کو بمبئی کی ملک ضرور تھی مگر علی گڑھ بھی بہت راس آیا۔ شہلا کا امتحان ہوا تو وہ یونیورسٹی میں اوّل آئی۔ کنووکیشن کے موقعہ پر اسے گولڈ میڈل ملے گا۔ مجھے خوشی ہوئی مگر شہلا کا خط آیا گولڈ میڈل اسے نہیں کسی لڑکے کو دیا جارہا ہے جو اس امتحان میں شامل بھی نہیں ہوا تھا جس میں شہلا اوّل آئی تھی۔ معلوم ہوا علیم صاحب لڑکے کی پشت پناہی کر رہے ہیں۔ علیم صاحب کٹر کمیونسٹ مشہور تھے۔ یونیورسٹی کے وائس چانسلر بھی تھے اور بڑے دیانتدار مشہور تھے۔ شہلا نے لکھا اسے گولڈ میڈل نہ دیا گیا تو وہ احتجاج میں یونیورسٹی چھوڑ کر واپس آجائے گی۔ میں فوراً علی گڑھ گیا۔ آل احمد سرور کو ساتھ لے کر علیم صاحب کے پاس گیا انھوں نے جواب میں جو کہا مجھے سن کر افسوس ہوا۔

"مجھے نہیں معلوم تھا شہلا آپ کی لڑکی ہے"۔

"یہ معلوم ہونے کی بات نہیں علیم صاحب۔ صحیح اور غلط کی بات ہے۔ دیانتداری اور بددیانتی کی بات ہے"۔

وہ چپ رہے کوئی جواب نہیں دیا۔ میں نے اٹھتے اٹھتے کہا،

"علیم صاحب میں وکیل کے پاس جارہا ہوں۔ شہلا کو گولڈ میڈل نہ ملا اور اس کی جگہ کسی اور کو دیا گیا تو اپنی صفائی آپ عدالت میں دیں گے"۔

کنووکیشن ہوا تو وہ میڈل کسی کو نہیں ملا۔ پھر کسی ایک عام جلسہ میں شہلا کو بلاکر وہ میڈل دے دیا گیا۔ جس کی کوئی اہمیت ہی نہیں معلوم ہوئی۔ جب تک یہ دونوں لڑکیاں علی گڑھ میں رہیں میرا آنا جانا لگا ہی رہا۔ ایک بار شہلا بیمار ہوگئی تو میں فوراً گیا۔ ایک بار اسمار نے کہا وہ بی اے کے بعد ایک سال کا وقفہ دے گی۔

"کیوں" میں نے پوچھا۔ معلوم ہوا انگریزی شعبہ کے صدر کی بیٹی بھی اسی کی کلاس میں ہے اور سب اساتذہ اسے فوقیت دیتے ہیں۔ اسمار کا اوّل آنا مشکل ہے۔ اسی سفر کے دوران اسمار نے مجھے ایک لڑکے سے ملوایا جو انجینئرنگ کر رہا تھا۔ اور اپنی پسندیدگی کا اظہار کیا۔ میں نے کہا ایم اے کرو۔ اس بیچ ہم بھی لڑکے کا گھر بار دیکھ لیں گے اور اس کے عزیزوں سے بھی مل لیں گے۔ لڑکے کے والد کا انتقال ہوچکا تھا۔ وہ لکھنؤ کے محکمہ تعلیم میں تھے۔

وقت گزرتے دیر نہیں لگتی۔ شہلا، اسمار بی اے کرکے علی گڑھ سے واپس آگئیں۔ اسمار کو تو اس سال علی گڑھ نہیں جانا تھا۔ شہلا چلی گئی۔ اسما ایک سال گھر پر رہی تو پتہ چلا امجد سے رشتہ کو شہلا بھی پسند کرتی ہے۔ میں اس شادی کے حق میں نہیں تھا۔ اس کی کئی وجوہ تھیں۔ ایک تو میرا خیال امجد کے بارے میں یہ تھا وہ لڑکیوں سے صرف تفریح کرتا ہے سنجیدہ نہیں ہوتا۔ دوسرے امجد برسر روزگار نہیں تھا۔ تیسرے مجھے یہ خدشہ تھا اگر پورا خاندان کبھی بمبئی چھوڑ کر پشاور چلا گیا تو لڑکی سے ملنا ہی مشکل ہو جائے گا۔ اور سب سے بڑی وجہ رہن سہن اور گھر کا کلچر تھا۔ جن گھروں میں لڑکے لڑکی کا رہن سہن اور زندگی گزارنے کا طریقہ ایک جیسا نہیں ہوتا وہاں بہت سی پریشانیاں پیدا ہو جاتی ہیں۔ کنبہ، بستی، خاندان، قبیلہ اگر ایک نہ ہو اور کوئی ثقافتی مماثلت بھی نہ ہو چاہے کھینچ تان کر زندگی گزار جائیں مگر ایک اجنبیت ہمیشہ باقی رہتی ہے۔ اس خیال سے میں نے کئی لڑکے دیکھے یا کئی لڑکے تجویز ہوئے۔ ایک لندن میں تھا۔ ایک امریکہ میں ایک کہیں اور مگر شہلا تیار نہیں ہوئی۔ میں نے سوچا اب اس موضوع پر بات کرنا بیکار ہے۔ میں نے اسمار سے کہہ کر امجد کو بلوایا۔ میں نے پوچھا شادی کیوں کرنا چاہتے ہو، نہ برسر روزگار ہو نہ شاید تمھاری تعلیم پوری ہوئی ہے۔ نہ کوئی کاروبار یا تجارت کا سلسلہ ہے۔ اس صورت میں بیوی کی ذمہ داری کیسے لوگے۔ اس نے کہا وہ ایم اے پاس ہے کوئی بھی کام کرکے اپنا اور بیوی کا گزارہ کر سکتا ہے۔ اور میں مان اس لیے گیا کہ خود تن بتقدیر جیتا رہا تھا۔ اپنے مستقبل کا کبھی کوئی پلان میرے پاس نہیں رہا تھا۔ نتیجہ میں شہلا کی شادی ہوگئی اور وہ اپنے گھر چلی گئی۔ اسمار واپس علی گڑھ چلی گئی اور ایم اے میں بہت اچھے نمبر لے کر پاس ہوئی۔ کچھ مدت بعد اس کی بھی شادی ہوگئی۔ اور وہ لکھنؤ چلی گئی۔

گھر میں صرف دو بچے رہ گئے۔ رامش اور رخشندہ۔ رخشندہ علی گڑھ نہیں جانا چاہتی تھی اسکول کی تعلیم ختم کرکے وہ خود ہی سینٹ زیویرز کالج چلی گئی۔ اور داخلہ لے لیا۔ جب وہ انگریزی سے بی اے آنرز کر چکی تو کچھ دن ایک انگریزی اخبار میں کام کرتی رہی پھر اس کی بھی شادی ہوگئی۔ اس کا شوہر نعیم خاں جسے ہم جاوید کے نام سے پکارتے ہیں۔ رامپور کا رہنے والا ہے۔ اور ابوظہبی میں ہلٹن ہوٹل میں ڈائریکٹر تھا۔ رخشندہ بھی ابوظہبی چلی گئی۔ رامش البتہ میرے لیے ایک مسئلہ بنا رہا۔ اس کا سبب میری کوتاہی تھی۔ جتنی توجہ اس کی طرف دینی چاہیے تھی میں نے

نہیں دی۔ میں اس گمان میں رہا لڑکیاں ٹھیک پڑھ رہی ہیں تو یہ کیوں نہیں پڑھے گا۔ دوسرے میری فلم کی مصروفیت بہت بڑھ گئی تھی۔ رامش بالکل نظرانداز ہو گیا۔ ایک وقت آیا جب اسے اسکول سے نکال دیا گیا۔ وہ ہر وقت لڑائی جھگڑے اور مار پیٹ میں لگا رہتا تھا۔ گھر میں کھوکھری رکھی ہوئی تھی۔ رامپوری چاقو تھا۔ آدھی آدھی رات تک ہوٹلوں میں ناچ کرتا رہتا تھا۔ دن بھر لڑکیاں اس سے ملنے آتی رہتی تھیں۔ یہ سب میرے علم میں تھا مگر میں نے ٹوکا نہیں۔ میرا خیال تھا اولاد کا بزدل ہونے سے دلیر ہونا بہتر ہے۔ یہی سوچ کر میں چپ رہا مگر جب اس کے اسکول کے پرنسپل نے جب مجھے بلایا اور کہا اپنے لڑکے کو اس اسکول سے لے جائیے تو میں تھوڑا پریشان ہوا۔

یہ مکان زلویرولا جہاں میں ان دنوں رہتا تھا گوان عیسائیوں کی بستی تھی۔ میرے گھر سے تھوڑے فاصلے پر ایک سڑک تھی جسے وروڈا روڈ کہتے تھے۔ وہ اب بھی ہے۔ شراب پر پابندی لگنے کے بعد وہ علاقہ ایک بہت بڑا شراب کا اڈہ بن گیا۔ بہت سے گھروں میں شراب کشید ہونے لگی تھی۔ اکثر گھروں میں بیچی بھی جانے لگی تھی جس اسکول رامش پڑھتا تھا وہاں اکثریت وروڈا روڈ کے لڑکوں کی تھی۔ ویسے بھی یہ پورا علاقہ وروڈا روڈ ہی کہلاتا تھا۔ رامش پر اس ماحول کا اثر بھی ضروری تھا۔ آٹھویں جماعت پاس کرنے کے بعد میں رامش کو بھوپال لے گیا اس لیے کہ اس کے پرنسپل نے کہا تھا اس کا ماحول بدل دیجیے۔ بھوپال میں کچھ دوست اور کرم فرما تھے۔ جاں نثار اختر میرے دوست تھے۔ وہاں ان کی سسرال بھی تھی۔ ان کے بڑے سالے کا نام عباس تھا۔ میں رامش کو لے کر ان کے پاس گیا۔ وہ میرے جانے سے بہت خوش ہوئے۔ وہ بہت سے لوگوں کو جانتے تھے۔ انھوں نے رامش کا نویں کلاس میں داخلہ کرا دیا۔ مگر رامش کا وہاں بہت جی نہیں لگا۔ مگر رو پیٹ کر بارہویں جماعت پاس کر لی۔ اس بیچ میرا ایک قدم بھوپال اور دوسرا بمبئی میں رہا۔ بارہویں کے بعد میں رامش کو علی گڑھ یونیورسٹی لے گیا اور وہاں داخلہ کرا دیا۔ علی گڑھ میں بھی میرے بہت کرم فرما تھے۔ خورشید الاسلام ساجدہ زیدی اور زاہدہ زیدی۔ رامش شروع میں کچھ دن ساجدہ زیدی کے پاس رہا۔ پھر اسے ہوسٹل میں جگہ

مل گئی اور یہ وہاں منتقل ہو گئے۔ شہریار وہاں اردو کے شعبہ میں معلم تھے۔ میں انھیں ان لوگوں کے سپرد کر کے واپس آگیا۔ مگر معلوم ہوا رامش کو بمبئی کے مقابلہ میں علی گڑھ کچھ زیادہ اچھا نہیں لگا۔ تیسرے سال بی اے کا ایک پرچہ چھوڑ کر واپس آ گئے۔ میں نے سوچا انھیں بطور ایکٹر اپنے فلم کی لائن میں داخل کر دوں۔ ایک تصویر "دھند" میں تھوڑا سا کام کیا بھی مگر کچھ دوستوں کے کہنے میں آکر دوبئی چلے گئے۔ میری چھوٹی لڑکی رخشندہ ابوظبی میں تھی۔ اس کا شوہر فہیم خاں ہلٹن ہوٹل میں ڈائریکٹر تھا۔ یہ بھی کبھی دوبئی سے ابوظبی بھی چلے جاتے تھے مگر وہاں کوئی خاص کامیابی حاصل نہیں ہوئی چھ سال بعد بمبئی واپس آ گئے اور فلم میں جانے کی کوشش کرنے لگے۔

صاحب اقتدار اور زندگی میں کامیاب ہونے والے اکثر لوگوں کا وہی رویہ ہوتا ہے جس کی طرف شیخ سعدی نے اشارہ کیا ہے

گاہے بہ سلامے برنجند گاہے   بہ دشنامے خلعت می دہند

جن لوگوں کے لیے میں فلمیں لکھا کرتا تھا انھیں مجھ سے خلوص نہیں رہا تھا۔ انھوں نے رامش کی کوئی مدد نہیں کی۔ میری فلمی زندگی کا زوال شروع ہو گیا تھا جو کم و بیش دس برس پر پھیلا ہوا ہے۔ میں نے بینڈ سٹینڈ والے فلیٹ کے علاوہ اور دو فلیٹ خریدے تھے وہ دونوں بک گئے۔ مرے پر سو دُرّے میری صحت کا زوال بھی شروع ہو گیا۔

صبح کی سیر میری برسوں پرانی عادت رہی تھی بینڈ سینڈ والے مکان میں آکر بھی صبح باقاعدہ سیر کرتا تھا۔ مگر اچانک ایک روز معلوم ہوا مجھے انجائنا ہو گیا ہے۔ معائنہ کرایا تو پتہ چلا میرے دل کی کئی نالیاں بند ہو گئی ہیں۔ مزید معائنہ سے پتہ چلا گردے بھی کمزور ہو گئے ہیں۔ اینجو گرافی کرنے کے بعد ڈاکٹر لیلا جانی جن کے زیر علاج میں تھا۔ انھوں نے مشورہ دیا میں امریکہ چلا جاؤں۔ ہوسٹن (ٹیکساس) میں سینٹ لیوک ہے۔ وہاں آپریشن کرواؤں مگر ڈینٹن کولی سے نہیں ڈاکٹر جارج رول سے مگر میرے کچھ دوست جو لندن میں تھے اور بی سی آئی بینک سے وابستہ تھے وہ کوشش کر رہے تھے بینک میرا علاج کرائے۔ ان کا ایک شعبہ تھا جو ادیبوں شاعروں کے علاج کے لیے روپیہ دیتا تھا مگر بہت

دن تک لندن سے کوئی جواب نہیں آیا۔ ڈاکٹر اصرار کر رہا تھا میں جلدی جاؤں۔ ابھی تک مجھے دل کا دورہ نہیں پڑا تھا۔ امکان تھا دورہ پڑ جائے اس صورت میں علاج میں الجھن اور پیچیدگی پیدا جائے گی۔ ایک روز امجد اور شہلا گھر آئے اور اصرار کیا میں علاج کے لیے فوراً چلا جاؤں۔ میں تیار ہو گیا۔ امجد نے اپنے ایک ڈاکٹر دوست اشوک ہتولکر کو میرے ساتھ کر دیا۔

مختصر یہ کہ میں ہیوسٹن (ٹیکساس) کے اسپتال سینٹ لیوک میں چلا گیا اور میرا آپریشن ہو گیا۔ پانچ بائی پاس ہوئے اور ایک والو بدلا گیا۔ وہاں آپریشن کرتے وقت ڈاکٹروں کا سارا دھیان میرے گردوں پر رہا اور میرے پھیپھڑے خراب ہو گئے نتیجہ یہ کہ میں ایک مہینہ سینٹ لیوک میں پڑا رہا جبکہ اکثر مریض وہاں سے دس روز میں ٹھیک ہو کر آجاتے ہیں سلطانہ میرے ساتھ گئی تھی۔ وہاں کی نرسوں کے باوجود انھوں نے رات رات بھر جاگ کر میری دیکھ بھال کی۔ آپریشن کے بعد جب مجھے ضرورت سے زیادہ دیر آئی سی یو میں رکھا گیا اور مجھے کئی روز ہوش نہیں آیا یہ باہر بیٹھی گھنٹوں اس بات کا انتظار کرتی رہتی تھیں۔ مجھے کب ہوش آتا ہے۔ ایک مہینہ تک سینٹ لیوک میں رہنے کے بعد ہر ڈاکٹر خواہش مند تھا میں زندہ واپس چلا جاؤں جیسے انھیں میرے زندہ واپس جانے کا یقین نہ ہو مگر میری مشکل یہ تھی کہ میں اچھی طرح چلنے پھرنے کے قابل نہیں تھا اور چاہتا تھا کہ بالکل ٹھیک ہو کر واپس جاؤں۔ ڈاکٹر اشوک بھی عاجز آ گئے تھے۔ وہ کتنے دن میرے ساتھ رہتے نانا وتی اسپتال کے ملازم تھے۔ امجد کی وجہ سے میرا ساتھ نہیں چھوڑ رہے تھے۔ ایک روز خیال آیا میں چلا ہی جاؤں تو اچھا ہے سب کو اطمینان ہو جائے گا اور میں نے روانگی کی ٹھان لی۔ ہیوسٹن میں میرے دوست شام کشن کی بیٹی کملیش بھی کام کرتی تھی اس نے میری بہت مدد کی۔ ہم ایرپورٹ آئے تو معلوم ہوا ہمارے لیے جگہ ہی نہیں جہاز میں۔ کملیش نے بھاگ دوڑ کرکے جگہ نکال لی اور ہم خدا خدا کرکے لندن پہنچے۔ سات گھنٹے وہاں پڑے رہے۔ جینا دوبھر معلوم ہو رہا تھا۔ مگر اپنا دکھ تو خود ہی بھوگنا پڑتا ہے۔ رات کا جہاز ملا اور ہم بمبئی پہنچ گئے اور اب تک بقید حیات ہوں۔ یہ غالباً ۱۹۸۶ء کی بات ہے۔

ٹھیک ہوکر میں واپس آتو گیا مگر اس بیچ کچھ دوسرے مسائل پیدا ہوگئے۔ رامش دوبئی سے واپس آگیا اور کہا اب واپس نہیں جائے گا۔ اس کے فوراً بعد چھوٹی لڑکی رخشندہ اپنی دونوں بچیوں ثمرا، عظمیٰ کو لے کر آگئی۔ اس کی شوہر سے کچھ ان بن ہوگئی تھی۔ پھر وہی صورت حال پیدا ہوگئی، جو ٹرنر روڈ والا مکان چھوڑتے وقت تھی۔ نہ کام، نہ کام کرنے کی ہمت ابھی اتنا بڑا آپریشن ثمرا کرا کے آیا تھا۔ رامش، رخشندہ اور اس کے بچوں کا خرچ۔ پھر میں اور میری بیوی۔ امجد نے ابھی میرے آپریشن پر اتنا روپیہ خرچ کیا تھا۔ اس سے کبھی میں اپنی مالی حالت کے بارے میں کوئی بات نہیں کرنا چاہتا تھا۔ ایک روز خیال آیا میرے مسائل میرے سوا کون حل کرے گا۔ میں نے طے کیا بینڈ اسٹینڈ والا یہ مکان جس میں رہتا ہوں بیچ دوں۔ جو روپیہ ملے اس سے ایک دو بیڈ روم کا مکان خرید لوں اور باقی روپیہ کہیں لگا دوں۔ اگر کام نہ بھی ملے یا میں کام کے قابل نہ رہوں تو زندگی آرام سے کٹتی رہے۔ رامش رخشندہ اور اس کے بچوں کو بھی تکلیف نہ ہو۔ اور میں نے بینڈ اسٹینڈ والے مکان کا سودا کر لیا۔ یوسف ناظم مشہور شاعر ہونے کے علاوہ میرے کرم فرما بھی ہیں۔ وہ اپنے ایک دوست عیسیٰ جمالی کو لائے اور انھوں نے وہ مکان خرید لیا۔ اس روپیہ سے میں نے کارٹر روڈ پر ایک مکان خریدا۔ دو بیڈ روم ایک بیٹھنے کا کمرہ باورچی خانہ اور دو غسل خانے۔ یہ مکان میرے لیے اور سلطانہ کے لیے کافی تھا۔ زیور والا ابھی تک میرے پاس تھا۔ رامش وہاں رہنے چلے گئے۔ باقی روپیہ دو تین جگہ لگا دیا اور بسر کرنے لگا۔

رخشندہ بڑے پکے ارادے کی لڑکی ہے۔ کچھ کرنے کی ٹھان لے تو پیچھے نہیں ہٹتی۔ بمبئی سے سینٹ زیویر سے انگریزی میں آنرز کرنے کے بعد پہلے اخبار نویسی میں لگی رہی۔ اس کے بعد اور ایک دو کام کیے پھر اس کی شادی ہوگئی۔ شادی میں اس کی مرضی کو کتنا دخل تھا مجھے نہیں معلوم، مگر لڑکا ہم سب کو پسند تھا۔ اس خاندان سے میری ملاقات نجیب آباد میں ہوئی تھی۔ جاوید کے بڑے بھائی محی الدین خاں وہاں ایک سرکاری ملازمت میں تھے۔ بمبئی میں جاوید کچھ روز میرے پاس بھی رہا۔ اسے فلم کے پیشے سے دلچسپی تھی

مگر کچھ دن بعد ابوظبی چلا گیا اور وہاں ہوٹل ہلٹن سے متعلق ہوگیا۔ کچھ مدت بعد جاوید اور رخشندہ کی شادی ہوگئی اور وہ بھی ابوظبی چلی گئی۔ وہاں جا کر بھی وہ کام کرتی رہی۔ ایک اسکول میں انگریزی پڑھاتی رہی۔ رخشندہ کے دو اولادیں ہوئیں۔ ثمرہ اور عظمیٰ۔ دونوں لڑکیوں کی پیدائش کے بعد رخشندہ اور جاوید میں ان بن ہوگئی اور رخشندہ دونوں لڑکیوں کو لے کر بمبئی میرے پاس آگئی دونوں لڑکیوں کو یہاں اسکول میں داخل کر دیا اور خود سعودی ائرلائنز میں کام کرنے لگی۔ رخشندہ کی ایک دوست قاہرہ چلی گئی تھی۔ دو سال سعودی میں کام کرنے کے بعد اس نے قاہرہ جانے کا ارادہ کیا۔ قاہرہ جاتے وقت دو دن کے لیے وہ ابوظبی میں رُکی۔ وہاں سے اسے کچھ اپنا سامان اور کپڑے لینے تھے جاوید کو معلوم ہوا رخشندہ ابوظبی آئی ہوئی ہے وہ ملنے گیا اور دونوں میں سمجھوتہ ہوگیا۔ رخشندہ قاہرہ سے واپس آئی تو جاوید آکر رخشندہ اور بچوں کو واپس لے گیا۔

اس دوران پروتما سے ملاقات نہیں ہوئی۔ ایک دن اچانک اطلاع ملی اس کا انتقال ہوگیا۔ مجھے ایک نقصان کا احساس ہوا۔ اس کے ساتھ ایسا رابطہ رہا تھا جو کبھی کسی کے ساتھ نہیں رہا تھا۔ وہ بہت اچھی دوست تھی۔ اس کے گھر کا مجھے اس زمانے کا نقشہ ابھی تک یاد ہے۔ اس کے ہاں بڑی ہماہمی تھی بیگم پارہ اس زمانے کی مشہور اداکارہ تھی۔ اور پروتما تو ساتھ رہتی ہی تھیں۔ ایک پارسی لڑکی خورشید تھی۔ ایک سنگاپور کی لڑکی تھی۔ سنگاپور ائرلائنز میں کام کرتی تھی۔ چھریرا بدن، طویل قامت بڑی پیاری سی۔ موہنا نام کی ایک لڑکی تھی بہت دیدہ زیب تھی۔ فلم ہی میں کام کرتی تھی۔ بہت اچھی طبیعت کی لڑکی تھی۔ فلم کی زندگی ترک کر کے کچھ دن بعد فرانس چلی گئی تھی۔ ابھی پچھلے دنوں میں نے اس کے انتقال کی خبر پڑھی تھی۔ جب وقت ملتا تھا شام کو سب مل کر ساتھ بیٹھتے تھے۔ گپ کرتے تھے۔

پروتما نے شانتی نکیتن میں تعلیم پائی تھی۔ اردو شاعری اور مصوری کی بڑی دلدادہ تھی۔ مجھ سے بہت مانوس اور میری بہت قدردان تھی اور دیکھو اب مر گئی تھی بیگم پارہ نے ناصر خاں سے شادی کر لی تھی اور اب ناصر خاں بھی حیات نہیں۔ امجد کے انتقال پر پارہ کا

فون آیا تھا۔

"اختر میں بیمار ہوں" شاید پت جھڑ کا موسم شروع ہو رہا تھا۔ اس دوران مجھے دو اور بڑے حادثوں اور سانحوں کا سامنا کرنا پڑا۔ اسما میری دوسری لڑکی اپنی پہلی زچگی کے سلسلے میں دمام سے میرے پاس بمبئی آئی۔ اسے ایک مقامی اسپتال میں داخل کرا دیا۔ بچّہ ہونے تک خیریت گزری اس کے بعد معاملہ بگڑ گیا اور وہ دو مہینے تک اسپتال میں پڑی رہی اور مرتے مرتے بچی واپس گئی تو بچّہ کو ساتھ نہیں لے جا سکی اگلے سال آکر لے گئی۔ لڑکا ہوا تھا۔ اس کا نام ہم نے جاذب رکھا۔

۱۵ راکتوبر ۸۶ء کی بات ہے امجد ایک فلم کی شوٹنگ کے سلسلے میں گوا جا رہا تھا۔ راستے میں گاڑی ایک پیڑ سے ٹکرا گئی۔ شہلا ساتھ تھی۔ شہلا کو بھی چوٹیں آئیں مگر امجد بری طرح زخمی ہوا۔ چوٹوں کے علاوہ پاؤں کی ہڈی ٹوٹ گئی۔ اطلاع ملتے ہی میں اور سلطانہ فوراً گوا گئے شہلا کو دلاسا دیا اور امجد کی صحتیابی کا انتظار کرتے رہے۔ جب وہ قدرے بہتر ہوا ایک جہاز کرایہ پر لے کر سب کو بمبئی لے کر آئے اور وہ ایک مہینے تک نانا وتی اسپتال میں رہا اس کے بعد میں سب کو اپنے پاس لے آیا۔ جس مکان میں امجد رہتے تھے اس میں لفٹ نہیں تھی۔

مہینہ ڈیڑھ مہینہ تک امجد شہلا اور بچّے میرے پاس رہے اور جب امجد تھوڑا چلنے پھرنے کے قابل ہو گیا اپنے گھر چلے گئے۔

ایسے موقعوں پر انسانی زندگی کے بہت سے پہلو سامنے آتے ہیں۔ ایسے کئی پروڈیوسر تھے جنھوں نے امجد کی تیمارداری اور دیکھ بھال کے بہانے گوا کے ان ہوٹلوں کو جہاں انھیں ٹھہرایا گیا تھا پکنک گاہ اور تفریح کا اڈہ بنا لیا تھا۔ بے دریغ ڈھیروں مرغ مچھلیاں شکم میں اتاری گئیں اور شراب لنڈھی میں نے ایک زمانہ ہوا ایک فلم دیکھی تھی جب مردے کی چتا میں آگ دی گئی جنازے میں شریک ہونے والوں میں سے ایک اس آگ پر ہاتھ تاپ رہا تھا۔ یہ منظر میں نے اس وقت دیکھا جب امجد کا اچانک انتقال ہوا جنازہ اٹھانے کے وقت ہر ایکٹر کی کوشش تھی وہ پہلے جنازہ کو کاندھا دے۔ اس لیے کہ

چاروں طرف کیمرے لگے ہوئے تھے اور اس پس منظر کے ساتھ ہر ایکٹر تصویر کھچوانے کا خواہشمند تھا۔ اس لیے کہ اگلے روز وہ فلم سارے ہندوستان میں دکھائی جانے والی تھی۔ اپنی ذات کی نمائش کرنا بھی انسان کی خصوصیات میں سے ایک ہے لیکن اگر آدمی خود نمائی کے شعبہ سے وابستہ ہے جیسے فلم کا پیشہ تو یہ حس اور ابھر آتی ہے۔ مختصر یہ کہ زندگی کی افتاد اپنی جگہ اور میرا کاروبار حیات اپنی جگہ۔ میں بینڈ اسٹینڈ کا مکان فروخت کر دینے کے بعد کچھ دن پرانے مکان زلیو یرولا میں رہا۔ سامان بہت تھا۔ کتابیں کچھ شہلا کے یہاں رکھیں کچھ زلویرولا میں اور کچھ ادھر ادھر۔ اس کے بعد باندرہ ہی میں کارٹر روڈ پر ایک مکان خریدا اور وہاں منتقل ہو گیا۔ روی درشن اس نئے مکان کا نام ہے۔

آنند بھوشن کی کہانی ختم ہوتے ہوتے اس کا کردار نہ سفید رہا نہ سیاہ۔ میں کبھی کبھی سوچتا ہوں کیا واقعی پروردگار نے دنیا اس طرح بنائی ہے کہ انسان کے اعمال کا حساب کتاب دنیا ہی میں ہو جائے؟ ٹرنر روڈ کا ملیا میٹ ہو جانے کے بعد جہاں میری مالی حالت میں اتار چڑھاؤ آیا وہاں دونوں بہنوں نے بھی سمجھوتہ کر لیا اور ان کا میرے گھر میں آنا جانا شروع ہو گیا۔ ان کے یہاں اولادیں ہوئیں۔ دو لڑکے وکاس اور روی امجدی بیگم بہت خوش تھیں مگر ان دونوں کی طرف رویہ اچھا نہیں تھا۔ دونوں لڑکے بڑے ذہین اور سمجھدار تھے۔ حساس بھی بہت تھے۔ بھاگ بھاگ کر ہمارے ہاں آتے تھے۔ میرے بچے ہی تو ان کے رشتہ دار تھے۔ شہلا اسمار، رخشندہ اور رامش یہی تو ان کے بھائی بہن تھے۔ یا نزدیک ترین رشتہ دار۔ مگر آنند بھوشن نے ان کے آنے پہ پابندی لگا دی۔ وہ دونوں چھپ کر آنے لگے۔ ان کے گھر کے ماحول میں بھی دوفصلاپن پیدا ہو گیا۔ ماں مصلے پر بیٹھی نماز پڑھ رہی ہے تو باپ پوجا کر رہا ہے۔ میاں بیوی کے تعلقات میں بھی توازن نہیں رہا تھا۔ آنند رنگین طبیعت کا آدمی تھا اور کافی کنجوس بھی تھا۔ بچوں کو پورا جیب خرچ ہی نہیں ملتا تھا اور دونوں کو ماں باپ کی پوری محبت بھی نہیں ملی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ دونوں بچوں میں دو دلاپن پیدا ہو گیا۔ اور دونوں نے زندگی سے فرار کے راستے تلاش کرنے شروع کر دیے۔ وکاس جذباتی ناآسودگی کے سبب منشی چیزیں کھانے لگا اور

بُری صحبت میں پڑ گیا۔ روی امریکہ جانے میں کامیاب ہو گیا مگر باپ کی طرف سے پورا خرچ نہ ملنے کے سبب غلط صحبت میں پھنس گیا اور وہاں اس کا قتل ہو گیا۔ وکاس نشہ کرنے کے سبب ذہنی توازن کھو بیٹھا اور اسے ایک دماغی اسپتال میں رکھنا پڑا۔ بنگلور میں آتما شکتی نام کا ایک کلینک ہے جسے کینیڈا کے ایک پادری چلاتے ہیں جنھیں لوگ فادر ہنیک کے نام سے جانتے ہیں۔ وکاس کی وجہ سے آنند کھوشن اور امجدی بیگم بھی بمبئی کا مکان بیچ کر بنگلور چلے گئے۔ وہاں کچھ دن بعد آنند کا انتقال ہو گیا۔ وہ دمہ کے مریض تھے بنگلور جانے سے پہلے آنند کبھی کبھی میرے پاس آتا تھا اور دونوں لڑکوں کا ذکر کر کے ان کی صورتحال پر روتا تھا۔ "چپ رہو" میں بگڑ کر کہتا تھا "جو ہوا اس کے ذمہ دار تم ہو۔

ان ہی واقعات کے ساتھ چھوٹے بڑے کچھ اور واقعات ہیں جو بہت اہم تو نہیں مگر انسان کے اندر جھانکنے کا موقع فراہم کرتے ہیں۔ ایک پروڈیوسر نے کام کرانے کے بعد مجھے ایک جھوٹا چیک دے دیا۔ ان کا نام غیر ضروری ہے۔ جگنو کا ذکر میں اوپر کر چکا ہوں۔ ان دنوں بابو نام کا ایک آدمی اس کا دوست تھا۔ غنڈہ گردی اس کا پیشہ تھا۔ میں نے وہ چیک اسے دے دیا۔ سنا ہے اس نے پروڈیوسر کے دفتر میں جاکر کچھ توڑ پھوڑ کی اور روپیہ وصول کر لیا۔ جن دنوں فلمستان میں کام کر رہا تھا وہاں ایک فلم ڈائرکٹر ہیمن گپتا سے ملاقات ہوئی تھی۔ فلمستان سے الگ ہونے کے بعد انھوں نے ایک فلم "فیری" بنائی۔ اس کے مکالمے مجھ سے لکھوائے۔ کام کے دوران کچھ پیسے دیے۔ کام ختم ہونے کے بعد جو رہ گیا تھا وہ دینے میں آنا کانی کرنے لگے۔ ان کے بارے میں مشہور تھا وہ بڑے انقلابی رہے تھے۔ ایک انگریز افسر کو گولی مار دی تھی۔ ٹھیک ہے مار دی ہوگی مگر جو روپیہ ان کی طرف رہ گیا تھا وہ تو لینا ہی تھا۔ اس کے لیے انھوں نے کہا آدھا دے سکتے ہیں۔ ان کی مالی حالت ٹھیک نہیں۔ میں تیار ہو گیا۔ انھوں نے فوراً ہی ایک کاغذ تیار کرایا اور اس پر مجھ سے دستخط لے لیے۔ جب طے شدہ روپیہ مانگا تو بولے روپیہ نقد تو نہیں چیک لے جاؤ۔ میں چیک لے آیا۔ بینک میں گیا تو واپس ہو گیا۔ میں وہ چیک لے کر ڈائرکٹر موصوف کے پاس گیا۔ جانے کیوں انھوں نے مجھے وہی کہانی

سنائی جس میں انگریز افسر کو گولی ماری تھی۔ میں نے ان سے کہا۔ میں آپ کے بیان سے بہت متاثر ہوا اور مرعوب بھی مگر آپ نے مجھ سے ایک سمجھوتہ کیا ہے۔ اصل واجب رقم کو پہلے آدھا کیا پھر ایک تحریری معاہدہ کیا اور روپیہ دیتے وقت بجائے نقد کے ایک چیک دیا جو بینک نے واپس کر دیا۔ پہلے تو نہیں تھے مگر اب آپ دفعہ چار سو بیس کے مجرم ہو گئے۔

"تو اس کے لیے کیا تم مجھ پر مقدمہ کرو گے"

"نہیں۔ اتنا ہی روپیہ جتنے کا چیک ہے کسی بد دیانت پولیس افسر کو دوں گا۔ آپ کو ہفتہ کے دن گرفتار کراؤں گا۔ دو دن آپ حوالات میں بند رہیں گے۔ جب دو دن بعد چھوٹ کر آئیں گے میں سمجھوں گا میرا روپیہ وصول ہو گیا۔"

یہ کہہ کر میں گھر آ گیا۔ شام کو بھارت بھوشن میرے پاس آئے۔ ہیمن گپتا ان کی ایک فلم کی ہدایت دے رہے تھے۔ بولے یہ تم کیا کہہ رہے ہو۔ بہت بدنامی ہوگی گپتاجی کی۔ روپیہ میں دیتا ہوں وہ چیک مجھے دے دو۔"

جن دنوں میں بی آر فلمز میں کام کر رہا تھا وہاں ایک لڑکا اسسٹنٹ تھا۔ نام بتانے کی ضرورت نہیں۔ وہ اچانک ڈائرکٹر بن گیا۔ وہ میرا بہت مداح تھا۔ اپنی پہلی فلم لکھوانے میرے پاس آیا۔ معاوضہ کی رقم اس نے بہت کم بتائی اور ضد کی میں ہی اس کی فلم لکھوں میں تیار ہو گیا۔ وہ فلم "مجرم" کے نام سے بنی اور بہت کامیاب ہوئی۔ جب مجرم بن رہی تھی میں نے اسے ایک کہانی سنائی جس کا نام میں نے "پھول اور پتھر" رکھا تھا۔ مجرم کی کامیابی کے بعد ان صاحب نے اپنی فلم بنانے کا پلان بنایا اور "پھول اور پتھر" کو مجھے بتائے بغیر بنانا شروع کر دیا۔ ان دنوں بی آر فلمز میں "قانون" بن رہی تھی وہ بھی میں ہی لکھ رہا تھا۔ راجندر کمار اس فلم میں ہیرو تھے مجھے اچانک پتہ چلا میری کہانی "پھول اور پتھر" چوری سے بن رہی ہے۔ راجندر کمار سے ان چور ڈائرکٹر صاحب کی رشتہ داری تھی۔ میں نے راجندر سے کہا انہیں منع کرے اور تھوڑے دن بعد "پھول اور پتھر" کا چور میرے پاس آیا۔ اور مجھ سے معافی مانگی اور بات آئی گئی ہو گئی۔ ان صاحب کی ایک خصوصیت

یہ بھی تھی کہانی نگار کو اس کے کام کا معاوضہ دینا جرم سمجھتے تھے۔ اتنا سب ہونے کے بعد بھی روپیہ کے معاملہ میں میرے ساتھ انھوں تنگ دلی کا مظاہرہ کیا۔ میں نے ان کا منظر نامہ اٹھا کر ان کے منھ پر مار دیا۔ اور انھیں گھر سے رخصت کر دیا۔ فلم "پھول اور پتھر" بہت کامیاب ہوئی۔ مگر اسکرین پر میرا نام کچھ اس طرح تھا،

"کہانی کا خیال اختر الایمان سے لیا گیا ہے۔" اس کا معاوضہ بھی کچھ ملا کچھ نہیں ملا۔ یہ فلم کی صنعت ہے بہت بڑی اور اہم مگر قلم کار کی طرف فلم بنانے والوں کا رویہ اچھا نہیں۔ ہر فلم ساز جب اس صنعت میں پہلا قدم رکھتا ہے۔ کہانی اس کی بغل میں ہوتی ہے اور وہ اکثر و بیشتر اس کی اپنی ہوتی ہے۔ تقدیم بھی فلم کے پیشے میں بڑے اداکاروں کو دی جاتی ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ نشان کا ہاتھی اداکار ہوتے ہیں مگر میری رائے میں لکھنے کا شعبہ سب سے اہم ہے۔ خیر میں اس موضوع پر کوئی تفصیل طلب بات نہیں کرتا۔ ایسے ہی کہہ رہا تھا۔ چونکہ میری زندگی کے کم و بیش پچاس سال اس پیشے میں گزر گئے آدمی۔ بحیثیت مجموعی بہت ناہموار بلکہ ادھ کچرا ہے۔ ان ہی واقعات میں ایک واقعہ ایک اورنگ آباد کے شاعر کا بھی ہے۔ میں ان صاحب کو صورت سے پہچانتا تھا۔ ایک دو بار وہ میرے پاس آئے۔ میں ان دنوں بینڈ اسٹینڈ والے مکان میں رہتا تھا۔ کہنے لگے وہ بے روزگار ہیں کام چاہیے۔ میں ان دنوں بی آر فلمز چھوڑ چکا تھا۔ سمجھ میں نہیں آیا ان کے لیے کیا کروں۔ انھیں رہنے کی جگہ بھی چاہیے تھی۔ میرے ایک دوست ہیں گلاٹھی تیار کپڑوں کی تجارت کرتے ہیں۔ یورپ امریکہ سے جینز اور اسی قسم کے کپڑے منگواتے تھے پین ورکرز (PEN WORKERS) کے نام سے ان کا ایک دفتر اور شوروم تھا۔ میں اپنے صحت مند دنوں میں ہمیشہ صبح سویرے سیر کو جایا کرتا تھا۔ گلاٹھی بھی آتے تھے۔ میں نے ان سے ذکر کیا بلکہ ان کی سفارش کی اور شاعر موصوف کو گلاٹھی کے یہاں کام بھی مل گیا اور رہنے کی جگہ بھی۔ کچھ دن بعد مجھے خبر ملی شاعر موصوف رات کے وقت میٹرو سنیما کے نزدیک گرفتار ہو گئے۔ ان کے پاس ولایتی کپڑوں کی ایک گٹھری تھی۔ رات کو گشت کرنے والے پولیس کے ایک افسر کو شبہ ہوا اور تفتیش کرنے پر پتہ چلا وہ کپڑے

چرائے گئے تھے۔ ان دنوں حضور احمد خاں پولیس کمشنر تھے۔ وہ نخشب جارجوی کے بہت اچھے دوستوں میں تھے۔ مجھ سے بھی یاد اللہ تھی۔ ان کے توسط سے میں شاعر موصوف سے ملا۔ وہ حوالات میں تھے۔ جو برا بھلا مجھے کہنا تھا ان سے کہا۔ گلا ٹھی سے اپنی غلطی کا اعتراف کیا اور نخشب کو سمجھایا غلطی سب سے ہوتی ہے۔ خیال رکھنا اس غریب کو سزا نہ ہو۔ حضور احمد خاں سے بھی اس کی سفارش کی۔ اور بہت سے متعلقہ افسروں سے ملا۔ غرضیکہ کسی طرح بھاگ دوڑ کر کے انھیں سزا سے بچایا اور جیل جانے سے بچ گئے۔ مجھے خوشی ہوئی اس لیے کہ مجھے ان میں بہتر شاعر بننے کے آثار نظر آتے تھے۔ خیریات آئی گئی ہوگئی کچھ دن بعد یہ حضرت پھر تشریف لائے۔ ان کے ساتھ ایک لڑکی تھی۔ تعارف کرایا ان کی شاگرد ہے۔ میری عادت ہے جب لوگوں سے نئی ملاقات ہوتی ہے اور تعلقات بڑھتے ہیں میں ان سے ان کے ذاتی معاملات اور نجی زندگی کے بارے میں کچھ نہیں پوچھتا جب تک وہ خود نہ بتائیں۔ میں نے لڑکی کے بارے میں بھی استفسار نہیں کیا مگر موصوف دو تین دن بعد پھر آگئے اور اس کے بعد کئی چکر لگائے۔ ایک روز میں نے پوچھا تم بار بار چکر لگا رہے ہو کچھ کام ہے تمھیں مجھ سے اور انھوں نے بڑے محجوبانہ انداز میں بتایا وہ لڑکی حاملہ ہے

"تم نے شادی کرلی اس سے؟" میں نے پوچھا۔

"غلطی ہوگئی" انھوں نے سر جھکا کر کہا۔

"تو بچے کا انتظار کرو"

مگر وہ اسقاط چاہتے تھے۔ سلطانہ کو معلوم ہوا بہت ناراض ہوئیں۔

"کیا سمجھ رکھا ہے ان لوگوں نے آپ کو۔ کیا ہے یہ گھر؟ یہ بدمعاشوں کا اڈہ ہے"۔

سلطانہ کا خفا ہونا بجا تھا۔ مگر میرے ذہن میں لڑکی کا مستقبل تھا میں نے سمجھا بجھا کر سلطانہ کو خاموش کر دیا۔ میری پہچان کے ایک ڈاکٹر تھے۔ عورتوں ہی کا علاج زیادہ کرتے تھے۔ میں نے ان سے مدد مانگی۔ وہ آمادہ ہوگئے اور لڑکی کو مشکل سے نجات مل گئی ڈاکٹر صاحب کا نرسنگ ہوم تھا۔ وہیں انھوں نے لڑکی کو رکھا۔ دو روز بعد میں لڑکی کو دیکھنے گیا۔ ڈاکٹر نے بتایا۔ شاعر موصوف لڑکی کو لے کر بغیر بل ادا کیے اسپتال چھوڑ کر چلے گئے۔

مجھے ان صاحب کی اس حرکت سے بہت افسوس ہوا اور میں سوچتا رہا کیا شاعر یا اور کسی دوسرے فن کے تخلیق کار، مصور یا قلمکار کے فن کا اس کے کردار سے کوئی تعلق ہے یا نہیں۔ اس طرح کا فن کار یا شاعر جس کا ذکر میں نے اوپر کیا اچھی تخلیق کا اہل ہے مگر کوئی ٹھیک جواب ذہن نے نہیں دیا۔ اس لیے کہ ادب اور شاعری کی تاریخ میں ایسے بہت بڑے بڑے فن کار ہیں جو بحیثیت انسان خراب نہیں ہی نہیں بہت برے تھے مگر فن کار اور تخلیق کار کی حیثیت سے ان کا بہت بڑا درجہ ہے بلکہ وہ فن ان پر ختم ہوتا ہے۔

کم و بیش ان ہی دنوں سوسائٹی کے ایک ممبر رنگ راجن کے گھر میں ان کی آیا یعنی ملازمہ کا قتل ہو گیا۔ لڑکی کا ایک عاشق جو اس سے شادی پر بہت دن سے اصرار کر رہا تھا اور لڑکی مسلسل انکار کر رہی تھی ایک دن رنگ راجن کے یہاں گیا اور اس لڑکی کا گلا کاٹ دیا۔

ان ساری ذہنی اور جسمانی پریشانیوں میں میری ذہنی حالت پھر ویسی ہی ہو گئی جو ٹرنر روڈ والا مکان چھوڑتے وقت تھی۔ یا اس سے کبھی بہت پہلے ۱۹۴۲ء میں تھی۔ میرا کالج کا زمانہ ختم ہو رہا تھا اور میں بہت ڈانواڈول تھا اور سوچتا رہتا تھا۔ بی اے پاس کر کے کیا کروں گا۔ جواب ذہن میں نہیں آیا تھا مگر یہ بات ضرور سوجھی تھی کہ قوت ارادی مضبوط کروں۔ مگر کس طرح میرے اس کمرے سے جو دریا گنج میں تھا حضرت خواجہ نظام الدین کا مزار دو تین میل دور تھا۔ قدیم دلی شہر کی حد سے باہر۔ میں نے سوچا میں روز اپنے گھر سے حضرت نظام الدین کی درگاہ پیدل جایا کروں گا۔ کیسا ہی موسم یا صورتحال کیوں نہ ہو اور میں اپنی اس نیت پر بہت دن تک قائم رہا۔ روز شام کو گھر سے نظام الدین تک جانا اور آنا۔ ایک روز خیال میں آیا روز ان بزرگ کے مزار تک آکر پلٹ جاتا ہوں کبھی ایک بار بھی فاتحہ نہیں پڑھی۔ میں نے مزار پر جا کر فاتحہ پڑھی۔ ساتھ ہی ذہن میں کچھ اس طرح کے فقرے بھی آئے "اے بزرگ خواجہ آپ کے فیض سے خسرو خسرو ہو گئے۔ میں اچھی شاعری کرنا چاہتا ہوں مگر میرا نہ کوئی استاد اور رہنما ہے نہ مجھے معلوم ہے اچھی شاعری کیا ہو سکتی ہے۔ آپ کا فیض روحانی کچھ میرے حصہ میں بھی آجائے تو شاید میں

اپنے مقصد میں کامیاب ہو جاؤں۔" اس کے بعد میں نے دلّی چھوڑ دی۔ اور ساغر نظامی کے ساتھ کام کرنے میرٹھ چلا گیا۔ وہاں سے واپس دلی آگیا۔ کچھ دن ایک سرکاری دفتر میں کام کیا۔ پھر ریڈیو اسٹیشن پر ملازم ہو گیا۔ وہاں سے چھوڑ کر علی گڑھ یونیورسٹی میں ایم۔ اے کرنے چلا گیا۔ آدھا کیا اور چھوڑ کر پونا میں فلم کی زندگی سے متعلق ہو گیا۔ تقسیم ملک کے بعد بمبئی آگیا۔ پھر فلمیں لکھتے لکھتے اور مکان بدلتے بدلتے بینڈ اسٹینڈ پر آگیا تھا۔ پھر حالات کے اتار چڑھاؤ کے سبب یہ مکان بھی فروخت کر دیا۔ اور اب روی درشن کارٹر روڈ پر رہ رہا ہوں اور اتنے امراض اور ذہنی جسمانی تکلیفیں بھوگ کر گردوں کا مریض بن گیا ہوں اور "ڈائیلیسس (DIALYSIS) پر جی رہا ہوں۔ دل کے آپریشن کے علاوہ کچھ واقعات ہیں جن کا میں نے ذکر نہیں کیا یا دانستہ نظر انداز کر دیا۔ ایک دو واقعات ذہن سے خارج ہو گئے۔ ان ذہن سے نکل جانے والے واقعات میں میرا امریکہ کینیڈا کا سفر بھی ہے۔ دل کے آپریشن سے پہلے کی بات ہے ایک روز مرحوم عزیز قیسی کا فون آیا۔ انھوں نے کہا مجھے ان کے ساتھ امریکہ کینیڈا کے سفر پر جانا ہے۔ تفصیل اس کی یہ ہے کہ عزیز قیسی کے ایک بھائی نیویارک میں رہتے تھے۔ نام احمد تھا۔ انھوں نے وہاں ایک ایسے گردشی مشاعرہ کا اہتمام کیا تھا جس میں شعراء کو شہر شہر جا کر اپنا کلام سنائیں گے۔ جب سے ہندوستان پاکستان کے لوگ امریکہ اور کینیڈا میں کام کی تلاش میں جانے لگے تھے وہاں مشاعروں کا بڑا رواج ہو گیا تھا۔ سبب یہ تھا کہ وہاں انھیں ادبی اور تہذیبی زندگی کی کمی کا بڑا احساس ہونے لگا تھا۔ اور مشاعرہ آسان ترین ذریعہ ہے اپنے کلچر سے قریب آنے کا۔

پروگرام نیویارک سے شروع ہوا۔ ان مشاعروں میں امریکہ میں کام کرنے والے شعراء اور شاعرات بھی شامل ہوتی تھیں۔ نیّر رحمٰن میں زیادہ قابل ذکر ہیں۔ نیویارک کے بعد لاس اینجلیز، سانفرانسسکو، شکاگو، اور اس کے علاوہ اور ایک دو شہروں میں پڑھنے کے بعد ہم پہلے مانٹریال اور پھر ٹورانٹو لے جائے گئے۔ نیویارک میں ٹھہرنے کا بندوبست احمد نے کیا تھا سانفرانسسکو میں نثار کے پاس ٹھہرا احمد آباد کے

رہنے والے میرے ایک دوست تھے۔ شکاگو میں حبیب احمد کے پاس رہے ٹاس انجلیز میں کہاں ٹھہرے مجھے ان صاحب کا نام بالکل یاد نہیں۔ مانٹریال میں بھی ایک غیر معروف سے آدمی کے یہاں رکے مانٹریال سے ٹورانٹو ہم ٹرین سے آئے۔ بہت اچھا لگا۔ بڑا آرام دہ سفر تھا۔ ٹورانٹو کے اسٹیشن پر ایک صاحب ملے۔ طویل قامت اور بڑے خوش اُئند اور خوش انداز سے میرے پاس آئے اور پوچھا

"اخترالایمان"

مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔

"بیدار بخت" آپ میرے پاس ٹھہریں گے۔ میں کینیڈا میں بہت دن رہا شاعر پڑھے۔ پورے کینیڈا کی سیر کی بیدار کی بیوی انیتا اور بچوں کے ساتھ بہت اچھا وقت گزرا۔ کینیڈا سے واپس آنے کے بعد بیدار کی کوشش سے پھر کینیڈا بلایا گیا۔

اس سفر میں سلطانہ بھی میرے ساتھ تھیں۔ ہم نے بیدار ہی کے یہاں قیام کیا۔ واپسی میں نیویارک اور لندن میں ٹھہرے ہوئے واپس ہندوستان آگئے۔ واپس آکر بھی بیدار بخت سے مراسم ختم نہیں ہوئے۔ میں نے انھیں دوست بنالیا۔ وہ جب آتے ہیں میرے پاس رکتے ہیں۔ آج اس بات کو دس برس سے زیادہ ہوگئے۔ مگر یہ قربت کا سلسلہ جاری ہے۔

(یہاں تک خودنوشت اخترالایمان کے ہاتھ کی لکھی ہوئی ہے نیچے لکھی ہوئی تحریر سلطانہ ایمان کی ہے مگر جذبات اخترالایمان کے جن کا اظہار انھوں نے اپنے آخری دنوں میں کیا۔)

مجھے DIALYSIS کرواتے ہوئے دو برس سے اوپر ہوگئے۔ اب بہت تھک چکا ہوں۔ اس دوران میں نے حتی الامکان اپنے تمام کام تقریباً مکمل کر دیے۔ میری سرگزشت بھلی بُری جیسی بھی ہے میرے خیال میں پوری ہو گئی ہے۔ اس میں میں نے صرف یادداشت کے بھروسے کچھ واقعات اور چند ساتھیوں کا ذکر کیا ہے۔ اس

سے زیادہ کچھ نہیں۔ میں اپنی کچھ نئی نظموں کا مجموعہ بھی ترتیب دینے کی کوشش کر رہا ہوں۔

مجھے اپنی زندگی سے کوئی شکایت بھی نہیں میرے بچے اپنے اپنے گھر خوش ہیں۔ سلطانہ کے لیے اتنا چھوڑ دیا ہے کہ آرام سے رہ سکیں میرے لڑکے رامش کی بھی پچھلے سال شادی ہو گئی۔ اس کی بیوی گلڈا آرمینین ماں اور عیسائی باپ کی اکلوتی اولاد ہے۔ بہت سلجھی ہوئی لڑکی ہے۔ بمبئی کے مشہور صوفیہ کالج میں لکچرار ہے۔

رامش بچپن میں جتنا شریر اور ضدی تھا اب اتنا ہی ذمہ دار اور سنجیدہ ہو گیا ہے۔ مجھے ہسپتال چھوڑتا اور واپس لاتا ہے۔ ڈاکٹروں سے گھنٹوں میری دواؤں اور انجکشنوں کے بارے میں باتیں کرتا ہے اور ہر ممکن انجکشن اور دوائیں کہیں نہ کہیں سے دستیاب کر کے لاتا ہے اور جی جان سے میری دیکھ بھال میں لگا رہتا ہے۔

میں اپنی شاعری کے بارے میں کیا لکھوں۔ میری عادت ہے کہ میں صرف کام کرتا ہوں اور نتیجہ وقت پہ چھوڑ دیتا ہوں۔ یہ کام بھی وقت ہی کرے گا۔



اختر الایمان کے لڑکپن کی تصویر



اختر الایمان کے والد حافظ فتح محمد



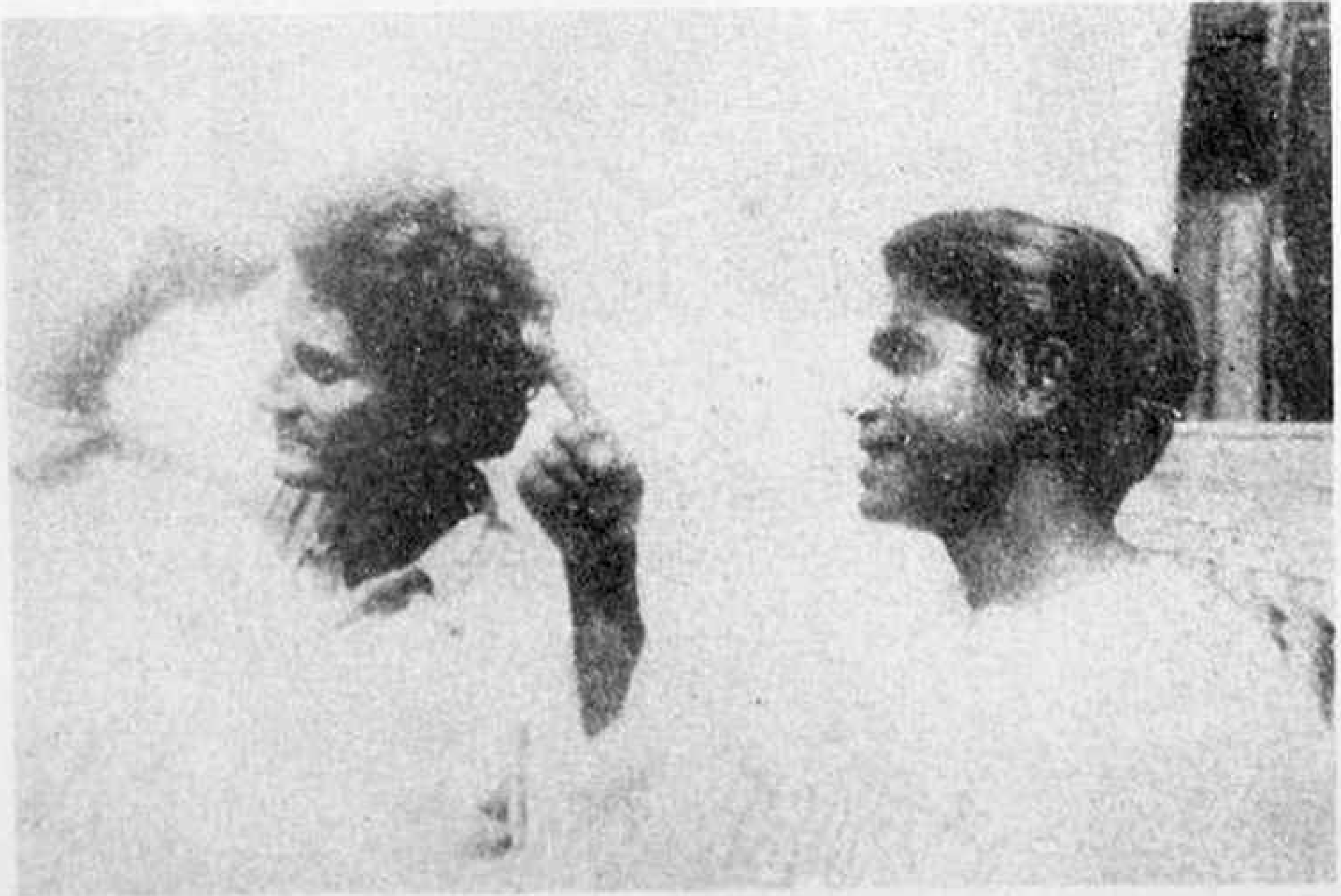
اختر الایمان کی والدہ سلیمن بیگم



اخترالایمان بیوی اور بچوں کے ساتھ ۱۹۶۲



اخترالایمان اپنی بیگم کے ساتھ ، ٹورنٹو ، کینیڈا میں ۱۹۸۵



اخترالایمان اپنے دور کے ممتاز شاعر میراجی کے ساتھ ۱۹۴۶



اخترالایمان، ہندوستان کے پہلے وزیر اعظم پنڈت جواہر لال نہرو کے ساتھ ۱۹۶۱



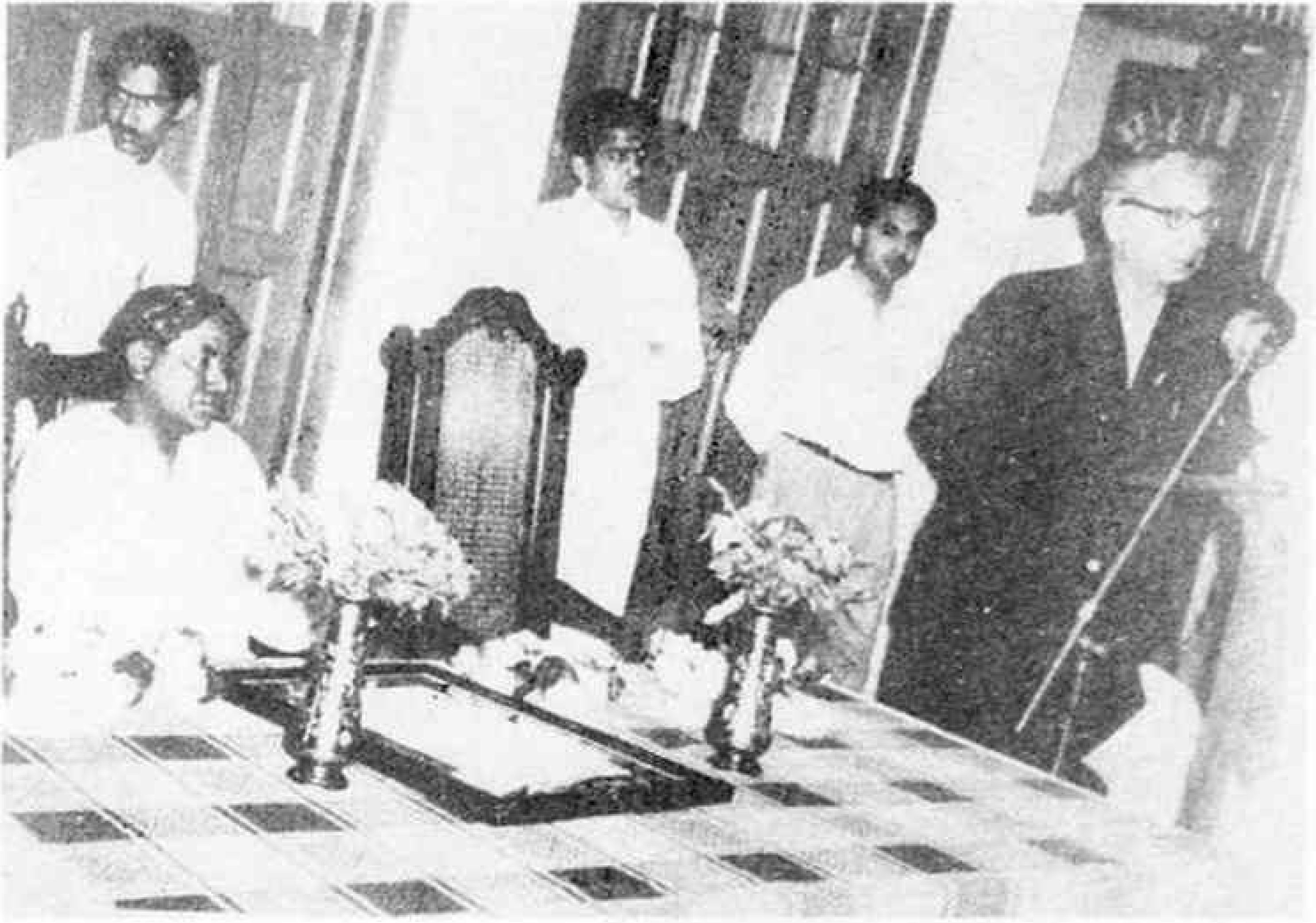
اخترالایمان، صدر جمہوریہ ہند ڈاکٹر ذاکر حسین کے ساتھ ۱۹۶۵



اخترالایمان، صدر جمہوریہ ہند گیانی ذیل سنگھ کے ساتھ ۱۹۸۵



اخترالایمان، ممتاز فلمی اداکار دلیپ کمار کے ساتھ ۱۹۶۵



اختر الایمان نامور ترقی پسند ادیب سجّاد ظہیر کے ساتھ ۱۹۶۱



اختر الایمان نامور شاعر بیکل اتساہی، حسن کمال (ایڈیٹر بلٹز)
اور دیگر احباب کے ساتھ نیاگرا فالز کینیڈا میں ۱۹۸۰



اخترالایمان نامور شاعر ساحر لدھیانوی، مشہور ادیبہ قرۃالعین حیدر، سلمیٰ صدیقی اور افسانہ نگار راجندر سنگھ بیدی اور دیگر



اخترالایمان نامور فلم ساز کے۔ آصف، مشہور ادیب باقر مہدی، فلم اداکار سنجیو کمار اور دیگر ۱۹۶۳

